مآخذ: (۱) یعقوبی: بُلدان، ص ۳۲۴؛ (۲) یاقوت، ۱: ۳۲۲-۳۲۳؛ (۳) ابن القلانسی: ذیل تاریخ دمشق، بہ دار اشاریہ؛ (۴) ابن العدیم: تاریخ حلب، ج ۱ و ۲، دمشق ۱۹۵۱-۱۹۵۴ء، بہ دار اشاریہ؛ (۵) ابن الاثیر، ۱۱: ۹۸ (سال غلط ہے)؛ (۶) E. Honigmann: *Ostgrenze des byzantinischen Reiches*، برسلز ۱۹۳۵ء، بہ دار اشاریہ؛ (۷) C. Cahen: *La Syrie du Nord à l'époque des Croisades*، پیرس ۱۹۴۰ء، بہ دار اشاریہ؛ (۸) J. Richard: *Notes sur l' archidiocèse d' Apamée*، در *Syria*، ۲۵: ۱۰۳-۱۰۸؛ (۹) زخاؤ (E. Sachau): *Reise in Syrien u. Mesopotamien*، لائپزگ ۱۸۸۳ء، ص ۷۱-۸۲؛ (۱۰) R. Dussaud: *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۱۹۶-۱۹۹؛ افامیہ کی جھیل (بحیرہ) اور اس کے نواح میں دریاے عاصی کی ریاست کے لیے نیز دیکھیے قلقشندی در (۱۱) G. Demombynes: *La Syrie à l' epoque des Mameluks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۷، ۲۰-۲۲ [صبح الأعشی، ۴: ۸۰ ببعد]؛ (۱۲) J. Weulersse: *L' Oronte, éutde de fleuve*، Tours ۱۹۴۰ء؛ [۱۳] سامی بک: قاموس الاعلام، ۲: ۹۹۹-ب].

(H. A. R. GIBB گب)

---

* **اَفْرَاسِیاب:** ایرانی روایت کے مطابق تورانیوں کا افسانوی بادشاہ۔ اَوستا (بالخصوص یشت ۱۹) کی رو سے ''فرنگ رَسَئین تُوری (Frangrasyan the Turian) کوی ہئوسروہ'' (کیخسرو) کا ایک حریف تھا، جس نے کیخسرو (Kavi Haosrava) کے باپ سِیاوَرشَن (Syavarshan) (سِیاوش) کو دغا بازی سے قتل کر دیا تھا۔ اس نے آریاؤں کی ہورن (Hvarna) یعنی شان و شوکت حاصل کرنے کی بے سود کوشش کی اور اسے کیخسرو (Kavi Haosrava) نے انتقاماً قتل کر دیا۔ ممکن ہے وہ اصل میں کوئی تاریخی شخصیت اور توری قبائل کا (جو غالباً خود بھی ایرانی نسل سے تھے (قب تُوران)) سردار ہو۔ اس نام کی پہلوی صورت افراسیاب ہے۔ اس کے متعلق بعض مزید معلومات مذہبی تصانیف (بُنْدَھِشْن *Bundahahishn* وغیرہ) میں دی گئی ہیں۔ اس کا سلسلۂ نسب بھی موجود ہے، جس کی رو سے اس کا مورث اعلیٰ تُوچ (تُور، تورانیوں کا جدِّ امجد) ابن فریدون [رک بآن] تھا۔ کہا جاتا ہے کہ افراسیاب کی ترکتازیوں کی ابتدا مَنُش چہر کے عہد حکومت میں ہوئی، یعنی اس نے مؤخّر الذکر کو شکست دی اور ایران پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اُزَوْ (زَوْ یا زاب) نے ایران کو اس کے تسلط سے رہائی دلائی۔ افراسیاب نے دوبارہ شان و شوکت حاصل کر لینے کی کوشش کی، جسے اس نے ساتوں کشوروں میں تلاش کیا۔ افراسیاب کی جاے سکونت (''یشتوں'' کا زیریں قلعہ، جہاں فرنگ رَسَئین ''لوہے سے محصور'' رہتا تھا) کا بہ تفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں افراسیاب کیخسرو کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس طرح آگے چل کر افسانے میں ''یشتوں'' کے زمانے کے بعد افراسیاب تورانیوں کی تمام جنگوں میں ان کا سردار بن گیا، نہ صرف کیانیوں کے خلاف بلکہ ان کے پیش رو پیش دادیوں کے خلاف بھی۔ گویا وہ مَنُش چہر اور اُزَوْ کا معاصر ہو گیا ہے۔ تاہم اس کے خاتمے کا تعلّق پھر بھی قطعاً کیخسرو ہی کے ساتھ رہا۔

اسلامی مصنّفوں نے قومی روایات سے متعلّق اپنی معلومات غیر مذہبی کتابوں، بالخصوص خودای نامَک، سے اخذ کیں۔ ان کے ہاں بہت سی مزید تفصیلات ملتی ہیں۔ افراسیاب مَنُش چہر سے طبرستان میں لڑا؛ پھر ان میں باہم عہد و پیمان ہو گیا، جس کی رو سے دریاے بلخ (آمو یا جیحوں) دونوں کی مملکتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا۔ سیاوش نے، جسے کیکاؤس نے افراسیاب کے خلاف فوج دے کر بھیجا تھا، اس سے عارضی صلح کر لی، جسے کیکاؤس نے تسلیم نہ کیا۔ سیاوش نے افراسیاب کے ہاں پناہ لی اور افراسیاب نے اپنی بیٹی وِسُفا فَرِیْد سیاوش سے بیاہ دی (الطبری، فردوسی: فَرِنگِیس)، پھر بھی اسے حسد کی بنا پر قتل کر ڈالا۔ وِسُفا فَرِیْد، جس کے پیٹ میں کیخسرو تھا، بچ گئی اور اسے مشہور پہلوان گیو (بَیْ، واوْ) ایران لے گیا۔ پھر رُستم اور تُوس نے سیاوش کے انتقام میں توران کی سرزمین پامال کر ڈالی۔ کیخسرو کا عہد حکومت افراسیاب کے خلاف جنگوں سے معمور رہا (تفصیلات در الطّبری، ۱: ۶۰۵ ببعد؛ قب نیز اشاریہ، بذیل مادہ؛ الثعلبی: *Histoire desrois de la Perse*، (طبع زوٹن برگ Zotenberg) ص ۲۲۲ ببعد؛ فردوسی: شاہنامہ (طبع Vullers)، ۲، ۷۶۴ و ۳: ۱۴۴۴)۔ آخری لڑائی کے بعد افراسیاب ترکستان سے بھاگ کر آذربیجان میں روپوش ہو گیا، لیکن پکڑا گیا اور اسے کیخسرو نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

چونکہ تورانیوں سے ترک مراد لیے جاتے ہیں [رک بہ توران] لہٰذا افراسیاب کو ترک ہی مانا جاتا تھا۔ شاہنامہ میں اس امر پر خاص زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ترک خاندان اسے اپنا مورث اعلیٰ قرار دیتے رہے ہیں؛ چنانچہ قراخانی خاندان [رک بآن] آل افراسیاب بھی کہلاتا ہے اور سلجوق افراسیاب ہی کی اولاد سے ہونے کا دعوٰی کرتے تھے [مرزا غالب نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میں سلجوقی، افراسیابی اور پشنگی ہوں، دیکھیے کلیات نظم فارسی] (قب بارتولڈ (W. Barthold): *Hist. des Turcs d Asie Centrale*، ص ۷۰، ۸۴).

مآخذ: (۱) A. Christansen: *Les Kayanides*، کوپن ہیگن ۱۹۳۲ء، بہ دِ اشاریہ، بذیل مادہ ہای Frayrasyan و Frāsiyab (مع مسلم مصنّفین کے مزید حوالوں کے)؛ (۲) ولف (F. Wolff): *Glossar zu Firdosis Schahname*، برلن ۱۹۳۵ء، بذیل مادہ، قب نیز پیشدادی، کیانی.

(S. M. STERN)

---

* **اَفْرَاسِیاب:** والیان بصرہ کے ایک سلسلے (آل افراسیاب) کا بانی۔ یہ ایک مجہول النَّسب عامل تھا، جس نے تقریباً ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء میں مقامی پاشا سے بصرے کی حکومت خرید لی۔ ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴-۱۶۲۵ء میں ایرانی فوجوں نے بصرے پر حملہ کیا تو افراسیاب کا بیٹا، علی، باپ کا جانشین مقرر ہوا اور اس کی طرف سے شدید مزاحمت کی بدولت یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ ایران کی طرف سے دوسرا حملہ ۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۹ء میں ہوا، یہ بھی ناکام رہا۔ جب بغداد کے متعلق ترکوں اور ایرانیوں کی باہمی

کش مکش کا آغاز ہوا تو علی پاشا غیر جانب دار رہا اور اپنے صوبے پر خود مختارانہ حکومت کا سلسلہ جاری رکھا۔ علی کے بیٹے حسین کی جانشینی پر (نواح ۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۲ء میں) داخلی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوے، جن سے فائدہ اٹھاتے ہوے بغداد کے حاکم مرتضٰی پاشا نے ۱۰۶۴ھ/ ۱۶۵۴ء میں حُسَین کو برطرف کر کے علی پاشا کے بھائی احمد کو حاکم بصرہ بنا دیا۔ بعد میں جب مرتضٰی نے احمد کو قتل کرا دیا تو مقامی آبادی اور قبائلیوں نے بغاوت کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین پاشا کو بحال کر دیا گیا۔ جب اس نے الحسا پر تسلّط جمانے کی کوشش کی تو بغداد کے حاکم ابراہیم (طَوِیل) نے اس کے خلاف بڑے پیمانے پر چڑھائی کی۔ قُرنہ کے طویل محاصرے کے بعد حسین اپنے بیٹے افراسیاب کے حق میں دست بردار ہو گیا، لیکن نائب السلطنت (regent) کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا، یہاں تک کہ بغداد سے قرہ مصطفٰی (فراری) کے زیر قیادت ایک اَور مہم بھیجی گئی، جس نے حسین کو بصرے سے نکال کر ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۸ء میں سلطان ترکی کی حکومت دوبارہ قائم کر دی۔

مآخذ: (۱) مرتضٰی نظمی زادہ: گلشن خلفاء، استانبول ۱۷۳۰ء؛ (۲) فتح اللہ الکَعْبی: زاد المسافر، بغداد ۱۹۲۴ء؛ (۳) محمد آغا خواجہ زادہ: تاریخ السِلحِدار، ج ۱، بغداد ۱۹۲۸ء؛ (۴) سِجِلّ عثمانی، ۱: ۱۰۸ و ۲: ۱۹۵ و ۳: ۵۱۳ و ۴: ۴۰۰؛ (۵) J. B. Tavernier: *Les Six Voyages*، پیرس ۱۶۷۶ء وغیرہ، انگریزی ترجمہ لنڈن ۱۶۷۸ء؛ (۶) لونگرِگ (S. H. Longrigg): *Four Centuries of Modern 'Iraq*، اوکسفرڈ ۱۹۲۵ء، ص ۹۹ - ۱۱۷؛ (۷) عباس العزّاوی: تاریخ العراق بین اِحتِلالین، ۵: ۲۱-۱۰۱، بغداد ۱۹۵۳ء۔

(H. A. R. GIBB گِب)

---

* **اَفْراسِیابیہ:** خانوادۂ مازندران کا ایک چھوٹا حکم ران خاندان، جسے رابینو (Rabino) نے کِیان چُلاب یا چَلاب کا نام بھی دیا ہے (آمُل کے آٹھ بُلُوکوں [پرگنوں] میں سے ایک کے نام پر) اور زخاؤ (Sachau) نے کِیا جلاوی کا۔ اس خاندان کا نام افراسیاب بن کِیا حسن کے نام پر پڑا، جو اپنے بہنوئی فخر الدولہ حسَن باوند [رک بہ مادۂ باوَند] کی ملازمت میں سپہ سالار کے عہدے پر فائز تھا۔ کِیا افراسیاب نے اپنی بہن سے، جس کی ایک جوان لڑکی پہلے خاوند سے تھی، سازش کر کے فخر الدین پر یہ الزام لگایا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں اور آمُل کے علما سے اس مضمون کا فتوٰی حاصل کر لیا کہ ایسا شخص واجب القتل ہے۔ اسی زمانے میں باوَند نے اپنے وزیر کِیا جلال الدین احمد بن جلال کو قتل کرا دیا، جو طاقت ور خاندان کیاے جلالی کا ایک رکن تھا۔ اس سے امرا بہت ناراض اور خوفزدہ ہو گئے اور باوند مجبور ہوا کہ کِیان چُلاب کی دوستی حاصل کرے، جو کیاے جلالی کے پُرانے حریف چلے آ رہے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کی آپس میں صلح ہو گئی، جس سے کیا افراسیاب کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا اور بالآخر ۲۷ محرم ۷۵۰ھ/ ۱۷ اپریل ۱۳۴۹ء کو افراسیاب کے دو بیٹوں علی اور محمد (یا بقول Justi صرف محمد) نے باوَند کو کسی حمام میں قتل کر دیا۔ فخر الدولہ کی موت پر خاندانِ باوَند، جس نے سات سو پچاس سال حکومت کی تھی، ختم ہو گیا اور کیا افراسیاب نے آمُل (اور ساری؟: *JA*، ۱۹۴۳ء-۱۹۴۵ء، ص ۲۳۷) [ساریہ، جسے ساری بھی کہتے تھے دیکھیے لی سٹرینج ممالک خلافت شرقیہ، ص ۳۷۰] کی حکومت سنبھال لی۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے سابق آقا کے اکثر منصب دار اطاعت سے منکر ہیں افراسیاب نے مذہب کا سہارا لیا اور درویش طریقت قوام الدین مَرعَشی کا مرید ہو گیا، جو ''میر بزرگ'' کہلاتے تھے۔ اس تدبیر سے افراسیاب کو امید تھی کہ آمُل کے باشندے، جو شیخ کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کے خلاف بغاوت کرنے سے مُحترز رہیں گے، لیکن دس سال حکومت کرنے کے بعد کِیا افراسیاب نے ۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹ء میں جَلالک مار پر چن کی لڑائی میں انھیں درویشوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور اپنے تین بیٹوں کے ساتھ مارا گیا۔

اب میر بزرگ آمُل کے حکم ران ہو گئے اور ان سے مَرعَشی [رک بآن] سادات کے حکم ران خاندان کا سِلسِلہ چلا (۷۶۰ھ/ ۱۳۵۹-۹۸۹ھ/ ۱۵۸۱ء)۔ اسی سال افراسیابی قبیلے کے ایک رکن کِیا فخر الدین جَلاوی نے میر بزرگ کے بیٹے عبداللہ کو قتل کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے نیز اس کے چار بیٹوں کو موت کی سزا دی گئی۔ اس کے علاوہ آخری باوند حکم ران کا ایک اَور نسبتی بھائی کِیا گُشتاسَب (وِشتَاسپ) بھی اپنے سات بچوں کے ساتھ مارا گیا۔

کِیانِ چُلاب کا یہ دوبارہ ظہور کِیا افراسیاب کے آٹھویں بیٹے اسکندر شیخی ہی سے ہوتا ہے، جس نے ہرات میں پناہ لی تھی اور عرصے تک طالع آزمائی کرنے کے بعد آخر کار تیمور کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۲-۱۳۹۳ء میں تیمور نے مازَندران پر حملہ کیا، آمُل کے قریب ماہانہ سَر کا قلعہ فتح کیا، آمُل اور ساری کو تاراج کر ڈالا اور مرعَشی سیّدوں کو جلاوطن کر کے اسکندر کو حاکم بنا دیا۔ اسکندر چونکہ حملہ آور کے ساتھ واپس آیا تھا اس لیے عوام میں بہت کم مقبولیت حاصل کر سکا۔ مقبولیت میں مزید کمی اس لیے ہوئی کہ اس نے میر بزرگ کے مقبرے کو منہدم کرنے کا حکم دے دیا، جو ساری میں تھا۔ ۸۰۲ھ/ ۱۴۰۰-۱۴۰۱ء میں سکندر عراق، آذربیجان، اناطولیہ اور شام کی تیموری مہمّات میں شامل رہا۔ پھر اجازت لے کر آمُل کو لوٹا اور یہاں پہنچ کر تیمور کے خلاف بغاوت کا عَلَم بلند کر دیا۔ ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۳ھ-۱۴۰۴ء [کذا، ۱۴۰۲-۱۴۰۳ء] میں تیمور اسکندر کا تعاقب کرتا ہوا مازندران میں داخل ہوا۔ اسکندر اپنی بیوی اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جنگل میں بھاگ گیا۔ وہاں اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ مبادا بچوں کے چیخنے چلانے کی وجہ سے پکڑا جائے، لہٰذا دونوں بچوں اور ان کی ماں کو قتل کر دیا۔ بالآخر وہ خود شیرُود دو ہزار کے مقام پر مارا گیا۔ تیموری سرداروں نے اس کا سر کاٹ کر اس کے بیٹے حسین کِیا کے پاس بھیجا، جو فیروزکوہ کے قلعے میں محصور ہو کر لڑ رہا تھا۔ اُس پر اس نے فی الفور قلعہ تیموری فوج کے حوالے کر دیا۔ اسکندر کا ایک اَور بیٹا علی کِیا تیموری فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو چکا تھا۔ تیمور نے دونوں بھائیوں کو معافی دے دی

اور حسین کِیا فیروزکُوہ میں حکومت کرتا رہا۔ اس کے بیٹے لُہرْاسْپ (بن حسین بن اسکندر) نے ۸۸۰ھ/ ۱۴۷۹-۱۴۸۰ء [کذا، ۱۴۷۵-۱۴۷۶ء] میں طالقان میں حکومت کی، پھر امیر حسین (حسن؟ قبؔ زخاؤ Sachau) بن علی بن لُہراسپ کی باری آئی تو اس نے رستم دار کے ایک حصّے نیز فیروزکوہ، دماوَند اور ہری رُود کے کوہستانی علاقے پر حکومت کی۔ ۹۰۹ھ/ ۱۵۰۳ء میں [صفوی] شاہ اسمٰعیل اوّل نے گلِ خنداں اور فیروزکوہ کے قلعے سر کر لینے کے بعد وُسْتہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا، جہاں امیر حسین کِیا پناہ گیر ہوا تھا۔ قلعے کی حوالگی پر مجبور ہو کر اس نے کچھ عرصے بعد ایوانِ رسول واد (کبود گنبد) میں خودکشی کر لی۔ اس خاندان کا آخری رکن امیر سُہراب چُلاب ساوج بُولاق میں اَرْدَہِن کا قلعہ دار تھا، شاہ [اسمٰعیل] نے اسے اس عہدے پر بحال رکھا۔

مآخذ: (۱) زَمْبَاور (Zambaur)، ص ۱۸۸؛ (۲) زخاؤ (E. Sachau): *Verzeichniss muh. Dynastien*، ص ۷؛ (۳) F. Justi: *Iranisches Namenbuch*، ص ۱۰۳؛ (۴) بارٹولڈ (W. Barthold): *Istoriko-geograf obzor Irana*، ص ۱۵۵-۱۶۱؛ (۵) رابینو (H. L. Rabino): *Dynasties alaouides du Mazandaran*، در *JA*، ۱۹۲۷ء، ص ۲۵۳-۲۷۷؛ (۶) وہی مصنّف: *Dynasties de Mazandaran*، در *JA*، ۱۹۳۶ء، ص ۲۹۱-۴۷۴؛ (۷) وہی مصنّف: *L'histoire du Mazandaran*، در *JA*، ۱۹۴۳-۱۹۴۵ء، ص ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۳۶، ۲۳۷؛ (۸) وہی مصنّف: *Mazandaran and Astrabad*، ۱۹۲۸ء، ص ۴۰، ۱۴۲.

(B. NIKITINE)

---

* **الأفْرانی:** رکؔ بہ اَلْقرفَرانی.

---

* **اِفْرِن:** ایک بربر قبیلہ، جس نے ہجرہ کی پہلی تین صدیوں کے اندر شمالی افریقہ میں بہت اہمّ کردار ادا کیا۔ بربر نسّابین اِفْرِن کا نسب نامہ اِفْرِی ابن اِصْلِیْتَن بن مَسْرا ابن زاکیا بن اُرْسِک بن اَدِیْدَت ابن جانا سے ملاتے ہیں۔ یہ قبیلہ عربوں کے فاتحانہ اقدام کے وقت زَنَاتہ قبائل میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کی مختلف شاخیں تمام جنوبی افریقیہ (بنووَارْگُو، مَرَنْجِیْسَہ) اور الجزائر کی بلند سطحاتِ مرتفع پر تاہرت اور تلمسان کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اسلام لانے کے بعد اِفْرِن نے گرم جوشی سے اِباضی [رکؔ بآن] عقائد قبول کر لیے اور نویں صدی عیسوی کی بربری بغاوتوں میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ ان کے ایک سردار ابوقُرَّہ نے تلمسان کے گردونواح میں بربر حکومت قائم کر لی۔ شروع میں تو اس نے عرب سالاروں کے ہاتھوں شکست کھائی، لیکن ۷۶۷ھ [/۱۳۶۶ء] میں اس نے پھر جارحانہ اقدامات شروع کر دیے۔ ۷۷۱ھ [/۱۳۷۰ء] میں چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ وہ ان خارجی فوجوں سے جا ملا جو طُبْنہ میں افریقیہ کے گورنر عمر بن حَفْص کا راستہ روکے ہوے تھیں۔ چالیس ہزار دینار لے کر وہ اس وقت تو واپس جانے پر راضی ہو گیا، لیکن ۷۷۲ھ [/۱۳۷۱ء] میں اپنی فوجوں کے ہم راہ اس نے القیروان کے محاصرے اور تسخیر میں حصّہ لیا۔

آئندہ صدی میں بنو اِفْرِن خارجی عقائد ترک کر کے راسخ العقیدہ مسلمان بن گئے، لیکن ان میں سے کچھ پھر بھی خارجی ہی رہے، مثلاً بنووارگُو، جن میں سے فاطمیوں کے زمانے میں ابو یزید [رکؔ بآن] ''صاحب الحمار'' پیدا ہوا۔ یہ بغاوت بنووارگو کی تباہی کا باعث ہوئی، جنھوں نے فاطمیوں کے ہاتھ سے سخت سزا پا کر آئندہ کے لیے ایک نیم خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کر لی۔

وسط مغرب کے اِفْرِن تلمسان اور آس پاس کے میدانوں پر قابض رہے، لیکن نویں صدی مسیحی میں انھیں ادریسیوں کی سیادت تسلیم کرنا پڑی۔ بعد کی صدی میں انھوں نے فاطمیوں کے خلاف اندلس کے امویوں کا ساتھ دیا اور اس کشمکش سے فائدہ اٹھا کر اپنا علاقہ وسیع کر لیا۔ ان کے سردار یَعْلٰی بن محمد نے خلیفہ النّاصر سے وسط مغرب کے پورے مغربی حصّے کی حکومت حاصل کر لی اور اپنے دبدبے کا ڈنکا وہران (Oran) کے دور و دراز علاقے تک بجا دیا، جسے اس نے ۳۴۳ھ/ ۹۵۴-۹۵۵ء میں فتح کر کے بالکل تباہ کر ڈالا۔ ۳۳۸ھ/ ۹۴۹-۹۵۰ء میں اس نے معسکرہ (Mascara) کے جنوب مشرق میں اپنا دارالسلطنت اِیفْگان (فِکّان) تعمیر کر کے اسے گردونواح کے باشندوں سے آباد کیا، لیکن یَعْلٰی کی حکومت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ ۳۴۷ھ/ ۹۵۸ء میں وہ فاطمیوں کی فوج سے لڑتا ہوا مارا گیا، جن کے سپہ سالار جوہر [رکؔ بآن] نے اِیفگان کو تاخت و تاراج کیا۔

اس کے بعد اِفْرِن قبائل کی گروہ بندی ٹوٹ گئی۔ ان کی بعض شاخیں اندلس چلی گئیں، جہاں ان کا ایک سردار ابونُور ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴-۱۰۱۵ء میں شہر رونده (Ronda) پر تسلّط و تصرّف میں کامیاب ہو گیا۔ دوسروں نے پہلے تو صحرا کے کنارے پناہ لی اس کے بعد صَنْہاجہ کے خلاف مَغْراوہ (Maghrawa) کے ساتھ مل کر وسط مغرب میں ایک دفعہ پھر قدم جمانے کی کوشش کی۔ ۹۷۰ء میں بُلُکِّین بن زِیْری سے دوبارہ شکست کھانے اور منتشر ہونے کے بعد انھوں نے مغرب کے انتہائی حصّے میں قسمت آزمائی شروع کی۔ یَدُّو بن یَعْلٰی نے پہلے تو امویّوں کے ساتھ بڑی وابستگی کا اظہار کیا، لیکن بعد میں ان کی خستہ حالی سے فائدہ اٹھا کر اپنی جداگانہ حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مغرب کے گورنر زِیْری بن عطیہ سے فاس دو مرتبہ چھینا، لیکن اسے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ اس کے ایک عزیز حمّامہ نے اِفْرِن کی قسمت کا ستارہ پھر چمکا دیا۔ اس نے تادْلَہ کا علاقہ فتح کیا اور مغراوہ (فاسی) کے حملوں پر بھی متزلزل نہ ہوا۔ اس کے بھائی اور جانشین ابوالکمال تمیم نے بَرْغُواطہ کے خلاف جہاد میں اِفْرِن کی قیادت کی۔ اس نے ان ملحدین کی طاقت کچل ڈالی اور خود شالا میں حکم ران بن بیٹھا، بلکہ مغراوہ سے فاس بھی لے لیا، لیکن ۴۲۹ھ/ ۱۰۳۷-۱۰۳۸ء میں وہاں سے پھر نکال دیا گیا۔ ۴۶۶ھ/ ۱۰۷۳-۱۰۷۴ء میں وہ شالا میں فوت ہو گیا۔ اس کی قائم کردہ سلطنت بعد میں زیادہ مدّت تک قائم نہ رہ سکی۔ اسے المرابطون نے تباہ کر دیا، جنھوں نے تمام مفتوحہ علاقوں میں افرِن کا قتل عام کیا۔ اس قبیلے کے باقی ماندہ لوگ، جنھوں نے

تلمسان میں پناہ لی تھی، اس وقت ملیا میٹ کر دیے گئے جب یوسف بن تاشُفین اس شہر پر قابض ہوا.

مآخذ: (۱) ابن خَلدُون: *Histoire de Berberes*، ترجمہ دیسلان (de Slane)، ۳: ۱۸۶ ببعد؛ (۲) Fournel: *Les Berbers*، مواضع کثیرہ.

(یور G. YVER)

---

* اَفْرِیدُون: رک بہ فَرِیدُون.

---

* **اَفْرِیدی:** پاکستان کی شمالی و مغربی سرحد پر ایک بڑے اور طاقت ور پٹھان قبیلے کا نام، جس میں لڑنے والوں کی تعداد کا تخمینہ پچاس ہزار افراد کیا گیا ہے۔ جن علاقوں میں افریدی آباد ہیں وہ کوہ سفید کی مشرقی پہاڑیوں سے شروع ہو کر تیراہ کے نصف شمالی اور درّۂ خیبر [رک بآن] میں سے گزر کر ضلع پشاور کے مغرب اور جنوب کی طرف پھیلے ہوے ہیں۔ مشرق کی طرف ان کی حد پر پاکستان کے وہ اضلاع ہیں جو براہ راست حکومت کے تابع ہیں، شمالی جانب مہمَنْدوں کے علاقے، مغربی جانب شِنْواری، جنوب میں اورک زئی اور بنگش قبیلے ہیں۔ افریدی آٹھ خیلوں (clans) پر مشتمل ہیں۔ درۂ خیبر میں اور اس کے آس پاس کُوکی خیل، مَلِک دِین خیل، کمبر خیل، گُمرُ ئی، زُ کّا خیل اور سپاہ پائے جاتے ہیں۔ یہ چھے خیل عام طور پر خیبری اَفریدی کہلاتے ہیں۔ آکا خیل اَفریدیوں کا خیبر سے کوئی تعلق نہیں اور وہ باڑانڈی کے جنوب میں آباد ہیں۔ آدم خیل اَفریدیوں کی سکونت ضلع کوہاٹ اور ضلع پشاور کی درمیانی پہاڑیوں میں ہے.

اَفریدی، یا جیسا کہ وہ اپنے کو کہتے ہیں اَپُریدی، قبائل کا حسب ونسب ماہرین نسلیات کے لیے ہمیشہ ایک معمّا رہا ہے۔ B. W. Bellow (*JRAS*، ۱۸۸۷ء، ص ۴-۵) انھیں ہیروڈوٹس (Heredetus) کے Ἀπάρυται سمجھتا ہے۔ اس تعبیر کو گریرسن (G. A. Grierson: *Linguistic Survey of India*، ۱۰: ۵) اور سٹائن (A. Stein: *JRAS*، ۱۹۲۵ء، ص ۴۰۴) نے بھی تسلیم کر لیا ہے، لیکن یہ نام ہخامنشی (Achaemenian) کتبوں میں کہیں نہیں پایا گیا اور یہ امر مشکوک ہے کہ آیا ہیروڈوٹس کا مقصد Ἀπάρυται کے سلسلے میں ان مساکن کا بیان تھا جہاں اب اَفریدی رہتے ہیں۔ ریورٹی (H. G. Raverty: *Notes on Afghanistan*، ۱۸۸۸ء، ص ۹۴) ان نسب ناموں پر اعتماد کرتے ہوے جو غالباً جعلی ہیں افریدیوں کو پٹھان یا افغانی الاصل مانتا ہے، جن کا مُورِث اعلیٰ ایک مفروضہ شخص کَرْلان تھا۔ محمد حیات خان کی حیاتِ افغانی (انگریزی ترجمہ: *Afghanistan*، لاہور ۱۸۷۴ء، ص ۲۰۱) میں لفظ افریدی کو آفریدہ (= خدا کی مخلوق) سے مشتق بتلایا گیا ہے، مگر یہ بھی صریحاً زمانۂ حال کی پیداوار ہے۔ گریرسن (Griersen: *JRAS*، ۱۹۲۵ء، ص ۴۰۵-۴۱۶) کے خیال کے مطابق عہد حاضر کا تیراہ کسی زمانے میں ایک قوم کا مسکن تھا، جس کی بولی آج بھی ''تیراہی'' کہلاتی ہے اور جو کوہ ہندوکش کی دَرْ دِری (Dardic) بولیوں سے ملتی جلتی ہے، لہٰذا یہ بات اغلب معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ آفریدی پشتو بولتے ہیں تاہم ان میں اغلب نہیں تو بڑا نسلی عنصر ان لوگوں کا ضرور موجود ہے جو اُن پشتو بولنے والے حملہ آوروں سے پیشتر تیراہ میں آباد ہو چکے تھے اور جنھوں نے تیرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان دریاے سندھ کے مغربی جانب کی پہاڑیوں اور دریائی مٹی کے (alluvîal) میدانوں کی پٹی میں رفتہ رفتہ اپنے قدم جما لیے تھے.

درۂ خیبر کے آر پار، جو ہندوستان کو افغانستان سے ملاتا ہے، مغل بادشاہوں کے لیے اپنے دُور افتادہ صوبۂ کابل سے محفوظ طریقے پر سلسلۂ مواصلات قائم رکھنا افریدیوں کی وجہ سے بے حد دشوار ہو گیا تھا۔ اکبر بادشاہ کے عہد حکومت میں فرقۂ روشنیہ [رک بآن] کے بانی بایزید اور اس کے بیٹے جلال الدّین کی تلقین سے جوش میں آ کر انھوں نے مغلوں کے ان فوجی دستوں اور قافلوں پر حملے شروع کر دیے جو درّۂ خیبر میں سے گزرتے تھے۔ اکبر کی فوجوں نے ۱۵۸۷ء میں انھیں ہتھیار ڈال دینے اور اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کر دیا اور آئندہ سال کچھ وظائف کے بدلے میں انھوں نے درۂ خیبر کو آمدورفت کے لیے کھلا رکھنے کا وعدہ کر لیا، مگر یہ اطاعت محض عارضی ثابت ہوئی، کیونکہ جہانگیر اور اورنگزیب کے دور حکومت میں بھی ان کے خلاف فوجی مہمّیں روانہ کرنا پڑیں۔ جہانگیر نے بہت سے اَفریدیوں کو ہندوستان اور دکن کی طرف جلاوطن کر دیا، جہاں ان کی اولاد اب تک موجود ہے۔ احمد شاہ درّانی نے افغانی سلطنت قائم کر لی۔ اَفریدی برائے نام اس کے تابع فرمان رہے۔ احمد شاہ کے دیوانِ افواج میں بھی ان کا نام آتا ہے، اس کی رُو سے اَفریدی قبیلے میں انیس ہزار جنگ جو شمار ہوتے تھے.

برطانوی فوجوں سے اَفریدیوں کی ابتدائی آویزش پہلی جنگ افغانستان (۱۸۳۹-۱۸۴۲ء) کے دوران میں ہوئی۔ الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) سے شمالی و مغربی سرحدی صوبہ بننے تک (۱۹۰۱ء) افریدیوں کے خلاف آٹھ سے کم مہمّیں نہ بھیجنی پڑیں۔ پہلی درّۂ کوہاٹ کے اَفریدیوں کے خلاف (۱۸۵۰ء) اور دوسری جوا کی اَفریدیوں کے خلاف (۱۸۵۳ء)، جو آدم خیل اَفریدیوں کی ایک شاخ ہیں۔ پھر زُ کّا خیل افریدیوں کے خلاف تعزیری تدبیریں ناگزیر ہو گئیں (۱۸۵۵ء)۔ جوا کی اَفریدیوں کے خلاف مہمّیں ۱۸۷۷ء اور (۱۸۷۸ء) زُ کّا خیل افریدیوں کے خلاف ۱۸۷۸ء اور ۱۸۷۹ء۔ تمام اَفریدی قبائل میں سے درّۂ خیبر اور اس سے ملحقہ وادی بازار (تیراہ) کے اَفریدی سب سے زیادہ سخت ہیں۔ وہ ان علاقوں میں آباد ہیں جو سفید کوہ کی ڈھلانوں سے اطراف پشاور تک پھیلے ہوے ہیں۔ لہٰذا ان علاقوں میں سے رعایت گزر کے لیے وہ ہمسایوں کو بھاری تاوان ادا کرنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ زُ کّا خیل کے ساتھ پہلا معاہدہ ۱۸۵۷ء کے دوران میں ہوا (ایچی سن (Aitchison)، ۱۱: ۹۲-۹۶)۔ اس معاہدے پر اَفریدی دوسری جنگ افغانستان ۱۸۷۸-۱۸۸۰ء تک کاربند رہے، جب نہ صرف خیبر بلکہ

پورے سرحدی علاقے کے امن و امان میں غیر معمولی خلل رونما ہو گیا تھا۔ زُکّا خیلوں نے خیبر کے خطوط مواصلات پر حملے کیے۔ برطانوی فوج نے ان کے علاقے میں گھس کر فصلیں تباہ کیں، گڑھیاں اور گاؤں مسمار کر دیے (۱۸۷۸-۱۸۷۹ء)۔ ۱۷ فروری ۱۸۸۱ء کو خیبر کے اَفریدیوں اور لنڈی کوتل کے لُوَرگی (Leargi) شنواریوں نے مل کر خیبر کے علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کی ذمّے داری سنبھال لی اور اپنی آزادی تسلیم کیے جانے کے عوض کسی دوسری خارجی حکومت سے کوئی راہ و رسم نہ رکھنے کا عہد کر لیا۔ ساتھ ہی خیبر کی حفاظت کے لیے جَزائلِ چیون (قبائلی رنگروٹوں) کا ایک دستہ رکھنے کے انتظامات بھی عمل میں آئے، جن کی تنخواہ حکومتِ ہند نے اپنے ذمّے لے لی (ایچی سن، ۱۱: ۹۷-۹۹)۔ ۱۸۹۷ء میں سرحد پر جو عام شورش برپا ہوئی، اس میں اَفریدی سب سے آخر میں شامل ہوے اور ۱۸۹۷-۱۸۹۸ء کی مہم تیراہ میں شدید جنگ کے بعد ہی صلح پر آمادہ ہوے۔ اس مہم کے خاتمے پر وظائف کا وہی پرانا طریق پھر اختیار کر لیا گیا جو سترہ سال تک (۱۸۸۱ء-۱۸۹۷ء) نہایت کامیاب ثابت ہو چکا تھا، ساتھ ہی خیبر رائفلز (خیبر کا حفاظتی دستہ) کو برطانوی افسروں کے ماتحت ازسرِ نو منظّم کیا گیا اور ان کی مدد کے لیے پشاور میں ایک متحرّک فوجی دستہ متعیّن کر دیا گیا۔ اس معاہدے کے مطابق حکومت برطانیہ خیبر کے فوجی دستوں اور درۂ خیبر کے امن و امان کی ذمّے دار بن گئی؛ یوں برطانیہ اور اَفریدیوں کے باہمی تعلّقات ۱۹۰۸ء، تک استوار رہے (*Parliamentary Papers*، ۱۹۰۸ء، ج ۷۴، شمارہ ۴۲۱۰، ص ۱۴-۱۵)۔

۱۹۰۴ء کے اواخر میں بہت سے اَفریدی کابل گئے۔ اس کے بعد برطانوی علاقے میں چھوٹے پیمانے پر چھاپوں کی چند وارداتیں ہوئیں، جن میں زیادہ تر زُکّا خیلوں کا ہاتھ تھا۔ ان کی امداد کے لیے بعض دوسرے افریدی قبائل، نیز اورک زئی وغیرہ بھی شریک تھے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اَفریدیوں کے دستے، جو ہر طرح مسلّح تھے، برطانوی علاقوں پر چھاپے مارتے رہے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۰۸ء کی رات کو اسّی افریدیوں کا ایک دستہ پشاور پر حملہ آور ہوا۔ آخر میجر جنرل سر جیمز ول کاکس کی سرکردگی میں فوجی دستے بھیج کر زُکّا خیلوں کو دبا دیا گیا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکی پہلی عالمی جنگ میں [اتحادیوں کے خلاف] شامل ہوا اُس سے سرحد میں خاصا جوش پھیلا۔ اَفریدیوں کا رویہ ہمیشہ سرحد پر سب سے بڑا خطرہ رہا ہے کیونکہ دوسرے قبائل عموماً افریدیوں ہی کی پیروی پر آمادہ رہے ہیں۔

۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کی عالمی جنگ کے فوراً بعد ۱۹۱۹ء میں تیسری جنگ افغانستان شروع ہو گئی، جو گویا پوری سرحد کو آمادۂ پیکار کر دینے کا اشارہ تھی اور خطرہ تھا کہ لارڈ کرزن نے ملیشیا کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ بالکل درہم برہم ہو جائے گا۔ ۱۹۲۱ء تک اَفریدی قبائل نے پوری طرح اطاعت قبول کر لی۔ خیبر رائفلز کا فوجی دستہ توڑ دیا گیا اور اس کی جگہ خاصہ داروں نے لے لی، یعنی قبائلی رنگروٹوں نے، جن کے اخراجات حکومتِ ہند ادا کرتی تھی، مگر وہ اپنے لیے ہتھیار اور گولی بارود خود فراہم کرتے تھے، لیکن اِکّا خیل کے مُلّا سیدا کبر کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر سخت خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ افریدی پھر چھاپوں کا سلسلہ شروع کر دیں گے، کیونکہ ملاے موصوف ان تمام قبائل کی مذمّت کرتا تھا جنھوں نے حکومت ہند کی شرطیں مان لی تھیں۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں اَفریدیوں کے قبائلی جرگے نے خیبر ریلوے کی تعمیر کے سلسلے میں مزید ذمّہ داریاں قبول کرتے ہوے نئے مقرر شدہ وظیفے لینا منظور کر لیا (*Secret Border Report*، ۱۹۲۱-۱۹۲۲ء، ص ۱)۔

[برطانوی عہد میں جمرود سے لنڈی خانے تک ریل جاری ہو جانے سے صلح و امن کو کوئی تقویت نہ پہنچی۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک تیراہ مذہبی کشمکش کا اکھاڑا بنا رہا۔ ۱۹۴۷ء سے حکومت پاکستان نے تمام انتظامات سنبھال لیے اور قبائلیوں کے لیے فلاحی منصوبوں کے مطابق وسیع پیمانے پر کام شروع کر دیا۔ اب بیس سال سے ہر حصّے میں کامل امن ہے اور یہ حِصۂ ملک برابر ترقی کر رہا ہے]۔

مآخذ: (۱) ایچی سن (C. U. Aitchison): *Treaties, Engagements and Sanads*، ۱۹۰۹ء، ج ۱۱؛ (۲) C. C. Davies: *The Problem of North-West Frontier*، کیمبرج ۱۹۳۲ء؛ (۳) وہی مصنّف: *British Relations with the Afridis of the Khyber and Tirah*، در *Army Quarterly*، ۱۹۳۲ء؛ (۴) *Frontier and Overseas Expeditions from India*، ج ۲ وضمیمہ الف، ۱۹۰۸ء؛ (۵) ہچنسن (H. D. Hut- chinson): *The Campaign in Tirah*، لنڈن ۱۸۹۸ء؛ (۶) ہولڈچ (Th. Holdich): *The Indian Borderland*، لنڈن ۱۹۰۱ء، باب ۱۵ و ۱۶؛ (۷) *North-West Frontier Province Administration Reports* (جو سال بہ سال شائع ہوتی تھیں)؛ (۸) پیجٹ (W. H. Paget) و میسن (A. H. Mason): *Record of Expeditions against the N. W. F. Tribes since the Annexation of the Punjab*، ۱۸۸۸ء؛ (۹) *Parliamentary Papers*، ۱۹۰۸ء، ج ۷۴، شمارہ ۴۲۰۱؛ (۱۰) وار برٹن (R. Warburton): *Eighteen years in the Khyber* (۱۸۷۹-۱۸۹۸ء)، ۱۹۰۱ء۔

(C. COLLIN DAVIES [و ادارہ])

اِفْرِیقِیَہ: (بقول فلائشر (Fleischer): *Kleinere Schriften*، ۱: ۲۳۹ یہ املا بہ نسبت اِفْرِیقِیَہ، جو اب تک مستعمل رہا، زیادہ درست ہے)*، بربرستان (Barbary) کے مشرقی حصّے کا عربی نام، بحالیکہ المغرب کا نام مغربی حصّے کے لیے مخصوص ہے۔ افریقیہ لاطینی لفظ افریکا (Africa) کی فقط ایک بدلی ہوئی شکل ہے اور یہ نام رومیوں نے شروع میں اس صوبے کو دیا تھا جس کی تشکیل انھوں نے قرطاجنہ (Carthage) کی تباہی کے بعد کی۔ بعدازاں اس نام کا اطلاق بربرستان اور بالآخر پورے براعظم افریقہ پر ہونے لگا۔ اسی نام کے متعدّد قیاسی اشتقاقات بھی دیے گئے ہیں: مثلاً البکری لکھتا ہے کہ ''بعض کے نزدیک اس نام کے معنی ملکۂ آسمان کے ہیں؛ بعض کی راے ہے کہ یہ نام اِفْرِیقُوس بن

اَبْرَہَۃ الرّائش کے نام پر رکھا گیا ہے، جس نے بربر علاقے پر فوج کشی کی تھی اور شہر افریقیہ تعمیر کیا تھا (قب المسعودی، مطبوعۂ پیرس، ۳: ۲۲۴)؛ بعض اَور لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام [حضرت] ابراہیمؑ کے بیٹے اَفْرِیق سے ماخوذ ہے، جو ان کی بیوی قطورا کے بطن سے تھا، یا فارق بن مِصْرائم سے لیا گیا ہے۔ ابن خَلْدون کے قول کے مطابق افریقیہ کا نام یمن کے ایک بادشاہ اِفْرِیْقُوس بن قَیْس بن صَیْفی کے نام سے ماخوذ ہے۔ المَقْرِیزی کے بیان کے مطابق (منقول در ابن ابی دینار) اَفْرِیقُوش بن اَبْرَہہ بن ذی القَرْنَین نے المغرب کو فتح کر کے وہاں ایک شہر تعمیر کیا اور اس کا نام اَفْرِیقہ رکھا۔ ابن الشَّبّاط (حوالہ در ابن ابی دینار) افریقیہ کے لفظ کو بَرِیْق "صاف" [= چمکیلا] سے مشتق بتاتا ہے "کیونکہ افریقہ کے آسمان پر بادل بالکل نہیں ہوتے۔ الحسن بن محمد الوزان الزیاتی (لیوافریقانوس Leo Africanus) اور ابن ابی دینار افریقیہ کا ماخذ فَرَق "جدا کرنا" ٹھیراتے ہیں، اس لیے کہ اسے بحیرۂ روم یورپ سے اور دریاے نیل ایشیا سے الگ کرتا ہے، یا اس لیے بھی کہ یہ مشرق و مغرب کے درمیان واقع ہے۔

البکری کے بیان کے مطابق افریقیہ کی حد مشرق میں بَرْقہ اور مغرب میں طَبْنَہ تھی۔ شمالاً جنوباً یہ بحیرۂ روم کے ساحل سے اس "ریگستان تک پھیلا ہوا تھا جہاں سے حبشیوں کا ملک شروع ہوجاتا ہے"۔ اس حساب سے رومیوں کے مخصوص صوبۂ افریقہ کے علاوہ افریقیہ میں طرابُلُس (Tripolitania) اور نومیدیا (Numidia) بلکہ موری تانیا (Mauretania) بھی شامل ہوجاتے ہیں، لیکن البکری سے قدیم تر اور متأخر جغرافیہ نویس اس کی حدیں تنگ تر بتاتے ہیں، مثلاً اَلاِدْرِیسی (چوتھی صدی ہجری) افریقیہ کی جاے وقوع بَرْقہ اور تاہَرْت کے درمیان بتاتا ہے (*Bibl. Gegr. Arab.*، طبع دخویہ (de Goeje)، ۱: ۶۳ اور ۴۵)۔ ابوالفداء کے نزدیک افریقیہ کی حد سرزمین بجایہ (Bougie) [رک بآں] کے مشرقی سرے سے شروع ہوتی ہے، جو اس کے نزدیک المغرب الاوسط کا ایک حصّہ ہے اور بَرْقہ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ تاہم عام طور پر ہم افریقیہ کی مغربی حد کو بجایہ کے دائرۂ نصف النّہار (Meridian) کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ جنوب کی طرف اَلاِدْرِیسی اور بعد میں الحسن بن محمد الوزان الزیاتی (لیوافریقانوس Leo Africanus) الأفریقیہ کو بلاد الجَرِید سے، جسے الحسن نومیدیا (Numidia) کہتا ہے، بالکل الگ سمجھتے ہیں۔ ابن خَلْدُون کے نزدیک صحرا [اعظم] میں وادی مزاب (Mzāb)، صحراے افریقیہ اور صحراے مغرب کے درمیان حد فاصل ہے۔ مزید براں معلوم ہوتا ہے کہ اس عام مفہوم کے علاوہ افریقیہ کا لفظ اکثر ایک محدود تر معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے؛ چنانچہ ابن خلدون اسے کئی جگہ تونس کے درمیانی اور شمالی حصّے کے لیے استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ افریقیہ کے ایک طرف طرابلس (Tripolitania) اور الجرید (مشرقی تونس)، دوسری طرف صوبۂ قسنطینہ یا قسنطین (Constantine، الجزائر) ہے (قب بالخصوص اس مصنف کے بیانات جن میں وہ ہلالی حملے کا ذکر کرتا ہے)۔ ابوالفداء بجایہ (Bougie)، بونہ (Bône) اور قفصہ (Gafsa) کو الأفریقیہ سے خارج بتاتا ہے۔ اس کے قول کے مطابق اس ملک کی حدود وہی ہوں گی جو مارمول (Marmol) نے صوبۂ تونس ("جسے افریقہ کہا جاتا ہے") کی بیان کی ہیں۔ بالفاظ دیگر افریقیہ کی حدیں یہ ہوئیں: مغرب میں قسنطینہ، مشرق میں صوبۂ طرابلس، جنوب میں کوہستان اطلس، صوبۂ زاب، نومیدیا کا ایک حِصّہ اور مشرقی لیبیا، شمال میں بحیرۂ روم مجردہ (Megerade) کے دہانے سے بِزَرْتا (Bizerta) کی طرف قابس (Capès) تک۔ بالآخر سترھویں صدی عیسوی میں ابن ابی دینار ہمیں یہ بتاتا ہے کہ "علما الأفریقیہ سے القیروان کا علاقہ مراد لیتے ہیں"۔

اوائلِ سنینِ ہجرت میں الأفریقیہ بدستور روم (Byzantine) کے قبضے میں تھا۔ یہاں بربر قبائل (ہُوارہ (Huwāra)، لُواطہ (Luwāṭa)، اوریغہ (Awrighta)، نِفُوسہ (Nefūsa)، اِفْرِن (Ifren)، نِفْزاوہ (Nefzāwa) وغیرہ) اور ان لوگوں کے اخلاف آباد تھے جو بیرونی ممالک سے آکر افریقہ میں بس گئے تھے اور جنھیں عرب مصنّفین اَفارِق کہتے تھے۔ اس میں بہت سے شہر اور گاؤں اور بکثرت ہرے بھرے کھیت تھے۔ عربوں نے فتح مصر کے فوراً ہی بعد یہاں حملے شروع کر دیے۔ حقیقی معنی میں فتح اس وقت سے شروع ہوئی جب عُقْبہ بن نافع نے ۵۰ھ/ ۶۷۰ء میں القیروان کی بنیاد رکھی۔ تاہم اس ملک میں عربوں کی حکومت ساتویں صدی عیسوی کے اختتام تک بہت متزلزل حالت میں رہی۔ اہمّ ترین شہر اس وقت تک یونانیوں کے قبضے میں تھے؛ دوسری طرف بربری بغاوتوں کی وجہ سے عُقبہ کا جانشین زُہَیر بن قَیْس دو مختلف موقعوں پر الأفریقیہ خالی کر دینے کے لیے مجبور ہوگیا۔ حسّان بن نعمان ہی کے عہد ولایت میں بربروں کو بزورِ شمشیر تابع فرمان بنایا جا سکا اور رومیوں کے قبضے سے قرطاجنہ اور ملک کے دوسرے بڑے بڑے شہر نکل گئے۔

افریقیہ کو پہلے تو مصر کے گورنر کے ماتحت رکھا گیا، پھر ۸۶ھ/ ۷۰۵ء میں موسٰی بن نُصَیر کے ماتحت کر دیا گیا، جو براہِ راست خلیفۂ دمشق کے زیرِ فرمان تھا۔ گویا اسے ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا۔ اس سپہ سالار کی فتوحات نے صوبے کی حدیں آبناے جبل الطارق تک وسیع کر دیں، لیکن آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے خارجی بغاوتوں کی بدولت عربوں کا علاقہ بہت کم رہ گیا۔ جو حصّہ خاص طور پر الأفریقیہ کہلاتا تھا اسے مشرق کے اباضی بربروں (ہُوارہ، وَفَرْجُومہ) اور وسطی مغرب کے زَناتہ نے تاخت و تاراج کیا۔ یہاں تک کہ کچھ مدّت کے لیے یہ علاقہ عبّاسی خلفا کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بہرحال ۱۴۴ھ/ ۷۶۱ء اور بعد کے برسوں میں المنصور افریقیہ کو دوبارہ عبّاسی حکومت کے زیرِ نگیں لانے میں کامیاب ہوگیا؛ ساتھ ہی المغرب میں چند آزاد بربر ریاستیں قائم ہوگئیں۔ تاہم اَغْلَبی خاندان [رک بہ اغالبہ] (نویں صدی عیسوی) خلیفہ کی سیادت کو محض براے نام ہی تسلیم کرتا تھا۔ جب فاطمیوں نے اغلبیوں کو شکست دی تو الأفریقیہ شیعوں کے قبضے میں چلا گیا، جنھوں نے المہدیّہ کے نام سے اس کا ایک نیا دارالسلطنت بنایا اور جب وہ مصر میں اپنے قدم جما چکے تو انھوں نے زیریوں کے ماتحت اسے ایک

الگ ولایت بنا دیا، لیکن حمّادیوں نے سلطنت کی بنیاد رکھنے سے کچھ عرصے بعد زیریوں کو الأفریقیہ کے مغربی حصّے سے نکال باہر کیا۔ دوسری جانب ہلالی حملے نے، جس کا باعث فاطمی حکومت سے ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸-۱۰۴۹ء میں المُعِزّ الزّیری کی سرتابی تھی (قب فاطمیہ)، اس ملک کو نہایت خوفناک مصیبتوں کی آماج گاہ بنا دیا۔ وہ الأفریقیہ جو پہلے بہت خوش حال تھا، انگوروں کے باغات اور کھیتوں سے بھرا پڑا تھا، خانہ بدوشوں کی تاخت وتاراج کے باعث تقریباً سارے کا سارا تباہ و برباد ہوگیا۔ بعض عرب قبائل، بالخصوص ریاح اور جُشم نے وہاں اپنے قدم جما لیے اور بدنظمی وغارت گری کی عادتیں جاری رکھیں۔ انجام کار آئندہ صدی کے شروع میں صقلیّہ کے نارمنوں نے ساحل کے اہمّ مقامات پر قبضہ کرلیا۔ الموحّدین کی فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ افریقیہ عبدالمؤمن [رک بآن] کی بنا کردہ وسیع مملکت کا ایک محکوم صوبہ بن گیا، لیکن بنوحفص [رک بآن] کے ماتحت اس نے بہت جلد دوبارہ اپنی آزادی حاصل کر لی۔ ابتدا میں ان حکمرانوں کی حکومت تونس، طرابلس، قسنطینہ، بجایہ اور زاب تک پھیلی ہوئی تھی، پندرھویں صدی عیسوی کے آخر سے تونس (بہ مفہوم محدود) تک رہ گئی۔ اس کے بعد سے الأفریقیہ کی تاریخ تونس کی تاریخ میں ضم ہوگئی۔

مآخذ: (۱) البکری: *Descr. de. l'Afrique septentrionale*، طبع و ترجمہ دَسلان (de Slane)، متن ص ۲۱-۲۲، ترجمہ ص ۵۲؛ (۲) ابوالفداء: *Géographie*، ترجمہ رینو (Reinaud)، پیرس ۱۸۴۸ء، جلد ۲، باب ۳؛ (۳) ابن خَلدُون: *Berbérs*، طبع دَسلان (de Slane)، متن ۱: ۱۵، ۱۰۶؛ ترجمہ ۱: ۱۶۸؛ (۴) الحسن بن محمد الوزان الزیاتی Leon Africanus: *L'Afrique*، طبع شیفر (Schefer)، ۱: ۱؛ (۵) مارمول (Marmol): *Africa*، ۲: ۴۳۱؛ (۶) ابن ابی دینار القیروانی: المؤنس فی اخبار افریقیة، ترجمہ Pellissier و Remusat، پیرس ۱۸۴۹ء، کتاب ۲؛ (۷) Castiglioni: *Mémoire géographique et numismatique sur la partie orientale de la Bérberie appelée Afrikia par les Arabes*، میلان ۱۸۲۶ء؛ (۸) Fournel: *Les Berberes*، پیرس ۱۸۷۵ء، ۱: ۳۱ ببعد؛ (۹) A. Muller: *Der Islam*, etc.، ۱: ۳۵۱ ببعد، ۴۱۹-۴۲۳، ۴۴۶-۴۵۱، ۴۸۶-۴۸۹، ۵۴۷-۵۵۶، ۶۰۶-۶۲۲ و ۲: ۵۱۳-۵۱۶، ۶۱۳-۶۱۷، ۶۲۱-۶۳۱، ۶۴۵-۶۵۳۔ نیز دیکھیے وہ مآخذ جو الجزائر، طرابلس الغرب اور تونس کے تحت دیے گئے ہیں۔

(G. YVER یور)

---

* **اَفْسَنْتِین:** اِفْسِنْتِین یا شاذ و نادر اِفْسِنْتِین (یونانی ἀφίνθιον سے)، زیادہ تر مرادو رم وُڈ (Wormwood) (لاطینی نام Artemisia Absinthium، ایک کڑوی بُوٹی) ہوتی ہے، لیکن اس کے علاوہ دوسری اقسام کے پودے بھی ہیں۔ طبّی کتابوں میں اسے اکثر کَشُوتِ رُومی لکھا جاتا ہے۔ اس کی متجانس شکل اِسْفِنْط (ahsinth-wine) کا ذکر قدیم عرب شاعری میں بھی ملتا ہے (نولدیکہ، در *Löw*، ص ۳۸۹)۔

اَفْسَنْتِین سے متعلق عربوں کی پیش کردہ معلومات کا معتدبہ حصّہ یونانی ولاطینی مآخذ سے لیا گیا ہے۔ اس کی قسم بندی عموماً اصل کے مطابق کی جاتی تھی، مثلاً ایرانی، نبطی، شامی، مصری، خراسانی وغیرہ۔ صُور (Tyre) اور طَرسُوس کی اَفْسَنْتِین بہترین سمجھی جاتی تھی۔ اس کے زرد پھول سے خصوصاً مختلف طبی کام لیے جاتے تھے۔ اس بوٹی کو نہ صرف مُقوّی اور کرم کُش سمجھا جاتا تھا، بلکہ قبض کشا اور پیشاب آور ہونے کے علاوہ چند اَور خواص بھی اس کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ مثلاً زہر کے اثرات کو دور کرنے کے لیے بھی اسے مفید بتایا جاتا تھا۔ خارجی طور پر یہ ضماد (پلاسٹر) اور تیل میں استعمال کی جاتی تھی۔ خیال تھا کہ اگر اس کا عرق روشنائی میں ملا دیا جائے تو کاغذ محفوظ رہتا ہے۔ چند دوسری بیماریوں کے علاوہ سر سے بال گرنے (داء الثعلب) سے روکنے کے لیے بھی اسے مفید بتایا جاتا تھا۔

مآخذ: (۱) علی الطَّبری: فردوس الحکمة (طبع صدیقی)، ص ۴۱۸-۴۱۹؛ (۲) داؤد الأنطاکی: تذکرة، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ۱: ۴۹-۵۰؛ (۳) غافقی (طبع Meyerhof-Sobhy)، عدد ۲۷؛ (۴) ابن العوّام: فِلاحة، (ترجمہ Clément-Mullet)، ۲ الف، ۳۰۲-۳۰۳؛ (۵) ابن البَیطار: جامع، بولاق ۱۲۹۱ھ، ۱: ۴۱-۴۴؛ (۶) قزوینی (وُسٹِنْفِلْڈ Wüstenfeld)، ۱: ۲۷۲؛ (۷) I. Löw: *Aram. Pflanzennamen*، ص ۸۱، ۴۲۱؛ (۸) وہی مصنّف: *Die Flora der Juden*، ۱: ۳۸۶-۳۸۹؛ (۹) ابن میمون (Maimonides): شرح اسماء العقّار (طبع Meyerhof)، عدد ۳؛ (۱۰) تُحفَة الأحباب (طبع Renaud-Cloin)، عدد ۱۔

(L. KOPF)

اَفْسُوس: میر شیر علی بن سیّد علی مظفر خان کا تخلّص، ان کا سلسلۂ نسب امام ⊗ جعفر صادقؒ سے ملتا ہے۔ ان کے آباواجداد ایران میں بہ مقام خواف سکونت پذیر تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ سیّد بدرالدین برادر سیّد عالم الدّین حاجی خانی ہندوستان میں آئے اور [ریواڑی] کے نزدیک قصبۂ نارنول میں قیام کیا۔ محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے عہد میں افسوس کے دادا سید غلام مصطفٰی دہلی آئے اور نواب شمس الدولہ خان کے زمرۂ مصاحبین میں داخل ہوگئے۔ ان کے والد اور چچا سید غلام علی خان، عمدۃ الملک امیر خان کے مصاحب تھے۔ افسوس دہلی میں پیدا ہوئے اور وہاں آزادانہ تعلیم پائی۔ جب نواب ۱۷۴۷ء میں قتل ہوئے تو افسوس کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اس وقت ان کے والد انھیں اپنے ساتھ پٹنے لے گئے اور نواب جعفر علی خان معروف بہ میر جعفر کی ملازمت اختیار کر لی۔ نواب موصوف کی معزولی (۱۷۶۰ء) تک وہ پٹنے ہی میں رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ میں اور وہاں سے حیدرآباد چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ افسوس اپنے والد کے حیدرآباد جانے سے دو سال پہلے لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو چکے تھے۔ نواب سالار جنگ ابن اسحٰق خان کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر تھا اور وہ شاہ عالم ثانی کے بڑے بیٹے مرزا جوان بخت (جہاں دار شاہ) کے (جو دہلی سے لکھنؤ آ گئے تھے) مصاحب ہو گئے تھے۔

انھوں نے چند سال لکھنؤ میں بسر کیے، پھر نواب آصف الدّولہ کے نائب

مرزا حسن رضا خان نے ان کی ملاقات وہاں کے ریذیڈنٹ کرنل سکاٹ (W. Scott) سے کرادی، جن کی سفارش سے وہ ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰-۱۸۰۱ء میں کلکتے چلے گئے اور وہاں فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی میں ہیڈ منشی مقرر ہو گئے۔

لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں افسوس نے ایک ہندوستانی دیوان مرتّب کیا اور گلستانِ سعدی کا اردو ترجمہ بھی کیا، جس کی تکمیل ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۲ء میں باغ اردو کے نام سے ہوئی۔ اس ترجمے کے مقدّمے میں افسوس نے اپنے حالات خود لکھے ہیں اور ان کی ابتدائی زندگی کے متعلّق ہماری معلومات کا سب سے بڑا ماخذ یہی ہے۔ کلکتے کے قیام میں افسوس نے کلیات سودا کی ترتیب و تدوین کی اور فارسی کی چند تصانیف کے ان اردو ترجموں پر نظر ثانی بھی کر لی جو کالج کے دوسرے منشیوں نے کیے تھے۔ اُنھوں نے منشی سجان رائے [بٹالوی] کی فارسی تاریخ ہند (۱۱۰۷ھ/ ۱۶۹۵-۱۶۹۶ء) خلاصۃ التواریخ کے پہلے حصّے کا ترجمہ بھی اردو میں کیا۔ یہ ترجمہ، جو مورِنگٹن (J. H. Morington) کی فرمائش پر شروع ہوا تھا، ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء میں آرایش محفل کے نام سے مکمّل ہوا اور ۱۸۰۸ء میں کلکتے میں پہلی مرتبہ طبع ہوا۔ جان شیکسپیر (John Shakespear) نے اس کتاب کے پہلے دس باب انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے اپنی کتاب منتخبات ہندی میں شامل کیے (ڈبلن ۱۸۴۷ء)۔ اس کا مکمل انگریزی ترجمہ کورٹ (M. J. Court) نے کیا، جو ۱۸۷۱ء میں الٰہ آباد سے شائع ہوا (بار دوم، کلکتہ ۱۸۸۲ء)۔ گارسان دتاسی (Garcin de Tassy: *Litt. Hind.*) اور شپرنگر (Sprenger: *Oudh Catalogue*، ص ۱۹۸) کے قول کے مطابق افسوس نے ۱۸۰۹ء میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) گارسان دتاسی (Garcin de Tassy): *Histoire de la Littèrature Hindouie et Hindoustanie*، طبع ثانی، پیرس ۱۸۷۰ء، ۱: ۱۲۰-۱۳۶؛ (۲) بلوم ہارٹ (Blumhardt): *Catalogue of Hindi, Panjabi and Hindustani Mss. in the British Museum*، عدد ۷۲ (لنڈن ۱۸۹۹ء)؛ (۳) مرزا علی لطف: گلشن ہند (اردو زبان میں ہم عصر ماخذ)، ص ۴۷-۵۰ (لاہور ۱۹۰۶ء)؛ (۴) نواب محمد مصطفٰی خان شیفتہ: گلشن بے خار (فارسی)، ص ۲۳ و ۲۴ (لکھنؤ ۱۸۷۴ء)؛ (۵) محمد یحییٰ تنہا: سیر المصنفین (اردو)، ۱: ۷۹-۸۷ (دہلی ۱۹۲۴ء)؛ (۶) سید محمد: ارباب نثر اردو (اردو)، مطبوعۂ حیدر آباد دکن، ص ۹۱-۱۰۰؛ (۷) رام بابو سکسینہ: *A History of Urdu Literature*، ص ۲۴۴-۲۴۵ (الٰہ آباد ۱۹۲۷ء)۔

(بلوم ہارٹ J. F. BLUMHARDT و شیخ عنایت اللہ)

---

* **اَفسُون:** (فارسی) سحر و عزیمت، جادو، منتر؛ اس لفظ کے اشتقاق اور قدیم فارسی میں اس کے استعمال کے لیے دیکھیے Salemann، در *Gr. I. Ph*، ۱/۱: ص ۳۰۴، خصوصًا H. W. Bailey، در *BSOAS*، ۱۹۳۳-۱۹۳۵ء، ص ۲۸۳ ببعد۔ ایران میں اب یہ لفظ خصوصیت سے اس منتر کے لیے مستعمل ہے جو زہریلے جانوروں کے کاٹے پر پڑھا جاتا ہے۔ بعض درویش، جو سانپ اور بچھو وغیرہ کو مسحور کرنے کے مدّعی ہیں، کچھ انعام لے کر اپنی مصونیت دوسروں کی طرف بھی منتقل کر دیتے ہیں۔ منتر سے عموماً جسم کے کسی ایک حصّے کو محفوظ کر دیا جاتا ہے، مثلاً دایاں یا بایاں ہاتھ اور اسی سے اس قسم کے جانوروں کو پکڑنا ہوتا ہے (Polak: *Persien*، ۱: ۳۴۸) [مجازًا افسون مکر و حیلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور فارسی ادب میں خواندن، دمیدن، بستن، کردن وغیرہ کے ساتھ مستعمل ہے]۔

(CL. HUART ہوار)

---

* **اَفشار:** یا اَوشار اُغز (عُزّ [رک بآں]) قبیلہ، جس کا ذکر سب سے پہلے کاشغری نے اپنی کتاب دیوان لغت التُّرک، ۱: ۵۶، میں کیا ہے؛ قب نیز رشید الدین: جامع التواریخ (طبع Bérézine)، ۱: ۳۲، جس کے بیان کے مطابق اوشار، یِلدِز خان کا پوتا تھا، جو اُغز خان کا تیسرا بیٹا تھا (لہٰذا یازیجی اوغلو: سلجوق نامہ، مخطوطہ؛ ابو الغازی، شجرۂ ترکی (طبع Desmaisons)، ص ۲۷؛ وہی مصنّف: شجرۂ تراکمہ، استانبول ۱۹۳۷ء، ص ۴۲)۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دوسرے عُزّ قبائل کے ساتھ ترکِ وطن کر کے مغرب کی طرف چلے گئے تھے۔ ایک افشار سردار، جس کا نام آی دُوغُو بن قوش دوغان اور عرف شُملہ تھا، سلجوقیوں کے باج گزار کی حیثیت سے خُوزِستان میں حکومت کرتا تھا (البُنداری، طبع ہوتسما (Houtsma)، ص ۲۳۰، ۲۸۷؛ الراوَندی، راحۃ الصدور، ص ۲۶۰؛ ابن الأثیر، بمد دِاشاریہ، بذیل مادّۂ شُملہ؛ وصّاف (مطبوعۂ بمبئی، ۲: ۱۴۹) اسے یعقوب بن ارسلان الافشاری لکھتا ہے؛ ''حُسام الدین شُہلی''، در حمد اللہ المستوفی: تاریخ گزیدہ، ۱: ۵۴۷— اور اسی سے بِدلِیسی: شرف نامہ (طبع Velyaminov Zarnov)، ۱: ۳۳— سے بظاہر یہی شخص مراد ہے اور غالبًا محض متن کی غلطی کی بنا پر ہے)۔ شُملہ نے ۵۴۳ھ/ ۱۱۴۸ء-۵۷۰ھ/ ۱۱۷۴ء حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا غُرس (یا عزّ) الدّولہ تخت نشین ہوا (الرّاوندی، ص ۳۷۷)۔ اس کی وفات (۵۹۰ھ/ ۱۱۹۴ء) پر اس خاندان کی حکومت ختم ہو گئی۔ ان ابتدائی صدیوں میں افشار سے متعلق اس سے زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ اس کی وجہ محض یہ معلوم ہوتی ہے کہ مُصنّفین اکثر ترکمانوں کا ذکر ان کے قبیلے کی تخصیص کیے بغیر مجموعی طور سے کرتے ہیں۔

جیسا کہ بخوبی معلوم ہے اس وقت کا عام دستور یہ تھا کہ ایک خاص علاقہ بطور اِقطاع (تیوُل)، یعنی جاگیر کسی سردار کو عطا کر دیتے تھے، جو اپنے خانوادے کو ساتھ لے جاتا اور اس کا منصب اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا۔ بلاشبہہ یہی طریقِ عمل اِفشار کے معاملے میں بھی اختیار کیا گیا۔ افشار سرداروں کا ذکر آق قویونلو کے عہد حکومت میں آتا ہے (مثلاً (۱) منصور بیگ اوشار (۸۷۷ھ/ ۱۴۷۲-۱۴۷۳ء)، دیکھیے حَسَن رُومْلُو: احسن التواریخ، قلمی، آق قویونلو پر باب؛ دَوّانی: ''عرض نامہ''، در *MIM*، ۵: ۲۹۸ و انگریزی ترجمہ، در *BSOAS*، ۱۹۴۰ء-

۱۹۴۲ء، ص ۱۵۶، ۱۷۴؛ (۲) منصور بیگ، ضلع شیراز (۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸-۱۴۹۹ء و ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۱-۱۵۰۲ء)، دیکھیے وہی مصنّف، طبع Seddon، بڑودہ ۱۹۳۱ء، ص ۲۱ ببعد، ۶۹؛ (۳) پیری بیگ شیراز (۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸-۱۴۹۹ء)، دیکھیے کتاب مذکور، ص ۲۴۔ صفوی خاندان کی حکومت کے قیام میں افشار کا بھی ہاتھ تھا (قبؔ مادّہ‌ہاے قِزِلباش، اسمٰعیل اوّل)۔ صفویوں کی تواریخ میں بلند پایہ افشار منصب داروں کا ذکر اکثر آیا ہے (مثلاً احسن التواریخ، ص ۲۳۶، ۳۳۲، ۳۳۹، ۳۴۵، ۴۳۸؛ اسکندر منشی: تاریخ عالم آراے عباسی، ۱: ۱۵۵، ۱۸۵، ۱۹۰، ۲۵۱، ۳۰۹ ببعد، ۴۰۰ و ۳: ۷۶۳؛ تذکرۃ الملوک، (طبع Minorsky)، ص ۱۶).

صفوی خاندان کے عہدِ حکومت میں افشار کی شاخیں اکثر اضلاع میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے سردار صوبوں کی حکومت پر متمکّن تھے۔ افشار خوانین کوہ گیلُو کے علاقے میں حکم ران تھے۔ اس علاقے کے اکثر قبائلی گُنْدُزْلُو اور اَرَشْلُو برادریوں سے تعلّق رکھتے تھے (دیکھیے تاریخ عالم آراے عباسی، ص ۱۹۹، ۳۴۰-۳۴۴، ۳۵۸ اور مادّۂ لُر)۔ ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۶-۱۵۹۷ء کی بغاوت کے بعد ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ بہت سے خاندان، جو عقوبت سے بچ نکلے، منتشر ہوگئے اور انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک ان میں سے صرف تھوڑے سے لوگ باقی رہ گئے۔

گُنْدُزْلُو اور اَرَشْلُو نے خوزستان میں بہت سے نمایاں کام کیے۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں اضلاع دِزْفُول اور شُشْتَر میں مہدی قلی سلطان اور حیدر سلطان ایسے والی ملتے ہیں جو قبیلۂ افشار سے تھے۔ جب صوبے دار مہدی قلی نے ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹-۱۵۴۰ء میں بغاوت کی تو حیدر قلی افشار کو اس کی تادیب کے لیے مقرّر کیا گیا (احسن التواریخ، ص ۲۹۴ ببعد)، (شُشتر کے افشار والیوں کے لیے دیکھیے مادّۂ شُشْتَر)۔ نادر شاہ کے بعد اس علاقے میں آس پاس کے عرب قبائل کے پیہم حملوں کی وجہ سے افشار کا زور ٹوٹ گیا۔ دبودے (C. A. de Bode) کے قول کے مطابق (*Travels in Luristan and Arabistan*، لنڈن ۱۸۴۵ء) بعض افشار دُورُک سے کَنْگاوَر، اسد آباد اور اُرمیہ میں منتقل کر دیے گئے اور ایک چھوٹی سی جماعت دِزْفُول اور شُشْتَر میں بسا دی گئی۔

کازَرُون [رکؔ بآن] میں افشار والیوں نے تقریباً اڑھائی صدی، یعنی شاہ عباس اوّل [صفوی] کے زمانے سے ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴-۱۸۳۵ء، تک حکومت کی۔ دوسرے علاقوں میں بھی مختلف افشار خانوادوں کے افراد حکومت کرتے رہے، مثلاً اینال لُو یزد، کرمان شاہ، موصل اور رُومیّہ میں اور آلپ لُو، کوسہ احمد لُو اور قِرق لُو خراسان (ابیورد، فراہ، اِسفِیزار) میں۔

افشار اُرمیہ کے نواح میں شاہ عباس اوّل کے عہد میں آباد ہوے تھے (Nikitine کے ترجمہ کردہ متن کی یہ روایت کہ وہ ۸۰۲ھ/ ۱۴۰۰ء میں تیمور کے ساتھ یہاں آئے تھے، بالکل بے بنیاد ہے)۔ عباس اوّل کا نہایت ممتاز اور مشہور سپہ سالار قاسم خان قبیلۂ اِژَن لو [کذا، اینال لُو؟] کا سردار تھا، اور ۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۲-۱۶۲۳ء میں اُرمیہ، سائن قلعہ، اور سُلدُز کے علاقوں میں اپنے قبیلے سمیت بس گیا تھا (تاریخ عالم آراے عباسی، ص ۷۶۳)۔ اس کا بیٹا کلب علی خان ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷-۱۶۲۸ء میں صوبے دار تھا۔ اس کے بعد کئی اَور افشار صوبے دار ہوے۔ خداداد بیگ قاسم لو نے (قاسم لو کا قبیلہ غالباً قاسم خان ہی کے نام پر اپنے کو موسوم کرتا تھا) ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء میں بیگلر بیگ کا لقب اختیار کیا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے B. Nikitine: *Les Avšar d'Urumiyeh*، در *JA*، ۱۹۲۹ء، ص ۷۱ ببعد، اور مادّۂ اُرمیہ؛ قبؔ نیز مادّۂ سائن قلعہ)۔

صفویوں کی جو جنگیں ترکوں اور اُزبکوں سے ہوئیں ان میں افشار نے عام طور پر اہم حصّہ لیا؛ اگرچہ عباس اوّل نے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اپنی عام حکمتِ عملی کے مطابق ہمیشہ قبائل کے رجحاناتِ قبیلہ بندی مٹانے کی کوشش کی۔ نادر شاہ کے عہدِ حکومت میں، جو خود بھی ضلع ابیورد کی قِرق لُو شاخ سے تعلّق رکھتا تھا، افشار امرا ممتاز رہے۔ ان میں سے بعض نے نادر شاہ کی وفات کے بعد کے پُرآشوب دور میں بڑے بڑے کام کیے۔ افشار کے فوجی دستے قاچاری سپاہ کا ایک اہم عنصر تھے۔ ان سے اندرونی بغاوتوں کے استیصال اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے کا کام لیا جاتا تھا۔

یُوانن (Joannin) کے قول (منقولہ در Langles: *Voyages du Chevalier Chardin en Perse*، پیرس ۱۸۱۱ء، ۱۰: ۲۴۳) کے مطابق انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں قبیلۂ افشار کے افراد کی تعداد اٹھاسی ہزار تھی (Ritter نے *Asien*، ۸: ۴۰۰-۴۰۵، میں اسی کا اعادہ کیا ہے)، مگر یہ تعداد ممکن ہے ان کے خیموں کی ہو (اس میں موضع وار تفصیلی اعداد و شمار بھی دیے گئے ہیں)۔ اسی عہد کے لیے قبؔ نیز P. A. Joubert: *Voyages en Arménie et en Perse*، ص ۲۲۵؛ زین العابدین شروانی: بستان السیاحۃ، طبع دوم، ص ۱۰۶ (تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے)۔ عہد حاضر کے لیے دیکھیے مسعود کیہان: جغرافیاے مُفصّل ایران، تہران، ۱۳۱۰-۱۳۱۱ھ ش، ۲: ۸۶ (صوبۂ فارس کے اِینانلُو، اِیلات خمسہ کے جز کے طور پر)، ص ۱۰۶ ببعد، ۱۱۲، ۳۶۳ [اینان لو اور افشار اَرْدَبیل، مِشکِن، زَرَند اور بالخصوص ساوہ اور قزوین کے قرب و جوار میں [قبؔ نیز مادّہ‌ہاے شاہ سِون و خمسہ]، ص ۹۰ (قبیلہ مسمّٰی افشار، کوہ گیلو میں اَکْجیری کے حصّے کے طور پر قبؔ نیز فارس نامۂ ناصری، ۲: ۲۷۰)، ص ۹۲ (ششتر اور دِزفُول کے قریب گُنْدُزْلُو جو بالکل جذب ہوگئے ہیں)، ص ۹۲، ۲۵۳، (افشار در کِرمان)، قبؔ نیز ص ۷۵ اور ۷۱۳ (اُن کا نام جغرافی اور اداری اصطلاحات میں)؛ محمود حسن بہرلُو: آذربیجان، باکو ۱۹۲۱ء، ص ۷۳ (افشار در جمہوریۂ آذربیجان)۔ زمانۂ ماقبل کے لیے قبؔ اِوْلِیاء چِلَبی: سیاحت نامہ، ۲: ۲۵۹، ۸۵۹ و ۴: ۲۸۴، ۳۳۷)؛ G. Jarring: *On the distribution of Turk tribes in Afghanistan*، لُنْد ۱۹۳۹ء، ص ۶۱ (بعض افشار جنھیں عباس اوّل نے (اَنْدُخوی میں) بسایا اور بعض دوسرے جنھیں نادر شاہ نے آباد کیا)۔ جس طرح بعض افشار عناصر دوسرے قبائل کے ساتھ منسلک کر دیے گئے تھے (جیسا کہ اوپر بیان

ہوا) اسی طرح ہم بعض افشار کنبے ایسے بھی دیکھتے ہیں جن کے ناموں سے اندازہ کرتے ہوے کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں وہ اَور قبیلوں کا جز رہے ہوں گے، مثلاً اُرمیہ میں شاملو اور جلائر (جن کا ذکر Nikitine نے کیا ہے)، جو غالباً انھیں ناموں کے بڑے قبائل سے الگ ہوگئے تھے۔ یہی بات تکہ لُو (Takelü) اور اِمیر لُو پر بھی صادق آتی ہے (O. Mann: *Das Mujmil et-Tārikh-i-ba'd Nādirije*، ص ۳۱).

افشاران ترکمانوں میں بھی ملتے تھے جو مملوک عہد میں شام، بالخصوص حلب، کے نواح میں آباد تھے (دیکھیے مثلاً القَلْقَشَنْدِی: صبح الأعشٰی؛ ابن تغری بردی (طبع Popper)، ۶: ۲۲۵، ۳۶۴، ۳۸۶، ۵۵۷)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے قرہ مان اوغلو [رک بآں] کی ریاست کے قیام میں حصّہ لیا تھا؛ (دیکھیے Cl. Cahan، در *Byzantion*، ۱۹۳۹ء، ص ۱۳۳)۔ عثمانی عہد میں بھی افشار کی متعدّد شاخوں کا ذکر ملتا ہے (مثلاً رَجَب اوغلو قلعۂ جَعْبَر کے آس پاس، دیکھیے حاجی خلیفہ: جہان نُما، ص ۵۹۳؛ دستاویزوں میں: رجب لو اَوْ شاری، دیکھیے (۔رفیق: اَنَدلود تُرک عشیر تلری، استانبول ۱۹۳۰ء، ص ۱۴۵، ۱۶۵-۱۷۶، ۱۸۶، ۲۰۹، ۲۳۹)؛ قَرہ اَوشار، قرہ گُنْدُز لُو اَوْ شاری، بَہرلی اوشاری، دیکھیے کتاب مذکور، ص ۱۰۲، ۱۰۶)۔ یہ قبائل، جو یَکی [یَنی] اِیل کے مجموعی نام سے بھی معروف تھے، موسمِ سرما شام میں اور موسمِ گرما اناطولیہ میں زَمَنْتی (Zamanti) کے آس پاس بسر کرتے تھے۔ حکومت برابر انھیں بسانے کی کوشش کرتی رہی (اِسپُرْتہ کے قریب اوشار کے دیہات، دیکھیے جہان نما، ص ۶۴۰؛ نیز اناطولیہ میں دوسرے دیہات جنھیں اوشار کہتے تھے)۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں درویش پاشا نے چقوراووہ [ولایت آطنہ میں ایک جزیرہ] میں افشار قبائل کے خلاف فوجی اقدام کرکے جبراً انھیں [ولایتِ حلب میں] گورکسون کے قریب اور قیصری اور دوسرے دیہات میں آباد کر دیا (*TTEM*، ۸: ۳۴۸ اور سلسلۂ مذکورہ کا عمومی اشاریہ)۔ چقوراووہ، مَرْعَش (قب Besim Atalay: مَرْعَش تاریخی، استانبول، ۱۳۴۰ء، ص ۷۰، ببعد) اور اناطولیہ میں اِچِل (Ičel) اور قیصری اور شام میں الرَّقّہ کے گرد و نواح میں (علی رِضا یُلمَن: جنوب دہ ترکمان اویماقلری، آطنہ ۱۹۳۹ء، ۲: ۱۰۵ ببعد) بعض خانہ بدوش قبیلے ابھی تک موجود ہیں.

مآخذ: (۱) (آ، ت، بذیلِ مادّہ Avşar (از محمد فؤاد کوپرولو)؛ (۲) احمد آقا تبریزی، در آینده، جلد ۴ و ۵، نیز حصّہ دوم و ہشتم، تہران ۱۹۲۶-۱۹۲۸ء؛ (۳) وہی مصنّف: تاریخ پانصد سالۂ خوزستان، تہران ۱۳۱۲ھ؛ (۴) F. W. Hasluck: *Christianity and Islam under the Sultans*، بمد اشاریہ؛ (۵) مِنُورسکی (V. Minorsky): *Ajnallu / Inallu, Rocznik Orie-ntalistyczny*، ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء، ص ۱ ببعد.

(محمد فؤاد کوپرولو)

---

* **اَفْشِین:** اُشْرُوسَنہ کے مقامی امرا و رؤسا کا لقب، جو اسلام سے پیشتر انھوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جو سمرقند اور خجند کے درمیان واقع ہے اور دریاے زرفشان کا بالائی مجرا بھی اس میں شامل ہے، (بارٹولڈ (Barthold): *Turkistan*، طبع دوم، ص ۱۶۵-۱۶۹)۔ اُس صوبے کو ایک فوجی مُہم کے ذریعے، جس کی قیادت الفضل بن یحییٰ اَلْبَرمَکی نے کی تھی (۱۷۸ھ/ ۷۹۴-۷۹۵ء)، خراسان کے عرب گورنروں کی تحویل میں دیا گیا، لیکن داخلی کشمکش کے بعد ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء میں احمد بن ابی خالد کے زیرِ قیادت ایک اَور مہم بھیجی گئی۔ پھر حکمران اَفشین کاؤس نے اسلام قبول کر لیا۔ کاؤس کے بعد اس کا بیٹا خَیذَار مسند نشین ہوا (عربی تذکروں میں عموماً اسے خَیذَر لکھا گیا ہے)، جو اسلامی تاریخ میں عام طور پر اَلْاَفْشِین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی جانب لوگوں کی توجہ سب سے پہلے المأمون کے عہد میں منعطف ہوئی، وہ اس طرح کہ جن دنوں المأمون کا بھائی ابواسحٰق المعتصم برائے نام مصر کا گورنر تھا، الافشین کو بَرْقَہ (Cyrenaica) کا نظم و نسق تفویض ہُوا اَور اس نے دریاے نیل کے ڈیلٹا میں قبطیوں اور عربوں کی بغاوت بڑی مستعدی سے فرو کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ المعتصم کے جس دستۂ فوج کو ''المغاربہ'' کہتے تھے — اور اس میں ڈیلٹا نیز صحراے غربی کے عرب بھرتی کیے گئے تھے — وہ الافشین ہی کی سعی سے مرتّب ہوا تھا.

المعتصم کے عہد (۲۱۸ھ/ ۸۳۳ء-۲۲۷ھ-۸۴۱ء) میں اَلْاَفْشِین کا سب سے اہم کارنامہ وہ مسلسل اور پامَردانہ جنگ ہے جو اس نے آذربیجان میں خُرَّمی باغیوں کے خلاف ۲۲۰ھ/ ۸۳۵ء سے ۲۲۲ھ/ ۸۳۷ء تک جاری رکھی، جن کی قیادت بابک [رک بآں] کر رہا تھا۔ اس کامیابی کے صلے میں خلیفہ نے اسے ایک تاج، دو مرصّع تلواریں اور آذربیجان و آرمینیہ کے علاوہ سندھ کی حکومت عطا کی۔ عموریہ (Amorium) کی مشہور مہم میں بھی، جس کی قیادت ۲۲۳ھ/ ۸۳۸ء میں خود المعتصم نے کی تھی، الاَفْشین نے نمایاں حصّہ لیا۔ آگے چل کر عبداللہ بن طاہر سے رقابت بروے کار آئی (ماوراء النہر کا اہم ترین رئیس ہونے کے باعث الافشین اپنے وطن پر نو دولت طاہریوں کا اقتدار ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا)؛ چنانچہ اس نے در پردہ اَلْمازِیار (محمد بن قارِن) ''اسپہباذ'' (سپہبد، یعنی رئیس و سالار) طبرستان کو بغاوت پر اکسایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود اسے بھی مازیار کی شکست کا خمیازہ بھگتنا پڑا، اس پر دین سے برگشتہ ہو جانے کا الزام عائد ہوا اَور ایک مشہور مقدّمے کے بعد سامرّا کے قید خانے میں اسے فاقوں سے ہلاک کر دیا گیا (شعبان ۲۲۶ھ/ مئی-جون ۸۴۱ء).

وسط ایشیا کے بعض دوسرے امرا اور وسا کا لقب بھی افشین تھا؛ بقول الیعقوبی (۲: ۳۴۴) جب سمرقند کے امیر غُورک نے قُتَیبہ بن مُسلم سے معاہدۂ صلح کیا تو اپنے نام کے ساتھ ''اِخْشِیذِ سُغْد وافْشِینِ سَمَرْقَنْد'' لکھا تھا؛ قب نیز B. Spuler: *Iran in früh islamischer Zeit*، ص ۳۵۷، حاشیہ ۱۴.

مآخذ: (۱) الطبری، ۳: ۱۱۰۵، ۱۱۷۱-۱۳۱۸ و مواضع کثیرہ؛ ترجمۂ زوٹنبرگ (Zotenberg)، ۴: ۵۲۵-۵۴۵؛ ترجمۂ E. Marin: *The Reign of al-Mu'tasim*، نیویارک ۱۹۵۱ء؛ (۲) البلاذری، ص ۴۳۰ ببعد؛ (۳) الکِندی، ص ۱۸۹-

۱۹۳؛ (۴) البَیہقی (طبع Morley)، ص ۱۹۹ ببعد؛ (۵) الیعقوبی: تاریخ، ۲: ۵۷۷-۵۸۴ (مطبوعۂ نجف ۱۳۵۸ھ، ۳: ۱۹۹-۲۰۳)؛ (۶) الیعقوبی: بُلدان، ص ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۹۳؛ (۷) ابوتمّام: دیوان، ص ۱۰۷، ۲۶۲، ۳۲۶ ببعد؛ (۸) بارٹولڈ (Barthold): *Turkestan*، طبع دوم، ص ۲۱۰-۲۱۱؛ (۹) Browne: ۱: ۳۳۰ ببعد؛ (۱۰) E. Herzfeld: *Gesch. der Stadt Samarra*، برلن ۱۹۴۸ء، ص ۱۰۱، ۱۳۸-۱۵۲.

(بارٹولڈ W. BARTHOLD و گِب H. A. R. GIBB)

---

* **الاَفضل بن بَدر الجَمالی:** ابوالقاسم شاہنشاہ، فاطمی وزیر، جو تاریخ میں عموماً وزارتی لقب سے معروف ہے۔ اس کی پیدائش ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء کے قریب بتائی جاتی ہے اور ۴۸۲ھ/۱۰۸۹ء کے ایک کتبے سے پتا چلتا ہے کہ [خود وزیر ہونے سے پہلے] وہ اپنے والد کی وزارت میں شریک کار تھا۔ بدر کی وفات پر سن رسیدہ خلیفہ المستنصر (۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء-۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) فوجی دباؤ کے زیر اثر الاَفضل کو وزیر اعظم بنانے پر مجبور ہوا۔ چند ماہ بعد وہ فوت ہو گیا۔ خلیفہ المُستَعلی کی مسند نشینی نے بالواسطہ اثرات و نتائج کے باعث انتہائی اہمیت حاصل کر لی۔ المستنصر خاصا بوڑھا ہو چکا تھا، مگر زندہ ہی تھا کہ اس کی جانشینی کا مسئلہ موضوع بحث بن گیا تھا۔ ایران کے اسمٰعیلی مبلّغ حسن بن الصبّاح نے اپنی طرف سے خلیفہ کے بیٹوں میں سے نِزار کے حق میں فیصلہ کر لیا، لیکن الاَفضل نے وزیر کی حیثیت سے المستنصر کے ایک چھوٹے بیٹے احمد کو تخت پر بٹھا دیا، جسے المُستَعلی کا لقب دیا گیا۔ محروم الارث نِزار فوج فراہم کرنے کے ارادے سے اسکندریہ بھاگ گیا، مگر اسے گرفتار کر کے ایک زمین دوز قید خانے میں ڈال دیا گیا؛ تاہم بعض لوگوں کو یقین تھا وہ قید سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ حسن بن الصبّاح نے اُسے امام [برحق] تسلیم کر لیا، اور زبردست فرقۂ حشیشیین کی بنا ڈالی۔ مسکوکات پر کچھ عرصے تک نِزار کا نام نقش ہوتا رہا اور مصری حامیانِ نزار ''نِزاری'' کہلانے لگے۔ الاَفضل ان نتائج کی پیش بینی نہ کر سکا۔ اس کی روش ذاتی جاہ طلبی پر مبنی تھی، اسی لیے اس نے ایک نوعمر شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا، جو اس کی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور تھا۔

بدر الجمالی نے [اپنے عہدِ وزارت میں] مصر کو تباہی سے بچا لیا تھا اور ساتھ ہی ایک آمرانہ حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اب الاَفضل نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر خلیفہ المُستَعلی کو، جس کی عمر تخت نشینی کے وقت بیس برس کے لگ بھگ تھی، قصر شاہی میں نظر بند کر دیا۔ المُستَعلی نے آٹھ برس سے کچھ کم عرصے تک حکومت کی (۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء-۴۹۵ھ/۱۱۰۱ء)۔ بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ ممکن ہے خلیفہ کو نزاریوں نے زہر دے دیا ہو۔ اس کے بعد الاَفضل نے المستعلی کے ایک پانچ سالہ بیٹے کو الآمر باحکام اللہ کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا اور اس مختار مطلق وزیر کی حکومت کسی مداخلت کے بغیر جاری رہی، لیکن خلیفہ جوان ہوا تو وزیر کے شکنجے سے نکلنے کے لیے بے تابی کا اظہار کرنے لگا۔ آخر اس نے چند حشیشی فدائیوں کی خدمات حاصل کر لیں اور انھوں نے ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء میں اسے وزیر کے چنگل سے نجات دلوا دی۔ الاَفضل ستائیس برس تک وزیر اعظم رہا اور اس تمام عرصے میں مملکت کے اندر ایسا امن و امان تھا جو سالہائے مابعد کی انتہائی بدنظمی کے پیش نظر اَور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

الاَفضل کی آمرانہ حیثیت سامنے رکھی جائے تو مصریوں پر یہ ذمّے داری عائد کرنا بالکل حق بہ جانب ہے کہ انھوں نے فلسطین پر صلیبیوں کے حملے کے وقت غفلت و بے اعتنائی سے کام لیا۔ اگر ہم یہ حقیقت پیش نظر رکھیں کہ حدودِ مصر سے باہر فاطمی حکومت کس قدر غیر ہر دلعزیز تھی تو اسے ایک حد تک قابلِ معافی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس حکومت نے بعض اقدامات یقیناً کیے، مثلاً چند قلعوں کی مرمّت و تجدید کی (کم از کم ۴۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں بندرگاہ صیدا کی تجدید کے متعلق ہمارے پاس کتباتی شہادت موجود ہے)؛ ایک سال پہلے فاطمی فوج ایک غدّار والی سے [بندرگاہ] صُور (Tyre) چھین چکی تھی؛ اور آخر ۴۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں یروشلم کو ان اُرتقی عُمّال سے جو وہاں جمے ہوئے تھے بزور چھین لیا گیا۔ مصری اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ صلیبیوں کا نصب العین فتح بیت المقدس تھا اور یہ امر قرینِ یقین نہیں کہ انھوں نے یروشلم کو فرنگیوں (Franks) کے حوالے کر دینے کے لیے فتح کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ جب صلیبی انطاکیہ کے سامنے خیمہ زن تھے تو ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ء میں مصری سفرا وہاں گئے تھے اور صلیبیوں نے بھی اپنے سفرا قاہرہ بھیجے تھے۔ ممکن ہے یہ آمد و رفت کسی معاہدے کے سلسلے میں ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شام کے شمالی حصّے پر سُنّی سلاطین کی حکومت تھی اور فاطمی ان سے الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ سلجوقیوں کو بھی ان کی مداخلت ہرگز گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ واضح اور غیر مبہم دستاویزیں موجود نہ ہونے کے باعث ہم صرف مفروضات ہی پیش کر سکتے ہیں۔

بہرصورت مصری فوجوں کی بے عملی یا کم از کم غیر مستعدی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے یروشلم کی حفاظت کے لیے قطعاً قدم نہ اٹھایا، جس کا سقوط بری طرح محسوس کیا گیا اور الاَفضل ایک فوج لے کر عَسقلان کے شمال میں ایک مقام پر پہنچ گیا، لیکن وہاں اس نے فوج سے کوئی کام نہ لیا اور ان کمکی دستوں کا راستہ دیکھتا رہا جن کی آمد سمندر کی راہ سے متوقع تھی؛ نیز اس بات کا منتظر رہا کہ فلسطین سے بدوی دستے جمع ہو لیں۔ [نتیجہ یہ ہوا کہ] فرنگیوں نے خود جارحانہ اقدام کر کے مصری فوج موت کے گھاٹ اتار دی۔ الاَفضل نے بھاگ کر عسقلان میں پناہ لی پھر بعُجلت تمام قاہرہ لوٹ گیا۔ ۴۹۴ھ/۱۱۰۱ء میں فلسطین پر فرنگی مسلّط ہو گئے اور وہاں کے باشندوں نے مصر میں پناہ لی۔ بعد کے برسوں میں وزیر صلیبیوں کے مقابلے پر کسی حد تک برسرِکار رہا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی مہمّیں شاذ و نادر ہی حوالیِ عسقلان سے آگے بڑھیں۔ قیدیوں اور مالِ غنیمت کے سوا اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شام کی بڑی بڑی بندرگاہیں اس وقت ان اربابِ اختیار کے ہاتھوں میں تھیں جو وقتی مصلحت کے مطابق سنّی یا شیعہ پرچم لہراتے رہتے تھے۔ زیادہ اہمّ حملوں میں سے ایک کی قیادت الاَفضل کے ایک بیٹے نے کی اَور رملہ لے لینے

میں کامیاب ہُوا۔ ۴۹۷ھ/ ۱۱۰۳ء میں عکّہ ہاتھ سے نکل گیا، کیونکہ اس کے فاطمی حاکم نے کمک نہ ملنے پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ طرابلس [الشام] کے خودمختار حکمران کی شدید مزاحمت نے الأفضل کو اس امر پر آمادہ کیا کہ بحری بیڑے سے چند جہاز ادھر روانہ کرے، لیکن یہ جہاز دیر سے پہنچے۔ ۵۱۲ھ/ ۱۱۱۸ء میں فرنگی خطرہ دوچند ہوگیا، جب شہر فَرَما نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس واقعے نے شاہ یروشلم بالڈوِن اوّل (Baldwin I) کی اتفاقیہ موت کے باعث بہت شہرت حاصل کر لی؛ وہی صلیبی مہم کی قیادت کر رہا تھا۔ گو اس غم انگیز دور میں مسلمان سلاطین ایک دوسرے کو بے حد شبہہ کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، تاہم الأفضل نے دمشق کے بُوریوں سے تعاون کی استدعا کی اور اسے حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ عیش و تجمل کے ان سامانوں کو دیکھ کر دل پر بہت برا اثر پڑتا ہے جن میں خلیفہ الآمر اور اس کا وزیر محصور تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے زیادہ شہر فرنگیوں کے قبضے میں جاتے رہتے تھے اتنے ہی زور شور سے دعوتوں اور جشنوں کا اہتمام ہوتا رہتا تھا۔ اس غفلت و بے اعتنائی کی جتنی بھی ذمّہ داری حکومتِ مصر پر عائد ہوتی ہے اس میں خلیفہ کا کوئی حصّہ نہیں، کیونکہ وہ تو محض بچہ تھا، بلکہ وہ پوری کی پوری مختارِ کل وزیر کے سر ہے، جو سبک سرانہ بے حسی کا خوگر تھا۔ بدر کی بنائی ہوئی عمارتوں — جن میں سے صرف قاہرہ کی فصیل اور اس کے عظیم الشان دروازوں ہی کا ذکر یہاں کافی ہے — اور ان عمارتوں میں جو اس کے بیٹے الأفضل نے بنائیں نمایاں تضاد ہے۔ مؤخّر الذکر کے پیشِ نظر محض ذاتی آسائش تھی اور اسی لیے اس نے قاہرہ اور فُسطاط میں متعدّد تفریحی کوشک بنوائے۔ اس کے انتقال پر خلیفہ الآمر نے اس کی املاک ضبط کر لیں؛ قیمتی اشیا، جواہرات اور ریشمین پارچہ جات ہی کو منتقل کرنے میں پورے دو مہینے صرف ہوے۔ جہاں تک اس کی زندگی کے روشن پہلو کا تعلق ہے، مورّخین لکھتے ہیں کہ اس نے مالیات مصر کی تنظیم از سرِ نو کی، جس سے سلطنت کی آمدنی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

الأفضل کے بیٹے الملقّب بہ کُتَیْفات کے لیے دیکھیے اگلا مقالہ۔

مآخذ: (۱) ابن المُیَسَّر (طبع Massé)، ص ۳۰-۴۳، ۵۶-۶۰؛ (۲) ابن الأثیر، بمدد اشاریہ؛ (۳) ابن الصّیرَفی: الْإشارة الی من نال الوزارة، قاہرہ ۱۹۲۴ء، ص ۵۷-۶۱؛ (۴) ابن القَلانِسی: ذیلِ تاریخ دمشق (طبع Amedroz)، ص ۱۲۸-۲۰۴، ومواضع کثیرہ؛ (۵) ابن تَغْرِی بِرْدی (طبع Popper)، ج ۲ (مطبوعۂ قاہرہ، ۵: ۱۴۲-۲۲۲)؛ (۶) ابن خلِّکان، عدد ۲۸۵؛ (۷) المَقْریزی، خِطط، ۱: ۳۵۶ ببعد، ۴۲۳ و ۲: ۲۹۰؛ (۸) S. LanePoole: *History of Mediaeval Egypt*، ص ۱۶۱ ببعد؛ (۹) G. Wiet: *Histoire de la Nation Égyptienne*، ۴: ۲۵۵-۲۶۷؛ (۱۰) وہی مصنّف: *Matériaux pour un Corpus Insc. Arab.*، ج ۲ (*MIFAO*، ج ۵۲) (اس میں ایک بہت مفصّل فہرست مآخذ دی گئی ہے)؛ (۱۱) *History of the Crusades*، فلاڈلفیا ۱۹۵۵ء، ۱: ۹۵-۹۷۔

(G. WEIT)

الأفضل، ابوعلی احمد: مُلقّب بہ کُتَیْفات، وزیر الأفضل کا بیٹا۔ خلیفہ الآمر کے انتقال (۱۲ ذوالقعدہ ۵۲۴ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۱۳۰ء) پر زمامِ حکومت مرحوم خلیفہ کے دو مُقرّبوں ہَزار مَرْد اور بَرْغَش کے ہاتھ آ گئی، جنھوں نے خلیفہ الآمر کے ایک عم زاد بھائی عبدالمجید کو عارضی طور پر متولّیِ حکومت بنا دیا۔ چار روز بعد فوج نے کُتَیْفات کو (جس نے الأفضل کا لقب اختیار کر لیا تھا) مسندِ وزارت پر بٹھا دیا۔ کچھ عرصہ بعد وزیر نے ایک اعلان کے ذریعے سے فاطمی حکمرانی برطرف کر دی اور سلطنت پر اثنا عشری شیعوں کے اِمامِ مُنتظَر کی سیادت قبول کر لی؛ عبدالمجید کو عُہدے سے ہٹا کر محبُوس کر دیا گیا اور کتیفات نے ایک آمرِ مُطلق کی حیثیّت سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ہمارے پاس ۵۲۵ھ کے ایسے سِکّے موجود ہیں جن پر امام محمد ابوالقاسم المنتظر لِاَمر اللہ کا نام مضروب ہے؛ کچھ سِکّے ۵۲۶ھ کے ہیں، جن پر الاِمام المَہْدی القائم بِاَمْرِ اللّٰہِ حُجَّۃُ اللّٰہِ عَلَی الْعَالَمِیْن کی عبارت کندہ ہے۔ ان میں وزیر کو زیادہ اہمیّت دی گئی ہے، کیونکہ ان پر ''الأفضل ابوعلی احمد نائبہ وخلیفتہ'' بھی لکھا ہے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ''اسمٰعیلیت'' مذہبِ سلطنت نہیں رہی، تاہم وزیر نے اس مذہب کو خلافِ قانون قرار نہ دیا، بلکہ اس سے کچھ رعایت ہی برتی؛ چنانچہ اس کے دارُالقُضاۃ میں حنفی و شافعی اور امامی قاضیوں کے ساتھ ایک اسمٰعیلی قاضی بھی بیٹھا کرتا تھا۔ اسمٰعیلی عناصر کے لیے یہ امر ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ ایک ایسے فرقے کے افراد شمار ہوں جن کا مذہب سرکاری حیثیت کھو چکا تھا؛ چنانچہ کُتَیْفات کو، جب وہ گھوڑے پر سوار شہر سے باہر جا رہا تھا، قتل کر دیا گیا اور عبدالمجید کو محبس سے نکال لیا گیا (۱۶ محرّم ۵۲۶ھ/ ۸ دسمبر ۱۱۳۱ء)۔ اس واقعے کا سالانہ جشن فاطمی خاندان کے اختتام تک منایا جاتا رہا (المقریزی: خِطط، ۱: ۳۵۷، ۴۹۰)۔ کچھ دنوں تک عبدالمجید نے نائب سلطنت کی حیثیت سے حکومت کی، لیکن مختصر سے وقفے کے بعد الحافِظ لِدین اللہ کے لقب سے اس کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) ابن المُیَسَّر (طبع Massé)، ص ۷۴-۷۵؛ (۲) رُوحی (مخطوطۂ اوکسفرڈ، عدد ۸۶۵)، مقالہ ''الحافظ''؛ (۳) ابن الأثیر، ص ۵۲۴، ۵۲۶ [مطبوعۂ مصر ۱۳۰ھ، ۱۰: ۲۸۶ ببعد]؛ (۴) ابن تَغْری بِرْدی (طبع Popper)، ۲: ۳۲۸-۳۲۹ و ۳: ۱ ببعد (مطبوعۂ قاہرہ، ۵: ۲۳۷-۲۴۰)؛ (۵) G. Wiet: *Matériaux pour un Corpus Insc. Arab.*، ج ۲ (*MIFAO*، ج ۵۲، ۱۹۳۰ء): ص ۸۵ ببعد؛ (۶) S. M. Stern: *The Succession to the Fatimid Imam al-Āmir*، Oriens ۱۹۵۱ء، ص ۱۹۳ ببعد (مکمّل مسکوکاتی حوالوں کے ساتھ)۔

(S. M. STERN سٹِرن)

الأفضل: رسولی حکمران، رکّ بہ رسولیّہ۔

الأفضل بن صلاح الدین: پورا نام الملک الأفضل ابوالحسن علی نور الدین، صلاح الدین [رکّ بآن] کا سب سے بڑا بیٹا؛ ولادت: ۵۶۵ھ/

۱۱۶۹-۱۱۷۰ء اور انتقال: ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء، بمقام سُمَیساط۔ صلاح الدّین کی وفات پر اسے دمشق کا حکمران اور ایوبی خاندان کا رئیس تسلیم کرلیا گیا، لیکن اپنی نااہلی اور خودکامی کے باعث وہ یکے بعد دیگرے دمشق، مصر اور تمام شامی جاگیریں کھو بیٹھا؛ آخر میں روم کے سلجوقی سلطان کا باج گزار ہوکر رہ گیا؛ دیکھیے مادّۂ ایُّوبیہ۔

مآخذ: (۱) ابن خلّکان، عدد ۴۵۹؛ (۲) ابوشامہ: ذیل الرّوضتین، ص ۱۴۵؛ (۳) ابن تَغرِی بردی: النُّجوم، ج ۶، بمدِ اشاریہ؛ (۴) المَقْرِیزی: سلوک، ج ۱، بمدِ اشاریہ۔

(گِب H. A. R. GIBB)

---

* **اَفْطار:** رک بہ صوم۔

---

* **الأفْطَس، بنو:** پانچویں صدی ہجری/ گیارھویں صدی عیسوی میں ہسپانوی مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا شاہی خاندان، جس نے اندلس کے دَورِ ملوک الطوائف میں جزیرہ نمائے آئی بیریا کے مغربی حصّے میں ایک وسیع علاقے پر حکمرانی کی اور جس کا دارالحکومت بطلیوس (بادایوز Badajoz) تھا۔

خلافتِ قرطبہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے پر اندلس کے زیریں سرحدی علاقے (الثغر الادنٰی)، جو وادی آنا (Guadiana) کے وسطی اور موجودہ پرتگال کے مرکزی حصّے پر مشتمل تھے، الحکم ثانی کے ایک آزادشدہ غلام سابُور کے قبضے میں آگئے، جس نے وقت کے اسلامی ہسپانوی دستور کے مطابق حاجب کا لقب اختیار کر لیا۔ سابور نے، جس کی لوحِ مزار محفوظ ہے اور جو ۱۰ شعبان ۴۱۳ھ/ ۸ نومبر ۱۰۲۲ء کو فوت ہوا، بربری اصل کے ایک ادیب اور عالم عبداللہ بن محمد بن مَسْلَمہ المعروف بہ ابن الأفطس کو وزیر مقرر کیا۔ یہ شخص مِکْناسہ کی جمعیت کا ایک فرد تھا، جو قرطبہ کے شمال میں فحص البلُّوط کے علاقے میں آباد تھی۔ سابور کی وفات پر (جس کے دو نابالغ بچے تھے) عبداللہ بن محمد مذکور نے مسندِ اقتدار کے غصب میں قطعًا تأمّل نہ کیا اور بطلیوس میں خاندان افطسیہ کی بنیاد رکھ دی، جسے بعض اوقات بنومَسلَمہ بھی کہتے ہیں۔

عبداللہ نے المنصور کا اعزازی لقب اختیار کیا اور اپنی وفات تک حکمران رہا، جو محفوظ لوحِ مزار کے مطابق، بطلیوس میں ۱۹ جمادی الاُخرٰی ۴۳۷ھ/ ۳۰ دسمبر ۱۰۴۵ء کو واقع ہوئی۔ اس کے عہدِ حکومت کے تفصیلی حالات بہت کم معلوم ہیں، جو بظاہر شروع میں پرامن اور مملکت کے لیے باعث برکت تھا، لیکن بعد میں فتنہ وفساد شروع ہوگیا۔ وجہ یہ تھی کہ جلد ہی اس کے تعلّقات اپنے ہمسائے، یعنی محمد ابن عبّاد [رک بہ بنوعبّاد]، حاکم اشبیلیّہ سے خراب ہوگئے، بلکہ ایک دفعہ ابن عبّاد نے المنصور کو بہ مقام باجہ (Beja) گرفتار کر کے کچھ عرصے قید بھی رکھا تھا۔

عبداللہ کی وفات پر اس کا بیٹا محمد جانشین ہوا، جو زیادہ تر المظفّر کے لقب سے معروف ہے۔ مؤرّخین بالاتّفاق اس کی گہری علمیت اور اعلٰی ادبی ذوق کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر شعرا میں سے کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا، کیونکہ اس کی رائے میں وہ ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے تھے جسے المُتنبّی اور المعرّی کے کلام سے دُور کی بھی نسبت ہو۔ اس سے ایک ضخیم کتاب کی تالیف منسوب ہے؛ یہ منتخب اشعار کی ایک بیاض پچاس جلدوں پر مشتمل تھی، جس کا نام المظفّری تھا۔ چونکہ اس کے حوالے شاذ ہی ملتے ہیں، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ یہ کتاب اندلس میں بھی عام طور پر مشہور نہ تھی۔

المظفّر کا بیس سالہ عہدِ حکومت سیاسی زاویۂ نگاہ سے بدرجۂ غایت پُرآشوب تھا اور پورے کا پورا المعتضد شاہِ اشبیلیہ کے خلاف مسلسل، لیکن بے نتیجہ، جدوجہد میں گزرا۔ اگرچہ قرطبہ کے امیر ابن جَہْور [رک بہ مادّۂ جَہْوَریہ] نے ثالثی کے ذریعے جھگڑا طے کرانے کی بہت کوشش کی، مگر معاندانہ کارروائیاں برابر جاری رہیں، جن کی وجہ سے سلطنت بطلیوس بہت کمزور ہوگئی اور قشتالیہ (Castile) و لیون (Léon) کے مسیحی بادشاہ فرڈیننڈ اوّل کو حوصلہ ہوا کہ وہ حملہ کر کے حکمران کو ادائے خراج پر مجبور کر دے۔ اس طرح ۴۴۹ھ/ ۱۰۵۷ء میں مملکت افطسیّہ کی شمالی سرحد کے دو قلعے بیزو یا بازو (Vizeu) اور لمیقیہ (Lamego) مسیحی بادشاہ کے قبضے میں چلے گئے۔ ۴۵۶ھ/ ۱۰۶۳ء میں اس نے شہر قُلُمریہ (Colmbra) نیز دریائے دویرہ (Douro، Duero) اور دریائے مندیق (Mondego) کا پورا درمیانی علاقہ سر کرلیا اور یہ فتح اندلس کی مسیحی بازیافت (Reconquista) کے مراحل میں ایک فیصلہ کن مرحلہ تھی۔

المظفّر اپنی مملکت کی اس افسوس ناک قطع و برید کے بعد زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔ وفات پر اس کا بیٹا یحیٰی المنصور تخت نشین ہوا، لیکن اس کا بھائی عمر، جو بیورہ (Evora) کا والی تھا، اس کے مقابلے پر آ گیا اور یحیٰی جلد ہی نظروں سے غائب ہوگیا۔ عمر بھی، جس نے المتوکّل کا لقب اختیار کیا، اپنے وقت کے دوسرے ملوک الطوائف کی طرح مسیحی بادشاہ الفانسو ششم کے روز افزوں مطالبات کی زد میں آ گیا، جس نے ۴۷۱ھ/ ۱۰۷۹ء میں اس سے قوریہ (Coria) کا قلعہ چھین لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے (اور طلیطلہ پر الفانسو ششم کے قبضہ جمانے سے قبل ہی) المرابطون سے اندلس میں مداخلت کی التجا کی تھی، لیکن بالآخر اپنے دوسرے ہمسایوں کی طرح وہ بھی مسیحی بادشاہ کے جارحانہ اقدامات کا مقابلہ نہ کرسکا اور خراج کے بارے میں اس کے مطالبات کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگیا۔ ۴۷۲ھ/ ۱۰۸۰ء میں اس نے طلیطلہ کے باشندوں کی پیشکش پر اس مملکت کو اپنی مملکت کے ساتھ ملانا چاہا؛ اگرچہ وہ بنوذوالنّون کے دارالحکومت میں دس ماہ قیام پذیر رہا، مگر اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ الزَّلّاقہ [رک بآں] کی جنگ میں بذاتِ خود موجود تھا، جو ۱۲ رجب ۴۷۹ھ/ ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء کو اسی کی مملکت میں لڑی گئی اور ان سازشوں میں شامل تھا جن کے باعث بالآخر المرابطون نے یہ فیصلہ کیا کہ الاندلس کے جملہ ملوک الطوائف کو برطرف کر کے ان کی مملکتیں اپنی سلطنت میں شامل کرلی جائیں۔ عمر المتوکّل اپنی امارت کے لیے خطرہ محسوس کر کے

الفانسو ششم کو شَنْتَرین (Santaren)، لشبونہ (Lisbon) اور شِنْتَرہ (Cintra) دے کر امداد کا طلب گار ہوا، لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ المرابطی سالار سِیر ابن ابی بکر نے ۴۸۷ھ/ ۱۰۹۵ء کے اواخر میں وہاں کے باشندوں کی چشم پوشی سے، جو اپنے بادشاہ کے مالی مطالبات سے بہت تنگ آ گئے تھے، بطلیوس کو سر کر لیا۔ المتوکّل اور اس کے دو بیٹے الفیل اور سَعْد اسیر ہوے۔ اُنھیں اشبیلیہ بھیجا گیا، لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیے گئے۔ المتوکّل کا ایک اَور بیٹا المنصور جان بچا کر بھاگ گیا؛ کچھ عرصہ وہ قاصرش (Cáceres) کے موجودہ صوبے کے حصار منتانْجش (Montanchez) میں قلعہ بند رہا، بالآخر اپنے ساتھیوں کو لے کر الفانسو ششم کی مملکت میں چلا گیا، جہاں اسے مسیحی بنا لیا گیا۔

مآخذ: ملوک الطوائف کے دَور کی جملہ تواریخ، بالخصوص (۱) ابن حیّان، جس کا اقتباس ابن بَسّام نے ذخیرۃ میں دیا ہے؛ (۲) ابن العذاری: بیان، ج ۳، بمد اشاریہ؛ (۳) ابن الخطیب: اَعمال الاعلام، (طبع لیوی پرووِنسال Levi-Provencal)، ص ۲۱۱-۲۱۵؛ (۴) عبداللہ بن بُلُگِین [رک بآں] کی خودنوشت سرگزشت، جس میں المتوکّل کے عہدِ حکومت کے حالات مرقوم ہیں، سب سے زیادہ مفصّل اور قابل وثوق ماخذ ہے؛ (۵) Hoogvliet: *Specimen e litt. orient... d regia Aphta-sidarum familia*، لائڈن ۱۸۳۹ء، اب پرانی ہو چکی ہے؛ نیز دیکھیے (۶) ڈوزی (R. Dozy): *Hist. Mus. Esp.*، طبع ثانی، ج ۳، بمد اشاریہ؛ (۷) A. Prieto و Vives: *Los reyes de taifas*، میڈرڈ ۱۹۲۶ء، ص ۶۵-۶۸؛ (۸) R. Menendez Pidal: *La España del Cid*، میڈرڈ ۱۹۴۷ء، بمد اشاریہ؛ (۹) لیوی پرووِنسال (E. Lévi-Provençal): *Inscriptions arabes d'Espagne*، ص ۵۳-۵۵؛ (۱۰) وہی مصنّف: *Islam d'Occident*، ص ۱۲۵-۱۲۶؛ (۱۱) وہی مصنّف: *Hist. Esp. mus.*، ج ۴ (زیر تالیف)۔

(E. LEVI-PROVENÇAL لیوی پرووِنسال)

---

* **اَفْعال:** رک بہ فِعْل۔

---

* **اَفْعٰی:** اس سے مراد نہ صرف زہریلا سانپ (viper) [یا adder] ہے — جیسا کہ عام طور پر فرض کیا جاتا ہے — بلکہ اسی قسم کے دوسرے سانپ بھی (نولدیکہ (Nöldeke)، در Wiedmann، ص ۲۷۱)؛ تاہم علم حیوانات کی عربی کتابوں میں جو خصوصیات درج ہیں (کوڑیالا یا چتلا، چکلا سر، پتلی گردن چھوٹی دُم، بعض کے دو سینگ [قب کتاب الحیوان (۴:۵۹)]: و ذات القرنین من الافاعی صمّاء لا تسمع صوت الدّاعی؛ یہ سینگ آنکھوں کے اوپر دوا بھری ہوئی ہڈیاں ہوتی ہیں] وغیرہ، وہ بڑے سانپوں کی بعض مخصوص اقسام کے مناسب حال ہیں (echis carinatus، echis coloratus، aspis، cerastes)۔ اکثر مآخذ میں ہے کہ افعٰی مادّہ سانپ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور نر سانپ کو ''اُفْعُوان'' کہتے ہیں، لیکن پہلی اصطلاح ہمیشہ اسم جنس کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ عبرانی اور حبشی زبانوں میں افعٰی کے نام کی جو شکلیں پائی جاتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ سامی زبانوں کے قدیم ترین الفاظ میں سے ہے۔

افعٰی عربی ادب میں قدیم شاعری، امثال اور حدیث سے ان متأخّر کتابوں تک میں پایا جاتا ہے جن میں علم حیوانات اور فرداً فرداً حیوانات سے باقاعدہ بحث کی گئی ہے۔ قدیم شاعری میں اس کا ذکر جانی دشمن کی رمز و علامت کے طور پر آیا ہے، یعنی ایسا دشمن جو قتل کا انتقام لینے کے درپے ہو۔ اس کی ضرر رسانی اس مثل سے ظاہر کی گئی ہے کہ ''افعٰی کا کاٹا رسی ہاتھ میں لینے سے ڈرتا ہے'' [من لدغه الافعٰی خاف من الحبل]۔ الجاحِظ نے اس کے بارے میں بہت سی معلومات مہیّا کی ہیں۔ افعٰی ایک اچھا تجارتی مال بھی تھا، کیونکہ اس کے زہر سے تریاق (theriac) بناتے تھے۔ بعض لوگوں نے اس کی تجارت کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا اور اسے زیادہ تر سجستان سے درآمد کرتے تھے۔ الجاحظ کے زمانے میں تیس افعٰی دو دینار میں بکتے تھے۔ افعٰی کو کچھ بدوی لوگ کھاتے بھی تھے؛ چنانچہ بعض شعرا نے ان کی اس عادت کی طرف طنزًا اشارہ کیا ہے [دیکھیے الدمیری: حیاۃ الحیوان، ۱:۵۷، مصر ۱۳۳۰ھ، جہاں ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ بدویوں کے ہاں مہمان رہا اور افعٰی کا گوشت کھا کر اس نے مرض استسقاء سے نجات پائی]۔

افعٰی کے بارے میں بہت سی معلومات افسانوی حیثیت کی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ ایک ہزار سال تک زندہ رہتا ہے، جب اندھا ہو جاتا ہے تو سوئے کے پودے (رازیانج) پر اپنی آنکھیں مل کر ازسرِنو بینائی حاصل کر لیتا ہے [یا یہ کہ وہ زمرد کو دیکھ کر اندھا ہو جاتا ہے؛ غالب:

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعٰی نہ ہوا

خود میرزا غالب ایک مکتوب (موسومہ صاحب عالم مارہروی) میں زمرّد سے افعٰی کے اندھا ہو جانے یا چاندنی میں کتان کے پھٹ جانے کو منجملۂ مضامین شِعری بناتے ہیں]۔

صحیح بیانات میں سے ایک یہ ہے کہ افعٰی، اپنی جنس کی زیادہ تر انواع کے برخلاف [انڈے نہیں بلکہ] بچے دینے والا جاندار ہے [قب تاہم کتاب الحیوان (۴:۳۹) میں ہے: ''وھی تلد و تبیض و ذلک انّھا اذا طُرِقَتْ بیضھا تحطم فی جوفھا فتومی بفراخھا اولادًا حتی کأنّھا من الحیوان الذی یلد حیوانًا مثلہ'' گویا افعٰی کے انڈے بھی ہوتے ہیں اور بچے بھی۔ الجاحظ نے اس سانپ کی ایک اَور خصوصیّت یہ بیان کی ہے کہ شیر، چیتے اور بلّی کی طرح اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں کی یہ صفت زائل نہیں ہوتی، وہی کتاب، ۴:۴۰]۔

مآخذ: (۱) ابوحیان التوحیدی: الإمتاع، ۱:۱۶۰، ۱۷۴، ۱۹۲؛ (۲) اَلدَّمِیری: [حیاۃ الحیوان]، بذیلِ مادّہ (ترجمہ از Jayakar، ۱:۵۶-۵۸) [عربی متن، مطبوعۂ مصر، ۱:۴۸-۵۷]؛ (۳) الجاحظ: الحیوان، طبع ثانی، بمد اشاریہ؛ (۴) ابن الاثیر: نہایۃ، ۱:۴۴؛ (۵) ابن البَیْطار: الجامع، بُولاق ۱۲۹۱ھ، ۱:۴۶-۴۸؛ (۶) ابن

قُتَیْبَہ: عیون الأخبار، قاہرہ ۱۹۲۵-۱۹۳۰ء، ۲:۹۷، ۹۶، ۹۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۴، (ترجمہ از Kopf، ص ۵۴، ۷۲، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۸۰)؛ (۷) القزوینی (طبع وسٹنفلڈ)، ۱:۴۲۸-۴۲۹؛ (۸) ابن سِیْدَہ: المخصَص، ۸:۱۰۷-۱۰۸؛ (۹) A. Malouf: *Arabic Zool.-Dict.*، قاہرہ ۱۹۳۲ء، بمد داشاریہ؛ (۱۰) النُّوَیْری: نہایۃ الأرب، ۱۰:۱۳۳ ببعد؛ (۱۱) E. Wiedemann: *Beitr. z. Gesch. d. Natu-rwiss.*، ۵۳:۲۴۹-۲۵۰.

(L. KOPF)

---

* **افغان**: (۱) قوم، (۲) پشتو زبان، (۳) پشتو ادب:

(۱) قوم: مختلف افغان قبائل نسلاً ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ B. S. Guha (*Census of India*، ۱۹۳۱ء، ج ۱، حصّہ ۳ الف، ص xi) کے بیان کے مطابق باجوڑ کے پٹھان چترال کے کلَشوں سے بہت قریبی رشتہ رکھتے ہیں، غالباً اس لیے کہ وہ افغانوں کے رنگ میں رنگے ہوے دَرّد ہیں۔ دوسری طرف بلوچستان کے چوڑے سر والے پٹھان اپنے بلوچ ہمسایوں سے ملتے جلتے ہیں۔ پشاور اور ڈیرہ جات کے میدانی علاقے میں کسی قدر ہندی خون کی آمیزش ہے اور بعض قبائل میں ترک۔مغول اثر کی علامتیں پائی جاتی ہیں، لیکن عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ افغان بحیرۂ روم کی لمبوتری کھوپری والی نسل کی ایرانی۔افغانی شاخ سے تعلّق رکھتے ہیں۔ کُون (Coon: *Races of Europe*، ص ۴۱۹) کے بیان کے مطابق افغانوں کا کاسۂ سر ۷۲-۷۵ والی فہرست میں ہے، اور اوسط قامت ۱۷۰ سنٹی میٹر (سرحدِ پاکستان کے پٹھانوں میں) اور ۱۶۳ سنٹی میٹر (افغانستان کے افغانوں میں)۔ ناک کھڑی اور اکثر خم دار ہوتی ہے، جو عموماً سامیوں سے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ اس قسم کی ناک بلوچوں اور کشمیریوں وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ افغانوں کے بال عام طور پر سیاہ ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان میں مستقل طور پر ایک اقلیّت بھورے یا سنہرے بالوں والی بھی چلی آتی ہے اور اس سے اُن میں شمالی نارڈی (Nordic) خون کی آمیزش ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی داڑھیاں گھنی ہوتی ہیں (Coon، ص ۴۶۱).

بعض اوقات افغان اور پٹھان کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ افغان کی اصطلاح درّانیوں اور ان سے متعلقہ قبائل کے لیے استعمال کی جاتی ہے، لیکن یہ فرق غالباً محض نام کا ہے، یعنی ایرانی نام افغان (جس کا اشتقاق معلوم نہیں) قدرتی طور پر مغربی قبائل کے لیے استعمال ہوتا ہے اور پٹھان کا اطلاق، جو مقامی نام کی بدلی ہوئی ہندی شکل ہے، مشرقی قبائل پر کیا جاتا ہے۔

دیسی نام، جسے سب قبائل استعمال کرتے ہیں، پَشْتُون یا پِشْتون ہے (شمال مشرقی بولی میں پَخْتُون)، جس کی جمع ''پَیْشْتانہ'' ہے۔ لاسن (Lassen) نے اور اس کے تتبع میں بعض اَور لوگوں نے لفظ پَشْتُون کا موازنہ ہیروڈوٹس کے پکتویس Παπύται سے کیا ہے، اور اَفریدیوں کے نام کو اپاروتایی Παχτυες سمجھا ہے۔ یہ مؤخّر الذّکر شناخت ممکن ہے صحیح ہو، اگرچہ یقینی نہیں؛ مگر مقدّم الذّکر کو صوتی اور دیگر وجوہ کی بنا پر ردّ کر دینا لازم ہے (آخری جز ''اُون'' ''آنہ'' سے مشتق ہے اور یہ ممکن نہیں کہ زمانۂ قدیم کا صوتی مرکب، جس کے نتیجے میں پشتو کا ''شت'' (بعد کی بولی میں خت) معرضِ وجود میں آیا، یونانی حروف τ χ سے ادا کیا گیا ہو)۔ زیادہ قرین قیاس وہ بات ہے جو سب سے پہلے مارکوارٹ (Marquart) نے کہی تھی کہ اس نام کا تعلق بطلیموس (Ptolemy) کے Παρσυῆται سے ہے، یعنی ایک قبیلہ، جو پاروفامیسس (Paropamisus) [کوہ بابا و سفید کوہ] میں آباد تھا۔ پشتو کا ''شت'' زمانۂ قدیم کے ''رس'' سے مشتق ہو سکتا ہے (دیکھیے Morgenstierne: "*Pathan*"، "*Pashtū*"، در *AO*، ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۸ ببعد) اور غالباً نام کی قدیم شکل پَرْسُوانہ (Parswāna) تھی، جو پرسو (Parsu) سے مشتق تھا، قب آشوری۔بابلی پرسوا (Parsu (a)، یعنی فارسی؛ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان دو زیرِ بحث ایرانی قبیلوں کے درمیان کوئی خاص طور پر قریبی رشتہ تھا (قب نیز پُشت، پُخت ــــ وزیریوں کے علاقوں میں افغانوں کے مفروضہ وطن کا نام) ــــ افغانوں کی زبان کا دیسی نام پَشْتو (پَخْتو) کا تعلق غالباً ایک صفت مونث پرسوا (Parsuwá) (بمعنی غالب زبان) سے ہے۔

لوگر کے اُرْمُڑ افغانوں کو کاش اور کانی گرام کے اڑمڑ وزیریوں کو کسی (صیغۂ جمع) کہتے ہیں۔ اس لفظ کا ماخذ معلوم نہیں، لیکن یہ کوئٹے کے قریب بسنے والے ایک افغان قبیلے موسوم بہ کاسی (Masson: *Travels*، ۱:۳۳۰) اور کوہستانِ سلیمان کے پشتو نام ''(د) کاسہ غَر'' سے تعلّق رکھتا ہے۔

لفظ پشتو افغانوں کے خاص ضابطۂ معاشرت ''پشتون ولی'' وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس ضابطے کے اہمّ ارکان حسب ذیل ہیں: (۱) تَنْوَاتے: پناہ لینے کا حق؛ (۲) بَدَل: بدلے کے ذریعے انتقام؛ (۳) میلْمَستیَا: مہمان نوازی۔ جو جھگڑے ''بدل'' (انتقام) کا باعث بنتے ہیں زر، زن اور زمین ان کی اصل بتائے جاتے ہیں۔ اکثر قبائل کی تنظیم جمہوری ہے اور موروثی خان کو محدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ زیادہ اہمّ امور قبیلے کی شاخوں اور خیلوں کے سرداروں کے باہمی مشورے سے طے کیے جاتے ہیں اور قبیلے یا گاؤں کی مجلس (جرگہ) کو بہت اہمیّت حاصل ہوتی ہے.... افغان اور غیر افغان موالی (ہمسائے) زیادہ تر قبائل سے وابستہ ہیں، انھیں کی پناہ میں رہتے ہیں اور انھیں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ زمین کو وقتاً فوقتاً از سرِ نو تقسیم کرنے کا پرانا رواج (وِیش) اب اکثر مقامات پر مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ افغان قبائل اگرچہ سیاسی لحاظ سے غیر متّحد اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے، تاہم انھیں ایک قسم کے اتحاد کا احساس تھا، جو ان کی زبان، رسم و رواج اور روایات کے اشتراک پر مبنی تھا۔ دوسری جانب ہر قبیلہ شاخوں، خاندانوں اور کُنبوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان شاخوں کے نام اکثر لفظ خیل سے بنتے ہیں یا لاحقۂ زئی سے، لیکن بعض صورتوں میں زئی سے مراد پورا قبیلہ ہوتا ہے۔

افغانوں کا ذکر پہلی مرتبہ ہندی ہیئت دان وَراہمِہِرَہ (چھٹی صدی عیسوی کے اوائل) کی کتاب بُرْہَت سَمْہِتہ (*Bṛhat-Saṃhita*) میں (اَوگانہ کی

شکل میں) آیا ہے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد، غالباً چینی سیّاح ہیوان سانگ (Hiuen-Tsang) کے سوانح حیات میں، جس قوم ایپوکین (A-P'o- Kien) (اَوگَن؟) کا ذکر ملتا ہے اور جو کوہستان سلیمان کے شمالی حصّے میں آباد تھی اس سے بھی غالباً افغان ہی مراد ہیں (دیکھیے A. Foucher: *La vieille route de l' Inde de Bactres à Taxila*، پیرس ۱۹۴۷ء، ۲: ۲۳۵، ۲۵۲ حاشیہ ۱۷)۔ ابتدائی دَور کے مسلمان مصنفوں کی کتابوں میں سے افغانوں کا ذکر سب سے پہلے حدود العالم (۳۷۲ھ/ ۹۸۲ء) میں ملتا ہے۔ اس کے بعد العُتبی (تاریخ یمینی) اور البیرونی نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ لفظ پٹھان سولھویں صدی عیسوی سے پہلے کی کسی کتاب میں نظر نہیں آتا، لیکن ''شت'' کی تبدیلی ''ٹھ'' سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ [پٹھان] ہندی آریائی زبان میں اس سے بہت پہلے لے لیا گیا ہوگا۔ العُتبی (قاہرہ ۱۲۸۶ھ، ۲: ۸۴) کے بیان کے مطابق محمود غزنوی نے طُخارستان پر ایک لشکر لے کر چڑھائی کی، جو ہندی، خَلج، افغان اور غزنوی سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ ایک اَور وقت میں اس نے افغانوں پر حملہ کر کے انھیں سزا دی۔ البَیہقی، جس نے اپنی کتاب اس سے تھوڑا عرصہ بعد لکھی، مذکورۂ بالا بیان کی تائید کرتا ہے۔ البیرونی افغانوں کے بہت سے قبیلوں کا ذکر کرتا ہے، جو ہندوستان کی مغربی سرحد کے پہاڑوں میں بود و باش رکھتے تھے (الہند، ترجمہ زخاؤ (Sachau)، ۱: ۲۰۸، قب ۱۹۹)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں کا اوّلین معلوم وطن کوہستان سلیمان تھا۔ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ افغان مغربی جانب کس حد تک پھیلے، لیکن ابتدائی دَور کے مصنّفوں نے غزنی کے مغرب میں افغانوں کی کسی بستی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات فرض کرنے کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں کہ غور کے باشندے شروع میں پشتو بولتے تھے (قب Dames، در (آ)، طبع اوّل)۔ اگر ہم پٹھ خزانہ کے بیان پر اعتبار کریں (دیکھیے نیچے (۳)) تو شَنَسَب (آٹھویں صدی عیسوی) کا پوتا، افسانوی امیر کَرُوڑ، پشتو کا شاعر تھا؛ لیکن یہ بات متعدّد وجوہ کی بنا پر بہت غیر اغلب ہے۔ سب سے دُور کے مغربی افغان قبیلے دُرّانی (ابدالی) [رک بآں] کی اصل اور اس کی ابتدائی تاریخ پردۂ خفا میں ہے۔ غلزئیوں [رک بآں] کے بارے میں بظاہر ممکن ہے کہ ان کا نام ترکی قبائلی نام خَلَجی — خلج کے ایک عام پسند اشتقاق (''چور کا بیٹا'') — پر مبنی ہے۔ خلج کی جائے وقوع الإصْطَخری نے دریائے ہلمند کے وسطی طاس اور حدود العالم نے غزنی کے علاقے میں بیان کی ہے [رک بہ مادّۂ خَلج]، لیکن خود غلزئیوں میں سے بعض بلکہ شاید بیشتر لوگ افغانی الاصل ہو سکتے ہیں۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں نے غزنویوں کے دَور میں سیاسی اعتبار سے کوئی اہمّ مقام حاصل نہ کیا۔ چند قدیم اشارے، جن کا ذکر آگے آئے گا، لانگ ورتھ ڈیمز (M. Longworth Dames) نے کیے ہیں (در (آ)، طبع اوّل) اور ان پر ہارڈی (P. Hardy) نے اضافہ کیا ہے۔ ۴۳۱ھ/ ۱۰۳۹-۱۰۴۰ء میں مسعود [غزنوی] نے اپنے بیٹے اِیزَد یار کو غزنی کے کوہستانی علاقے میں باغی افغانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا (گَردِیزی، طبع محمد ناظم، ص ۱۰۹)۔ ۵۱۲ھ/ ۱۱۱۸-۱۱۱۹ء میں آرسلان شاہ [غزنوی] نے ایک لشکر فراہم کیا، جو عربوں، عجمیوں، افغانوں اور خلج پر مشتمل تھا۔ اَلْفِی میں مذکور ہے کہ ۵۴۷ھ/ ۱۱۵۲-۱۱۵۳ء میں بہرام شاہ نے افغانوں اور خلجیوں کا ایک لشکر جمع کیا۔ غوریوں کے برسر اقتدار آنے پر بھی یہی صورتِ حال قائم رہی۔ فرشتہ (بمبئی ۱۸۳۱ء، ص ۱۰۰ ببعد) کا بیان ہے کہ مُعزّ الدّین محمد بن سام کا لشکر ترکوں، تاجیکوں اور افغانوں پر مشتمل تھا اور اس کے ہندی مدِّ مقابل پتھورائے (پرتھوی راج) نے راجپوت اور افغان سواروں کا لشکر اکٹھا کیا۔ گویا ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس جنگِ عظیم میں افغانوں کے نمائندے دونوں طرف سے لڑتے دکھائے گئے ہیں، جس سے غالباً مترشّح ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان سب نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، اگرچہ بعض روایات موضوعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ قوم [حضرت] خالدؓ [بن الولید] ہی کے زمانے میں مسلمان ہو گئی تھی۔ یہ بات واضح نہیں کہ فرشتہ نے اپنا بیان کہاں سے اخذ کیا ہے۔ منہاج السراج کی طبقات ناصری میں اس جنگ کا جو بیان ہے اس میں یہ مذکور نہیں، [بلکہ واقعہ یہ ہے کہ] یہ مصنف غزنوی اور غوری بادشاہوں کے حالات میں افغانوں کا ذکر کسی جگہ بھی نہیں کرتا۔ اس نے اس قوم کا ذکر صرف ایک ہی مرتبہ اپنے زمانے، یعنی ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء میں دہلی کے بادشاہ ناصر الدّین محمود کے عہدِ حکومت میں کیا ہے، جہاں وہ لکھتا ہے (ترجمۂ Raverty، ص ۸۵۲) کہ اُلُغ خان نے راجپوتانے میں میوات کے پہاڑی قبائل کی سرکوبی کے لیے تین ہزار بہادر افغان استعمال کیے۔ جُوَینی (۱: ۱۴۲) کے بیان کے مطابق خلج، غزنوی اور افغان، مغلوں کی فوج کا حصّہ تھے، جس نے ۶۱۹ھ میں مَرو کو تاراج کیا تھا۔ بعد کی دو صدیوں کے اندر ہندوستان کی تاریخ میں کبھی کبھی افغانوں کا ذکر آ جاتا ہے، مثلاً برنی تاریخ فیروز شاهی، ص ۵۷، میں لکھتا ہے کہ بَلبَن نے ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء میں گوپال پور کے آس پاس چھوٹے چھوٹے قلعے بنوائے اور ان کی حفاظت کا کام افغانوں کے سپرد کر دیا۔ تین اَور قصبے بھی ڈاکوؤں کے حملوں کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ ان کی حفاظت بھی ایسے قلعوں کے ذریعے کی جاتی تھی جو افغانوں کے زیرِ نگرانی تھے [امیر خسرو نے بھی اپنی ایک مثنوی میں ایسے قلعہ نشین افغانوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی وضع قطع اور بول چال کی کیفیت مزاحیہ انداز میں بیان کی ہے (دیوان تحفة الصغر)، دیکھیے محمد وحید مرزا: *Life and Works of Amīr Khusrau*، طبع ثانی، ص ۵۱ ببعد]۔ یہی مصنّف (ص ۴۸۲) لکھتا ہے کہ محمد بن تُغلَق کے عہد میں افغانوں کی ایک جماعت نے ملتان مَل (یہ نام ملتانی زبان میں محافظِ ملتان کے معنی میں آتا ہے اور غالباً کسی افغان سردار کا نام نہیں تھا) کے زیرِ قیادت ملتان میں عَلَم بغاوت بلند کیا تھا۔ سرہندی (تاریخ مبارک شاهی، کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۶) میں لکھتا ہے کہ یہ بغاوت ۷۴۴ھ/ ۱۳۴۳ء میں رونما ہوئی تھی۔ پھر غیر ملکی امرا میں ایک مُخ افغان کا ذکر آیا ہے، جس نے دیوگیر میں بغاوت کی۔ ۷۷۸ھ/ ۱۳۷۶-۱۳۷۷ء میں بہار کی جاگیر ملک بِیر افغان کو عطا ہوئی (تاریخ مبارک شاهی، ص ۱۳۳)۔ امیر تیمور نے انھیں بدستور پہاڑی راہزن ہی پایا؛ چنانچہ ملفوظات تیموری، ظفر نامہ، اور مطلع السعدین میں مذکور ہے کہ اس نے اوغانی (یا اُغانی) کے وطن کو (جو کوہستانِ سلیمان میں رہتے تھے)

تاراج کیا۔ اس طرح یہ لوگ — چند قسمت آزما سپہ گروں کو مستثنیٰ کرتے ہوے — عموماً کوہستانی لُٹیروں کی تند خُو نسل بنے رہے، یہاں تک کہ ایک طالع آزما نے ہندوستان میں اقتدار حاصل کر کے انھیں (افغانوں کو) درجۂ شہرت عام پر پہنچا دیا۔ یہ دولت خان لودھی تھا، جو غلزئیوں کی شاخ لودھی سے متعلق تھا۔ وہ ترقی کرتے کرتے سلطنت ہند کی اہم شخصیتوں میں شامل ہو گیا۔ بہلول لودھی نے ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۰ء [کذا، ۱۴۵۱ء] میں تخت دہلی پر قبضہ جما لیا [رک بہ مادّہ لودھی]۔ بابر نے ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۵ء میں اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، لیکن شیر شاہ سوری نے مختصر سے وقت (۹۴۴ھ/ ۱۵۳۷ء - ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۵ء) کے لیے افغانوں کو پھر تختِ حکومت پر بٹھا دیا [رک بہ مادّہ سُور]۔ اس عہد میں غلزئیوں اور دوسرے پٹھانوں کی بھاری تعداد ہندوستان میں آباد ہو گئی۔ بعد کے ایک دور میں اورنگ زیب نے مختلف قبائل کے پٹھانوں کو روہیل کھنڈ [رک بآں] (قسمت بریلی وغیرہ) میں جاگیریں عطا کیں (نیز دیکھیے مادۂ رام پور)۔ روہیل کھنڈ کا نام پشتو کے لفظ "روہیلہ" سے مشتق ہے، جس کے معنی "کوہستانی" اور "پٹھان" کے ہیں۔ جب Darmesteter نے ۱۸۸۶ء میں رام پور کی سیاحت کی تو اس وقت بھی نوّاب رام پور کے دربار میں بعض افغان روایات باقی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ ہند میں آباد ہونے والے پٹھان، یہاں آبادی میں گھل مل گئے، صرف انتہاے شمال مغرب کے پٹھان مستثنیٰ ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کے اواخر میں افغان قبائل نے اِدھر اُدھر پھیلنا شروع کیا۔ ہندوستان میں ان کی آمد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس پھیلاؤ کا پیمانہ اتنا وسیع تھا کہ Dames (آ طبع اوّل) کا قول — افغان غوریوں کے عہدِ حکومت تک بھی غیر اہمّ پہاڑی لوگ تھے، جو ایک محدود علاقے میں رہتے تھے — تسلیم کرنا مشکل ہے۔ سلیمان خیل غلزئیوں نے لوہانیوں کو کوہستان غزنی سے نکال دیا اور پندرھویں صدی عیسوی میں بٹنیوں کو درۂ گُومَل کے راستے مشرق کی طرف دھکیل دیا۔ اس سے سو دو سو سال پہلے خٹک [رک بآں] اور بنگش پٹھانوں نے کوہاٹ کے علاقے میں اپنے موجودہ اوطان کی طرف نقل و حرکت شروع کی تھی اور روایت کے مطابق یوسف زئی اور ان کے حلیف قبائل بارھویں صدی عیسوی میں تَرْنَک اور اَرْغَسان کے علاقے چھوڑ کر کابل چلے گئے تھے۔ بعد ازاں چودھویں صدی عیسوی کے دَوران میں انھیں کابل سے نکال دیا گیا اور وہ پشاور کے میدانی علاقوں میں آ گئے، جہاں سے انھوں نے دِلاَزاک کو پیچھے دھکیل دیا، جو عجب نہیں افغانوں کی کسی قدیم تر ہجرت کے نمائندے ہوں۔ پھر وہ پشاور کے شمالی پہاڑوں کی وادیوں میں جا گھسے (قب یوسف زئی)۔ ان کے پیچھے پندرھویں صدی عیسوی کے شروع میں غوریہ خیل (مہمند وغیرہ) آئے اور بعض قبائل دریاے سندھ عبور کر کے پنجاب میں جا پہنچے۔

مغلوں کے اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر سرحدی افغان قبائل کو مجتمع کرنے کی پہلی کوشش سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں جنگجو شاعر خوش حال خان خٹک نے شروع کی، لیکن افغانوں کی پہلی قومی سلطنت غلزئی سردار میرَ وَیس کی سرکردگی میں اور زیادہ مستقل طور پر احمد شاہ درّانی کے زیرِ قیادت اٹھارھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی (رک بہ مادّۂ افغانستان، حصۂ تاریخ)۔

افغانوں کی قبائلی روایات کے موٹے موٹے خدوخال ابوالفضل (اکبر نامہ) نے بیان کیے ہیں۔ سلیمان ماکو: تذکرۃ الاولیاء (تیرھویں صدی عیسوی کی تالیف) اور پٹھ خزانہ (ان کے لیے قب مقالۂ ہٰذا، شمارہ ۳) میں اس سے کسی قدر مختلف بیانات درج ہیں۔ قبائلی روایات کے متعلق ہمارا اہمّ ماخذ نعمت اللہ کی مخزن افغانی ہے، جو ۱۶۱۳ء میں مکمّل ہوئی۔ اس کتاب میں جو نسب نامے دیے گئے ہیں اور وہ بعد کی تصانیف، مثلاً حیات افغانی وغیرہ، میں نقل ہوے تاریخی مآخذ کے طور پر قابلِ اعتماد نہیں؛ تاہم ان روایتوں کی شہادت کے سلسلے میں جو سترھویں صدی عیسوی میں افغانوں میں مشہور تھیں قابلِ قدر ہیں۔ ان روایات کے مطابق بیشتر افغانوں کا مشترک مورثِ اعلیٰ قیس عبدالرشید تھا، جو [حضرت] خالد[رض] [بن ولید] کے ہاتھ پر مشرّف بہ اسلام ہوا اور جو بادشاہ طالُوت یا ساؤل (Saul) کے ایک پوتے افغانہ کی نسل سے تھا۔ اس قیس کے تین بیٹے تھے: سَرْ بَن، بَٹَن (یا بِٹَن) اور غُرْغُشت۔ پھر سَرْ بن کے ہاں دو بیٹے ہوے: شَرْخُبُون اور خَرْشَبُوْن۔ بعد کی شاخوں کی جدول یوں بنائی جا سکتی ہے:

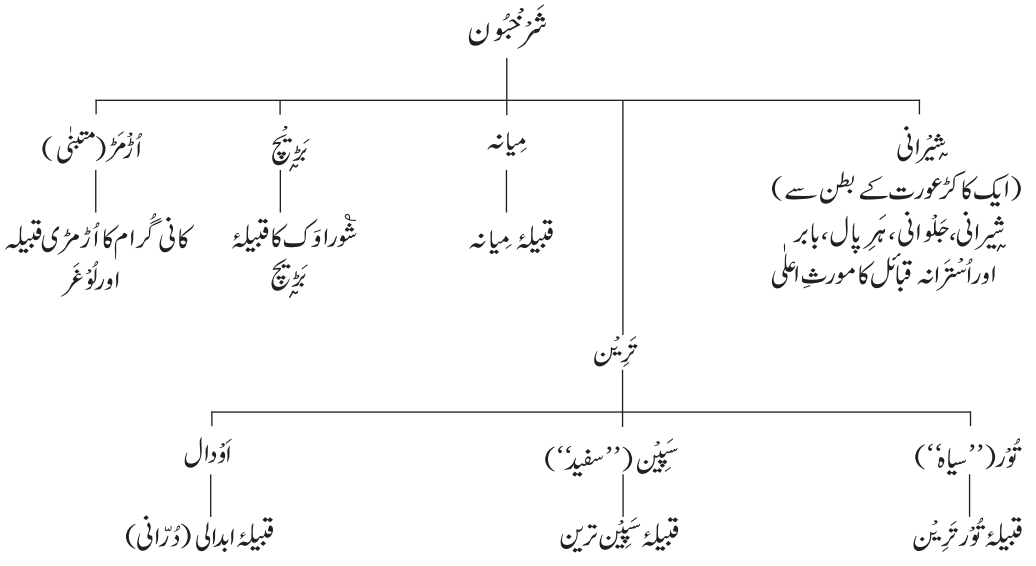

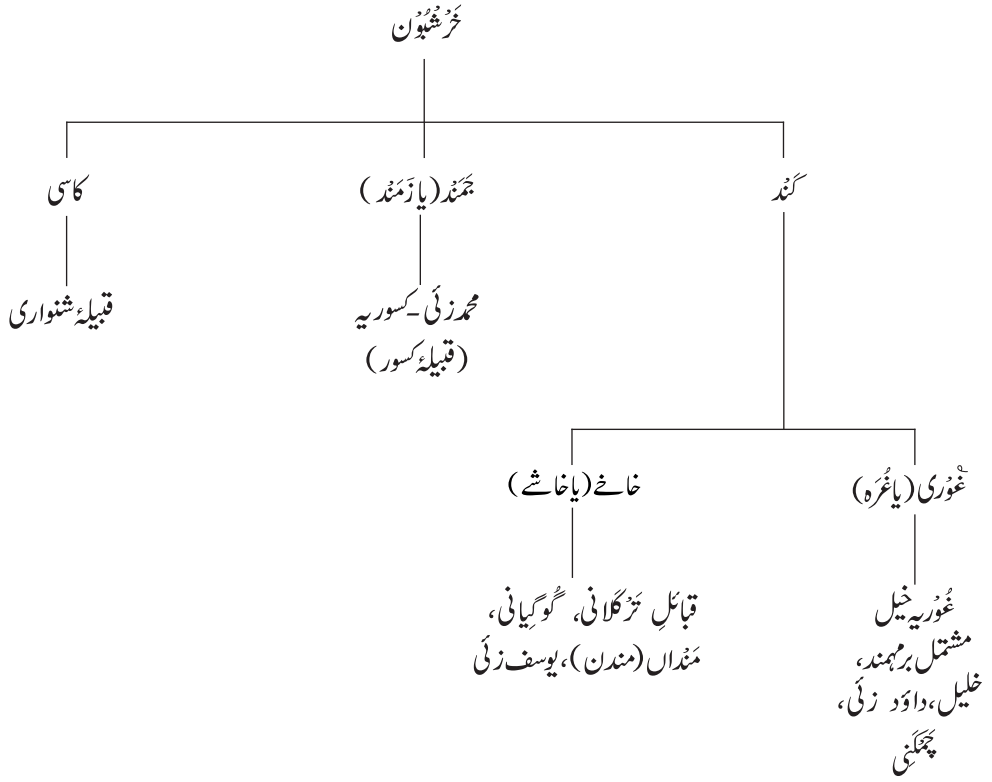
خَرْشُبُوْن
کَنْد
جَمَنْد (یا زَمَنْد)
کاسی
محمد زئی۔کسوریہ
(قبیلۂ کسور)
قبیلۂ شنواری
غُوْری (یا غُرَہ)
خاخے (یا خاشے)
غُوْریہ خیل
مشتمل بر مہمند،
خلیل، داؤد زئی،
چَمْکَنی
قبائلِ تَرْکَلانی، گُوگِیانی،
مَنْداں (مندن)، یوسف زئی

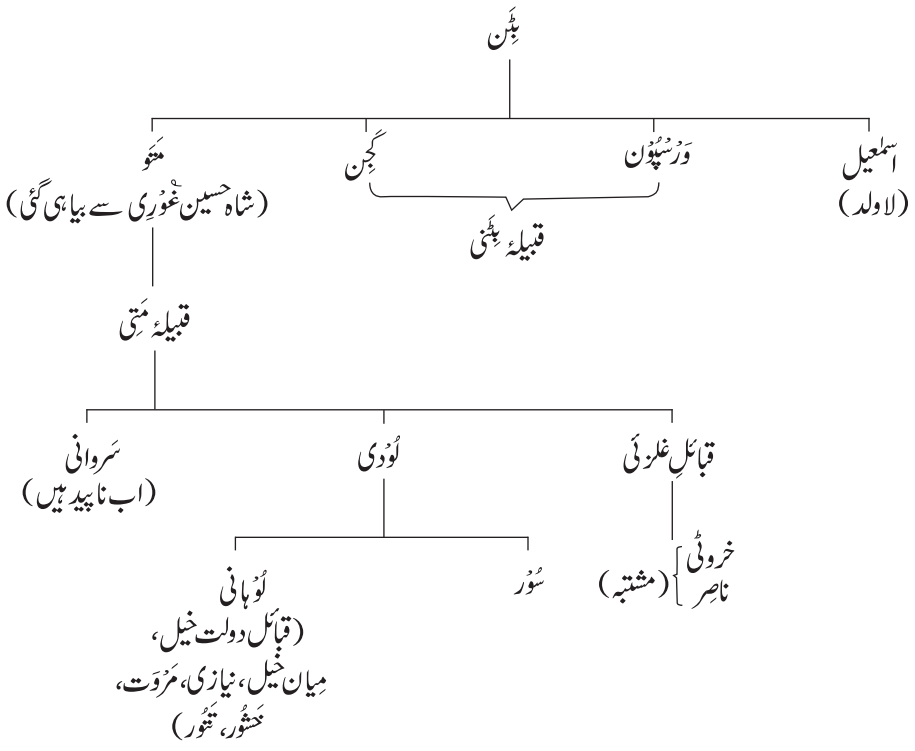
بِٹَن
اسمٰعیل
(لاولد)
وَرْسُپُوْن
گَجِن
مَتَو
(شاہ حسین غُوْرِی سے بیاہی گئی)
قبیلۂ بِٹَنی
قبیلۂ مَتِی
قبائلِ غلزئی
لُوْدی
سَروانی
(اب ناپید ہیں)
خروٹی
ناصِر
(مشتبہ)
سُوْر
لُوْہانی
(قبائل دولت خیل،
مِیان خیل، نیازی، مَرْوَت،
خَشُور، تَتُور)

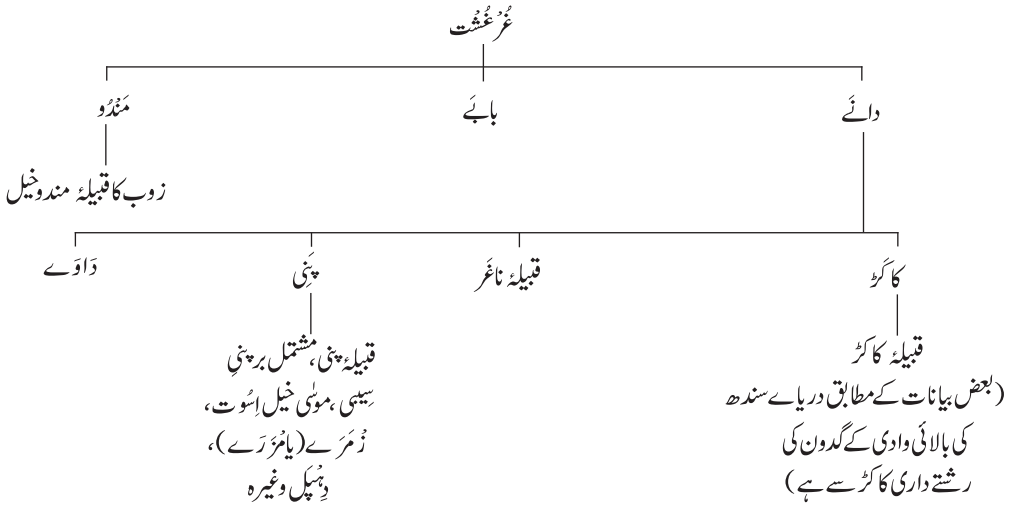

باقی ماندہ قبائل میں سے زیادہ تر کَرڑان (یا کَرلان) کی اولاد سے بتائے جاتے ہیں، جس کا نسب مشکوک ہے۔

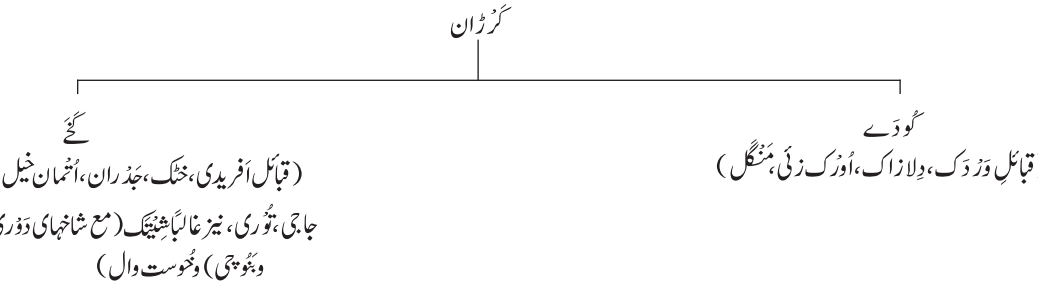

بعض روایات کے مطابق بَنگَش (بَنگَچ) اور وزیری بھی کَگے کی اولاد ہیں۔ دوسروں کے نزدیک وزیری اور دَوڑ مذکورۂ بالا انساب میں کسی سے تعلق نہیں رکھتے۔

بعض کنبے نسلاً سید ہونے کے مدعی ہیں۔ ایسے خاندان شیرانی، کاکڑ، کرڑانی، داوی، تَرین، میانہ اور بٹنی قبائل میں پائے جاتے ہیں۔ گنڈاپور اور اُستَرانہ قبائل بھی یہی دعوٰی کرتے ہیں؛ اصلاً یہ شیرانی قبیلے کی شاخیں تھیں۔ بَنگَش قریشی الاصل ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں۔

مخزن افغانی میں بَنگَش، وزیری اور کَگے کی شاخ سے تعلق رکھنے والے کرڑانی (افریدی وغیرہ) کے سوا مذکورۂ بالا تمام قبائل کو صراحۃً افغان تسلیم کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرڑانی قبیلے کا علم مصنّف کو نہ تھا۔

یہ جان لینا موجبِ دلچسپی ہے کہ پشتو کی وہ تمام بولیاں جن میں حرکات ممدودہ بدل جاتی ہیں (مثلاً آ کی جگہ اُو وغیرہ، دیکھیے نیچے، شمارہ ۲) کرڑانی گروہوں یا وزیریوں سے تعلّق رکھتی ہیں۔ قبائلی نظام کی انتہائی پیچیدگی کو واضح کرنے کے لیے یوسف زئی کی متعدّد شاخوں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اس قبیلے کی پانچ شاخوں میں سے ایک، اَگُوزئی، قبیلۂ رانی زئی اور دوسرے قبیلوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ رانی زئی کے پانچ خیلوں میں سے ایک اپنی جگہ غبی خیل اور تین دوسرے خیلوں میں منقسم ہے۔ غبی خیل کی دو شاخوں میں سے ایک شاخ نور محمد خیل ہے، جو خود غریب خیل اور دَوڑ خیل میں بٹ گئی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خٹکوں کے ایک جدِ امجد کا نام غالباً تورَمانہ کی دوسری شکل ہے، جو ہندوستان کے ایک ہُن بادشاہ اور شاہی خاندان [the Shàhids] کے ایک رکن کا نام تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسطوری افغانوں اور ان بادشاہوں کے درمیان کسی قسم کا تاریخی تعلق تھا، بلکہ صرف یہ کہ مقامی روایات میں مذکورۂ بالا نام محفوظ رہا۔

افغان قبائل کی جغرافیائی تقسیم: دُرّانی [رٹ بآن] دریا کی زیریں وادیوں میں سبزوار اور زمین داوَر سے قندہار اور چمن کے جنوب مشرقی علاقے تک آباد ہیں۔ اسی کی شاخوں میں پوپل زئی (بہ شمولیتِ خاندان شاہی سدوزئی) اور بارک زئی ہیں۔ دُرّانیوں کے بعد سب سے زیادہ طاقت ور قبیلہ غَلزَئی [رٹ بآن] ہے، جو مدّت تک درّانیوں کا حریف رہا۔ یہ قبیلہ قلاتِ غلزئی سے جلال آباد تک کے علاقے میں آباد ہے۔ ہُوتک پہلے ان کی سرکردہ شاخ تھے۔ اب سب سے زیادہ اہمّ شاخ سلیمان خیل ہے۔ پاوندَہ، یعنی وہ خانہ بدوش لوگ جو موسمِ خزاں میں گُومَل اور تُوچی کے راستے نیچے اتر کر دریاے سندھ کے کناروں تک جاتے ہیں اور موسم بہار میں افغانستان واپس ہوجاتے ہیں، انھیں سلیمان خیلوں میں سے آتے

ہیں۔ خَرُوٹی غلزئیوں کے قریب ہیں۔ کاکڑ اور ترین بلوچستان کے اضلاع پشین اور زُوب میں آباد ہیں۔ سیبی کے پنّی ان کے ہمسائے ہیں۔ زُوب کے شمال مغرب میں تختِ سلیمان کے آس پاس شیرانی ملتے ہیں۔ وزیری [رک بآن] (جو درویش خیل اور محسود میں منقسم ہیں) دریاے گُومَل اور دریاے کُرم کے درمیانی کوہستانی علاقے میں سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں۔ مشرقی جانب کی پہاڑیوں میں بٹنی اور لُوہانی ملتے ہیں اور کُرم زیریں کے جنوب میں جومیدان ہیں، ان میں مَروَت بستے ہیں۔ وادیِ ٹوچی میں دَوَڑی اور بَنُوچی آباد ہیں۔ خٹک کوہاٹ کے میدانوں میں بسے ہوے ہیں، اور ان کا سلسلہ آبادی اٹک تک جاتا ہے۔ دریاے کرم کی بالائی وادی میں بَنگش، شیعہ تُوری خیل اور دیگر قبائل پائے جاتے ہیں اور سرحد کے پار افغانستان کی جانب جاجی اپنے ہمسایہ مَنگل اور خوست وال کے ساتھ آباد ہیں۔ بَنگش کے شمال میں اورک زئی (بعض شیعہ خاندانوں کے ساتھ) بستے ہیں۔ تیراہ اور خیبر و کوہاٹ کے درّوں میں سرحد کے دونوں طرف اَفریدی [رک بآن] ہیں اور شِنواری ان کے شمال میں ہیں۔ دریاے کابل کے شمال میں ضلع پشاور اور افغانستان دونوں طرف ایک وسیع علاقے پر مُہمند قابض ہیں۔ ضلع پشاور کے خلیل ان کے رشتے دار ہیں۔ مُہمند کے مشرق میں پشاور کے علاقے اور شمال کے پہاڑوں (بُنیر، سوات، دِیر وغیرہ) میں یوسف زئی اور ان کے حلیف قبائل (مَنْداں) وغیرہ آباد ہیں، جو داردیوں کو پیچھے دھکیلتے اور اپنے اندر ملاتے چلے جارہے ہیں۔ انھیں سواتی کہا جاتا ہے اور وہ مخلوط نسل کے لوگ ہیں، جنھیں یوسف زئیوں نے دریاے سندھ کے پار ضلع ہزارہ میں دھکیل دیا ہے۔ وادی کُنَر اور افغانستان کے دوسرے شمالی و مشرقی حِصّوں میں صافی پائے جاتے ہیں۔ زمانۂ حال میں پشتو بولنے والے افغان کوہستان ہندوکش کے شمال میں مختلف مقامات پر، نیز ہرات کے علاقے میں، آباد ہو چکے ہیں یا آباد کیے گئے ہیں۔

مآخذ: (۱) دیکھیے تصنیفاتِ محمد حیات، بِلّو (Bellow)، راورٹی (Raverty)، الفنسٹن (Elphinstone)، جن کا حوالہ مادّۂ افغانستان کے مآخذ میں دیا گیا ہے؛ (۲) روز (H. A. Rose): *A Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and the N. W. Frontier Province*، لاہور ۱۹۱۱-۱۹۱۹ء، خصوصاً بذیلِ مادّۂ پٹھان؛ (۳) H. C. Willey: *From the Black Mountain to Waziristan*، لنڈن ۱۹۱۲ء (سرحد کے پٹھان قبائل کے بارے میں)۔

(۲) پَشتو زبان: پشتو جنوبی و مشرقی افغانستان میں جلال آباد کے شمال سے قندھار اور وہاں سے مغرب کی جانب سبزوار تک بولی جاتی ہے (کابل کے علاقے میں زیادہ تر فارسی بولتے ہیں، اسی طرح غزنی میں بھی)۔ شمالی اور مغربی افغانستان میں نوآباد لوگ بھی پشتو بولتے ہیں۔ پاکستان میں [سابق] شمالی و مغربی سرحدی صوبے کے اکثر باشندے دیر اور سوات سے جنوب کی طرف، نیز پنجاب کے بعض اقطاع میں اور بلوچستان میں جنوب کی جانب کوئٹے تک پشتو ہی رائج ہے ان لوگوں کی مجموعی تعداد غالباً چالیس لاکھ ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ پشتو۔

(۳) پشتو ادب: اب سے کچھ عرصہ پہلے تک پشتو کی کوئی کتاب سترھویں صدی عیسوی سے قدیم تر شائع نہیں ہوئی تھی، لیکن د کابل سالنامہ (سالنامۂ کابل)، ۱۹۴۰-۱۹۴۱ء میں عبدالحی حبیبی نے سلیمان ماکو کے تذکرۃ الاولیاء کے کچھ اجزا شائع کیے۔ یہ ایسی نظموں پر مشتمل ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھیں۔ ۱۹۴۴ء میں حبیبی نے کابل میں محمد ہوتک کی کتاب پٹّہ خزانہ (تکمیل ۱۷۲۹ء) شائع کی، جس کے متعلق دعوٰی کیا گیا ہے کہ قندھار میں لکھی گئی تھی اور جو آٹھویں صدی عیسوی سے مؤلّف کے وقت تک کے پشتو شعرا کے منتخب کلام کی ایک بیاض ہے؛ لیکن یہ کتابیں متعدّد لسانی اور تاریخی گنجلکیں پیدا کرتی ہیں اور ان کے صحیح و مستند ہونے کا سوال حتمی طور پر اس وقت تک طے نہیں ہوسکتا جب تک اصلی مخطوطات لسانی تحقیقات کے لیے سامنے نہیں لائے جاتے۔ اگر محمد ہوتک کے پٹّہ خزانہ کی صحّت تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ امر پھر بھی مشتبہ رہتا ہے کہ محمد ہوتک نے قدیم نظموں کی جو تاریخیں لکھی ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔ راورٹی (Raverty) لکھتا ہے کہ شیخ مَلی نے ۱۴۱۷ء میں یوسف زئیوں کی ایک تاریخ لکھی تھی، لیکن اس تصنیف کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں [قب مادّہ یوسف زئی]۔ ایک مخطوطہ موجود ہے جو بایزید انصاری (م ۱۵۸۵ء) کی خیر البیان پر مشتمل ہے۔ اور اس کا معائنہ بھی کیا جا چکا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کے ابتدائی دَور سے ہمارے پاس اُس کے راسخ العقیدہ مدِّ مقابل اخوند دَرْوِیزَہ [رک بہ مادّۂ روشنیہ] کی دینی اور تاریخی کتابیں (مخزن افغانی، مخزن اسلام) موجود ہیں، جو طعن و تشنیع سے لبریز ہیں۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں متعدّد شعرا پیدا ہوے، لیکن ان میں سے زیادہ تر فارسی نمونوں کے نقّال ہیں۔ یورپی معیاروں کی رُو سے اور جدید افغانستان کے قومی شاعر کی حیثیت سے ان میں سب سے نمایاں خوش حال خان [رک بآن، ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء-۱۱۰۶ھ/ ۱۶۹۴ء] ہے، جو خٹک قوم کا سردار، بڑا محبِّ وطن، جنگجو اور مختلف مضامین پر لکھنے والا پُرنویس مصنّف تھا۔ خوش حال خان کی برجستگی، قوتِ بیان اور آزادیِ فکر نے اس کی بہترین نظموں میں ایک مخصوص کیف بھر دیا ہے۔ اس کی اولاد میں بھی متعدّد شاعر گزرے ہیں اور اس کے پوتے افضل خان نے تاریخ مُرصّع کے نام سے افغانوں کی ایک تاریخ لکھی ہے۔ قدیم ترین صوفی شاعر میرزا تھا، جو بایزید انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، لیکن مقبول ترین صوفی شاعر عبدالرحمٰن اور عبدالحمید تھے (دونوں ۱۷۰۰ء کے قریب)۔ دُرّانی خاندان شاہی کا بانی احمد شاہ بھی شاعر تھا۔ علاوہ بریں فارسی ادب کے بہت سے تراجم نیز ایرانی و افغانی داستانیں، مثلاً آدم خان و دُرخانئ منظوم کی گئیں۔ پشتو کے وہ لوک گیت اور منظوم قصّے وغیرہ بھی خاصے دلچسپ ہیں جنھیں Darmesteter نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ حال ہی میں افغان اکادمی (پشتو ٹولنہ) کابل نے لوک گیتوں کی ایک جلد طبع کی ہے، جنھیں اکثر لنڈئے یا مصرعے کہا جاتا ہے اور جو ایک مخصوص بحر میں غزلیہ اَبیات پر مشتمل ہیں۔ ان اشعار میں سے بعض بہت حسین ہیں۔ افغانستان میں ان دنوں جدید پشتو نظموں کی تصنیف و اشاعت زوروں پر ہے اور پشتو اکادمی دیگر ادبی

کتابیں بھی شائع کر رہی ہے۔

مآخذ: (برائے ۲ و ۳): (۱) W. Geiger: *Sprache der Afghānen*، در *Grundriss der iran. Philologie*، ۲/۱ (مع فہرستِ مآخذ)؛ (۲) G. A. Grierson: *Linguistic Survey of India*، ج ۱۰ (وسیع اور جامع فہرست مآخذ کے ساتھ، ص ۱۴-۱۶)؛ (۳) H. G. Raverty: *Grammar*، طبع ثالث، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۴) وہی مصنّف: *Dictionary*، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۵) وہی مصنّف: *Gulshan-i-Roh*، (چیدہ اقتباسات)، لنڈن ۱۸۶۰ء؛ (۶) وہی مصنّف: *Selections from the Poetry of the Afghans*، لنڈن ۱۸۶۴ء؛ (۷) H. W. Bellew: *Grammar*، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۸) وہی مصنّف: *Dictionary*، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۹) Trumpp: *Grammar*، لنڈن - ٹوبنگن ۱۸۷۳ء؛ (۱۰) J. Darmesteter: *Chants populaires des Afghans*، پیرس ۱۸۸۸ - ۱۸۹۰ء؛ (۱۱) ہیوز (T. P. Hughes): کلید افغانی، پشاور ۱۸۷۲ء و ترجمہ از Plowden، لاہور ۱۸۷۵ء؛ (۱۲) J. G. Lorimer: *Grammer and Voc. of Waziri Pashto*، کلکتہ ۱۹۰۲ء؛ (۱۳) D. L. R. Lorimer: *Syntax of Colloquial Pashtu*، اوکسفرڈ ۱۹۱۵ء؛ (۱۴) Malyon: *Some Current Pushtu Folk Stories*، کلکتہ ۱۹۰۲ء؛ (۱۵) Gilbertson: *The Pakhto Idiom, A Dictionary*، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۱۶) Cox: *Notes on Pushtu Grammar*، لنڈن ۱۹۱۱ء؛ (۱۷) G. Morgens-tierne: *Etymological Voc. of Pashto*، اوسلو ۱۹۲۷ء؛ (۱۸) وہی مصنّف: *Archaisma and Innovations in Pashto Morpho-logy*، در *Norsk Tidskrift for Sprogwidenshap*، ج ۱۲؛ (۱۹) وہی مصنّف: *The Wanetsi Dialect*، در مجلّۂ مذکور، ج ۴؛ (۲۰) W. Lentz: *Sammlungen zur afghanischen Listeratur-und Zeitges-chichte*، در *ZDMG*، ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۷ ببعد؛ (۲۱) وہی مصنّف: *Die Pašto Bewegung*، در *ZDMG*، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۷ ببعد؛ (۲۲) H. Penzl: *On the Cases of the Afghan Noun, Word*، ج ۶؛ (۲۳) وہی مصنّف: *Description of the Afghan Verb*، در *JAOS*، ۱۹۵۱ء؛ (۲۴) وہی مصنّف: *Die Substantiva nach. Afgh. Grammatikern*، در *ZDMG*، ۱۹۵۲ء، مع فہرست مآخذ؛ (۲۵) محمد اعظم اِیازی: لس زیرہ پشتو لغتونہ، کابل ۱۹۴۱ء؛ (۲۶) محمد گل مہمند: پختو سِیند، کابل ۱۹۳۷ء؛ (۲۷) دپختو کلِی، کابل ۱۹۳۹-۱۹۴۰ء، نشریۂ پختو ٹولنہ؛ (۲۸) پختو قاموس، کابل ۱۹۵۲-۱۹۵۴ء۔

(G. MORGENSTIERNE)

✱⊗ **افغانستان:** (۱) جغرافیہ؛ (۲) نسلیات؛ (۳) زبانیں؛ (۴) مذہب؛ (۵) تاریخ۔

(۱) جغرافیہ

جو ملک اب افغانستان کے نام سے موسوم ہے اس کا یہ نام صرف اٹھارھویں صدی [عیسوی] کے وسط سے شروع ہوا، یعنی جب سے افغان قوم کو ایک مسلّمہ سیادت حاصل ہوگئی۔ اس سے پہلے [ملک] کے اقطاع کے الگ الگ نام تھے، لیکن پورا ملک ایک مُعیّنہ سیاسی وحدت نہیں تھا اور اس کے مشمولہ حصّے نسلی یا لسانی یکسانی سے باہم مربوط نہ تھے۔ افغانستان کا قدیم تر مفہوم محض ''افغانوں کی سرزمین تھا''، یعنی ایک محدود علاقہ، جس میں موجودہ مملکت کے بہت سے اقطاع شامل نہ تھے؛ البتہ بعض بڑے بڑے اضلاع شامل تھے جو اب آزاد ہیں یا پاکستان کی حدود میں آ چکے ہیں۔ افغانستان اپنی موجودہ ہیئتِ ترکیبی کے مطابق بارک زئی بادشاہوں کے (جو پہلے امیر کہلاتے تھے) زیرِ اقتدار ایک بے قاعدہ سی شکل کے علاقے پر مشتمل ہے، جو ۲۹ درجے ۳۰ دقیقے اور ۳۸ درجے ۳۰ دقیقے طول بلد شمالی اور ۶۱ درجے اور ۷۵ درجے عرض بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے (یا اگر وخّان کی لمبی پٹّی کو الگ کر دیا جائے تو ۶۱ درجے اور ۷۱ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد مشرقی کے درمیان)۔

ارضی ساخت: یہ ایران کی عظیم سطح مرتفع کا شمالی و مشرقی حِصّہ ہے (قب مادّۂ ایران)، جس کی شمالی حد وسط ایشیا کا نشیبی علاقہ اور مشرقی حد دریاے سندھ کے میدان اور پاکستان کا [سابقہ] شمالی مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ مغرب اور جنوب کی طرف یہ ملک ڈھلواں ہوتے ہوئے اس نشیبی علاقے سے جا ملتا ہے جو مذکورۂ بالا سطح مرتفع کے وسط میں ہے اور جنوب و مشرق میں بلوچستان کے سلسلۂ کوہستان سے پیوست ہو جاتا ہے۔ اس کی سطوح مرتفع کی شمالی حد وہ سلسلۂ کوہ ہے جو پامیر سے مغرب کی جانب پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ذرا ہٹی ہوئی ماہی پشت پہاڑی (ridge) بندتر کستان نام بھی شامل ہے، جس کے آگے ریت اور چکنی مٹی کا میدان دریاے جیحون (Oxus) تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں یہ سطح مرتفع ایک دم نیچی ہو کر دریاے سندھ کی وادی میں آ ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکستان کے چکنی مٹی کے میدان کے سوا یہ پورا ملک سطح مرتفع میں شامل ہے۔ یہ سطح مرتفع خود تشکیل طبقات الارض کے متأخّر دورِ ثالث (tertiary period) میں وجود پذیر ہوئی، اس لیے زیادہ تر ریت اور چُونے کے پتھروں سے بنی ہے۔ اس کا شمالی و مشرقی حصّہ کسی زمانے میں ایک بڑے سمندر کا جز تھا، جو بحیرۂ خزر کے نشیب کو پاکستان کے میدانوں سے ملاتا تھا۔ ارتفاعِ ارضی کا یہ عمل، جس سے یہ علاقہ بلند ہو گیا، ابھی تک جاری ہے۔ ہولڈِش (Holdich) کے نزدیک دریاؤں کی گزرگاہوں میں زیادہ گہرائی کا سبب یہ ہے کہ وہ زمین کو اتنی تیزی سے کاٹتے نہیں جتنی تیزی سے یہ اوپر اٹھتی اور ابھرتی آ رہی ہے۔

کوہستان: افغانستان کے پہاڑی سلسلوں کا نمایاں ترین پہلو شمالی کوہستان ہے، جو مشرق سے مغرب کو پھیلا ہوا ہے اور جس کے بارے میں اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ سطح مرتفع کی شمالی حد بناتا ہے۔ یہ سلسلہ شمال کے ترکستانی اضلاع (زمانۂ قدیم کے باختریہ (Bactria)) کو کابل، ہرات اور قندہار کے جنوبی صوبوں (زمانۂ قدیم کے اریانہ (Ariana)) اور ارکوسیہ (Arachosia)) سے الگ کرتا ہے۔ یہ بڑا سلسلہ مختلف ناموں سے موسوم ہے، مثلاً مشرق میں ''ہندوکش'' کے نام سے، جہاں یہ پامیر سے پھوٹتا ہے؛ آگے مغرب میں ''کوہ بابا'' اور ہرات کے قریب کوہ

سَفِید [یہ کوہستان سلیمان کا ایک حصّہ ہے، جسے ہمیشہ برف پوش رہنے کے باعث کوہ سفید یا پشتو میں ''سپین غر'' کہتے ہیں] اور ''سِیاہ بک'' کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مؤخّر الذّکر عام طور سے پاروپامیسس (Paropamisus) کہلاتا ہے، اگرچہ اصلی پاروپامیسس (یا بطلمیوس کے Paropanisus) میں ہندوکش بھی شامل تھا۔ اس سلسلے سے جنوب کی طرف جو علاقہ ہے اس کے بیشتر حصّے میں متعدّد ضمنی پہاڑی سلسلے یا لمبی لمبی کوہستانی شاخیں موجود ہیں، جو مشرق سے مغرب کو یا عام طور پر شمال مشرق سے جنوب مغرب کو یا عام طور پر شمال مشرق سے جنوب مغرب کو جاتی ہیں۔ ہرات اور قندہار کے صوبوں کا بڑا حصّہ انھیں پہاڑی سلسلوں اور ان کی درمیان کی وادیوں سے بنا ہے، بجالیکہ مشرقی ہندوکش کے جنوب میں پہاڑوں کا جو اُلجھا ہوا سلسلہ ہے اس میں دریاے کابل اور دریاے کُرَّم کی وادیاں نیز کابل ونورستان کے صوبے شامل ہیں۔ شمالی سلسلۂ کوہ کی بلند ترین چوٹی کوہ بابا میں شاہ فولادی ہے (۱۶۸۷۰ فٹ = ۵۱۵۸ میٹر) اور جو لمبی شاخ جنوب مغرب کو نکل گئی ہے اس میں متعدد چوٹیاں تقریباً ۱۱۰۰۰ فٹ = ۳۳۵۳ میٹر تک بلند ہیں۔ جو ماہی پشت پہاڑیاں (ridges) ہِلمَنْد، تَرْنک، اَرْغَنْداب اور اَرْغَسان کی وادیوں کو ایک دوسری سے جدا کرتی ہیں وہ بھی اسی سلسلۂ کوہ کی بیرونی شاخیں ہیں اور اس کا سراغ جنوب مشرق میں بلوچستان کے اندر تک لگایا جا سکتا ہے۔ کوہستانِ سلیمان [رَکّ بآن]، (بلند ترین چوٹی تختِ سلیمان: ۱۲۲۰۰ فٹ = ۳۷۴۵ میٹر) — جو بالآخر وادی سندھ میں اتر کر ختم ہو جاتا ہے اور سطح مرتفع کا مشرقی کنارا ہے — افغانستان کی سیاسی حدود سے باہر ہے۔ سطح مرتفع کے اس مشرقی کنارے پر مزید شمال کی طرف دریاے کرم اور دریاے گُومل کے درمیان جو پہاڑ واقع ہیں وہ اَور بھی بے قاعدہ سا مجموعہ بناتے ہیں اور ان کی بعض چوٹیاں ۱۱۰۰۰ فٹ = ۳۳۵۳ میٹر تک بلند ہیں۔ اس کے اوپر شمال میں دریاے کُرَّم اور دریاے کابل کی وادیوں کے درمیان سفید کوہ واقع ہے، جو افغانستان میں ہندوکش اور کوہ بابا کے بعد سب سے اونچا کوہستان ہے (بلند ترین چوٹی کوہِ سِکارام: ۱۵۶۰۰ فٹ = ۴۷۴۳ میٹر)۔

دریائی نظام: ہندوکش کے شمال میں زمین کی سطح وادی جیحون کی طرف تیزی سے نیچی ہوتی چلی گئی ہے، جنوبی جانب اس کی وادیاں بتدریج سیستان کے نشیب کی طرف ڈھلتی ہیں، جس میں ہِلمَنْد ہامون (جھیل ہلمند) اور اس کی شاخ گُودِزِرَہ واقع ہے۔ دریاے سندھ کے معاوِنوں کو چھوڑ کر باقی تمام دریا، جو کوہستان ہندوکش کے جنوب میں واقع ہیں، اسی جھیل میں گرتے ہیں۔ بنابریں افغانستان کے دریا قدرتی طور پر تین زُمروں میں بٹ جاتے ہیں، جنھیں زمرۂ سندھ، زمرۂ ہلمند اور زمرۂ جیحون کہہ سکتے ہیں۔ زمرۂ سندھ میں دریاے کابل [رَکّ بآن] اور اس کے معاون ہیں، جن میں شمال کی طرف ہندوکش سے بہہ کر آنے والے دریا تگاؤ (Tagao) اور کُنٹر اور جنوب کی طرف گُل کوہ سے آنے والا دریا لُوگَر بہت اہم ہیں۔ جنوب میں اس زمرے کا دریا کُرَم ہے، جو کوہ پیواڑ سے نکلتا ہے اور اس کا معاون ٹوچی ہے، جس کے زیریں حصّے کو گُمبیلَہ کہتے ہیں۔ یہ دریا کوہستان کے نیچے پاکستانی علاقے میں پہنچ کر دریاے کرم سے مل جاتا ہے۔ مزید جنوب کی طرف گُومَل ہے، جو دریاے کُنڈَر اور ژُوب کے اتّصال سے بنا ہے اور وزیرستان کے پہاڑوں کو تختِ سلیمان سے جدا کرتا ہے۔ اگرچہ یہ دریا چنداں بڑے نہیں، تاہم وسیع علاقوں کا پانی کھینچ کر لاتے ہیں نیز ہندوستان اور سطحِ مرتفع (افغانستان) کے درمیان کوہستان میں سے اہم عسکری اور تجارتی راستے بناتے ہیں۔ دوسری چھوٹی ندیاں بھی، مثلاً وَہُوَا، لُونی، کَہا اور ناری، جو زیادہ جنوب کی طرف واقع ہیں، یہی کام دیتی ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجّہ ہے کہ ان میں بہت سی ندیاں ان قدرتی وادیوں کے ساتھ ساتھ نہیں بہتیں جو پہاڑوں نے بنا رکھی ہیں، بلکہ کوہستان سلیمان کے ریت اور چونے کے پتھروں کی ماہی پشت پہاڑیوں کو عرضًا کاٹ کر اپنا راستہ بناتی ہیں اور ان پہاڑوں میں انھوں نے عمودی کناروں والی گہری گھاٹیاں بنا دی ہیں۔

دوسرا سلسلہ، یعنی زمرۂ ہِلمَنْد، دریاے ہلمند اور اس کے معاونین نیز ان دریاؤں پر مشتمل ہے جو نشیب سیستان کی طرف جنوب مغرب کو بہتے ہیں۔ ان میں اہم ترین ہلمند [رَکّ بآن] یا ہِرمند (اَوِستا کا ہئِتُمَنْت اور قدیم یونانی ورومی مصنّفین کا اتی مَنْدرُس (Etymandrus) ہے۔ یہ دریا کابل کے قرب وجوار سے نکلتا ہے اور تنگ کوہستانی وادیوں میں سے گزرتا ہوا ''زمینداور'' کے زیادہ کھلے علاقے میں پہنچتا ہے، جہاں اس میں بائیں طرف سے دریاے اَرْغَنْداب (ہرہ ویتی، Harahwaiti)، اَرَشوتس (Arachotis) مل جاتا ہے۔ ارغنداب حقیقۃً بالائی ارغنداب، تَرْنک اور اَرْغَسان (یا اَرْغَسْتان) کے اتّصال سے بنا ہے۔ یہ ندّیاں شمالی ومشرقی اور جنوبی ومغربی رخ رکھنے والی کئی قریب قریب متوازی وادیوں کا پانی لاتی ہیں۔ اسی زمرے کی ایک اَور رکن وہ ندّی ہے جو غزنہ سے جنوب کی طرف بہتی ہے۔ یہ دریاے ہلمند یا اس کے معاونین تک نہیں پہنچتی، بلکہ ''آب استادہ'' میں جذب ہو جاتی ہے، جو آب شور کی جھیل ہے۔ جو دریاے ہلمند سے مغرب کی طرف واقع اور جنوب مغرب کی طرف بہتے ہوے ہامُون ہی میں جا گرتے ہیں، یہ ہیں: خاش رُود [یا خواش رود]، فَراہ رود، اور ہَرُوت رود [لی سٹرینج نے نام ''ہارود'' لکھا ہے۔ دراصل اس کا پرانا نام ''اسفزار رود'' تھا کیونکہ یہ دریا اسفزار یا سبزوار ہرات سے آتا ہے]۔

ہامون [رَکّ بآن] ایک طاس ہے، جو بعض اوقات بہت کم چوڑا ہوتا ہے اور طغیانی کے زمانے میں جنوب کی طرف بے حد پھیل جاتا ہے۔ اس وقت کوہِ خواجہ کا پہاڑی قلعہ جزیرہ بن جاتا ہے۔ پھر اس کا پانی شِیلَغ نامی ایک نالے کی راہ سے پست تر نشیب گُودِزِرَہ میں جا گرتا ہے۔ موجودہ حد بندی کے مطابق سیستان تقسیم ہو گیا ہے، لہٰذا اب ہامون کا ایک حِصّہ افغانی علاقے اور ایک حِصّہ ایرانی علاقے میں چلا گیا ہے۔ ہامون سطح بحر سے صرف ۱۵۸۰ فٹ بلند ہے اور گُودِزِرَہ اس سے بھی پست تر ہے۔ ہامون کا پانی بطور اوسط دس سال میں ایک مرتبہ امنڈ کر

گُودِزِرَہ میں پہنچتا ہے۔ اس میں کھاری پن بہت کم ہے اور پینے کے کام آ سکتا ہے۔ کھاری پن میں کمی یقیناً وقتاً فوقتاً امنڈ پڑنے ہی کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ ان دریاؤں کا پانی باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور یہ گادمٹی کی بھاری مقدار نشیبی علاقوں میں لاتے ہیں، تاہم سیستان کی سطح زمانۂ قدیم کے مقابلے میں اونچی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سال کا بیشتر حصّہ اس علاقے میں شمال مغرب کی تُند اور تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں، جو سطح زمین کی ہلکی مٹی اڑا دیتی ہیں۔

تیسرا سلسلہ، یعنی زمرۂ جیحون [رک بہ مادّۂ آمودریا] دریاے جیحون اور اس کے جنوبی معاونین، مُرغاب [رک بآن] اور ہَری رود [رک بآن] پر مشتمل ہے۔ یہ بھی جانبِ شمال میدانی علاقے میں بہتے ہیں، لیکن دریاے جیحون تک نہیں پہنچتے۔ یہ تمام دریا عظیم کوہستانی فصیل کی شمالی جانب سے نکلتے ہیں؛ صرف دریاے ہری رود کوہ بابا کے جنوب سے نکلتا ہے اور کوہ سفید اور کوہ سیاہ کے درمیان کی تنگ وادی میں سے مغرب کی طرف بہتا ہوا ہرات کے میدانی علاقے میں پہنچتا ہے۔ یہاں وہ شمال کی طرف مڑتا ہے اور پہاڑوں کے درمیان ایک نشیب میں سے گزرتا ہوا ذوالفقار کے آگے روسی ترکستان کے میدانوں میں جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

ملک کی عمومی بناوٹ: جنوب اور مغرب کی طرف کوہستانی سلسلوں کی بلندی عموماً کم ہوگئی ہے؛ لہٰذا آمدورفت کی جو مشکلات شمالی علاقے میں پیش آتی ہیں یہاں مفقود ہو جاتی ہیں۔ بنابریں ہرات سے قندہار تک جانے کے لیے تجارتی کاروانوں یا عسکری مہموں کا آسان راستہ قدیم زمانے سے وہ رہا ہے جو سَبزَوار، فراہ اور گِرِشک ہوتا ہوا آتا ہے اور اس میں چکر ہے؛ اس کے برعکس قندہار سے غزنی اور کابل کو جاتے ہوے وادی تَرنَک کا سیدھا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ہرات سے، جہاں کوہ پاروپامیسس (Paropamisus) کی بلندی گھٹتے گھٹتے بہت ہی کم رہ گئی ہے، علاقۂ ترکستان تک رسائی بہت آسان ہے۔ کابل سے ترکستان جانے کے لیے کوہستان ہندوکش کے دشوار گزار درّوں ــ خواک، بامیان وغیرہ ــ میں سے بھی سیدھا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

یوں طبعی محلِّ وقوع کے اعتبار سے ہرات، قندہار اور کابل، تینوں شہر ملک کے اہم ترین نقطے بن گئے ہیں۔ ان میں سے ہر شہر ایک زرخیز وادی میں واقع ہے اور اپنی ضرورتیں خود مہیّا کر سکتا ہے۔ ہر ایک دوسرے شہروں نیز ہندوستان، ایران اور وسط ایشیا کو جانے والی تجارتی شاہ راہوں کے ناکے پر ہے۔ غالباً اسی وجہ سے یہ راے ظاہر کی جاتی ہے کہ استحکامِ افغانستان کے پیش نظر ان تینوں مقامات کا ایک حکومت کے قبضے میں رہنا ضروری ہے۔ اگر ان کے مالک الگ الگ ہوں تو مملکت کا استحکام ممکن نہیں۔ ان سیاسی معنی میں غزنہ اور جلال آباد کو کابل، قدیم دارالحکومت بست اور گِرِشک کو قندہار اور سَبزَوار کو ہرات کے ساتھ شمار کرنا چاہیے۔ سیستان، جو ہرات سے قندہار کو جانے والی آسان گزار شاہ راہ پر واقع ہے، ہمیشہ ایک متنازع فیہ علاقہ بنا رہا ہے۔

کابل کا محلِّ وقوع ہر لحاظ سے مستحکم ترین ہے، اس لیے یہ دیگر اضلاع کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ آزاد رہا ہے؛ اس کے برعکس ہرات مغرب اور شمال کی جانب سے حملوں کی بہت زد میں ہے اور جب کبھی کوئی خارجی طاقت ہرات سر کر لیتی ہے تو قندہار کو فی الفور خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ جب تک ہرات پر قبضہ قائم ہے اس وقت تک قندہار مغربی جانب کے حملوں سے محفوظ ہے اور پاک و ہند کے تعلّق میں بھی اس کی وضعیت مستحکم ہے، اگرچہ کابل کے برابر نہیں۔

سیستان کا علاقہ، جو ہامون سے متّصل ہے، زرخیز اور آب یاری کے لیے موزوں ہے۔ چونکہ یہ علاقہ مشرق کی طرف قندہار جانے والی شاہ راہ پر اور مغرب کی جانب ہرات جانے والے راستے کے ناکے پر ہے اس لیے افغانستان کے حکم رانوں کے لیے بہت اہمیّت رکھتا ہے۔

آب و ہوا: پورے ملک میں دونوں طرح کے انتہائی درجۂ حرارت مل سکتے ہیں۔ ایک طرف سیستان، ضلع گرم سیر اور وادی جیحون کی شدید گرمی ہے اور دوسری طرف موسم سرما میں ان علاقوں کی بے پناہ سردی، جہاں تُند برفانی طوفان آ جانا بھی غیر معمولی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ فوجوں کو حد درجہ شدید سردی کے مصائب جھیلنا پڑے، مثلاً حوالی ہرات سے کوہستان ہزارہ میں سے کابل کی طرف شہنشاہ بابر کا سفر۔

زمانۂ قریب کی مثالوں میں سے وہ مصیبتیں ہیں جو امیر عبدالرحمٰن کی فوج کو ۱۸۶۸ء میں اور حد بندی کے برطانوی کمیشن کو ۱۸۸۵ء میں بمقام بادغیس پیش آئیں۔ افغانستان میں ہر جگہ درجۂ حرارت کا یومیہ اتار چڑھاؤ بہت زیادہ ہے؛ چنانچہ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم درجۂ حرارت میں عموماً سترہ سے لے کر تیس درجہ فارن ہائیٹ تک کا تفاوت پایا جاتا ہے۔ بہار و خزاں میں بلند وادیوں کی آب و ہوا معتدل اور خوش گوار ہوتی ہے، جو پھلوں، خصوصاً انگور، سردے، خربزے، آڑو، آلوچے، خوبانی، اخروٹ اور پستے کی پیداوار کے لیے موزوں ہے۔ نواحی کابل کی تعریفوں کے جو طومار شہنشاہ بابر نے باندھے دور حاضر کے سیاحوں نے انھیں بے جا نہیں پایا۔

ہندوکش کے زیادہ مرتفع علاقوں میں صحیح معنی میں خالص آلپی (Alpine) [کوہستانی] آب و ہوا پائی جاتی ہے، جو کوہستان ہمالیہ کے بعض حِصّوں کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے۔

نباتات مجموعی حیثیت سے وہی ہے جو ایرانی سطح مرتفع کی ہے اور ہندوستان کے میدانی علاقوں کی نباتات سے یکسر مختلف ہے۔ میدانی علاقوں میں ان درختوں کے سوا جو باغوں میں کاشت کیے جاتے ہیں ــ یعنی پھل والے درخت یا چنار اور بید مجنوں ــ دوسری قسموں کے درخت بہت کم ہوتے ہیں؛ لیکن اونچے پہاڑوں پر کئی قسم کے صنوبر (چیڑ pines)، سدابہار بلوط، خودرُو تاک، عشق پیچاں (ivy) اور گلاب پائے جاتے ہیں۔ پست تر اور خشک تر پہاڑوں پر خودرُو پستہ (Pistacia Khinjuk)، جنگلی زیتون (Olea europea)، سدابہار صنوبر (Juniper axcelsa) اور عشق پیچاں (Tecoma undulata) عام ہیں۔ انگزہ (انگوزہ)،

یعنی ہینگ (Ferula assafoetida) بہت سے اقطاع میں بہ افراط پیدا ہوتی ہے۔ موسم بہار میں خودرُو پھول، بالخصوص سوسن، لالہ اور گلنار بھی بکثرت ہوتے ہیں۔

سیاسی تقسیم: ملک کی تقسیم اس کی طبعی ساخت کے مطابق ہوئی ہے۔

(۱) کابل: ولایتِ کابل دریاے کابل، دریاے لُوغر اور دریاے تگاؤ (تگو) کے بالائی حصّوں کی زرخیز اور مرتفع وادیوں، غزنہ، نیز جلال آباد [رک بآن] کے قریب وادی کابل کے زیریں حصّے پر مشتمل ہے۔ پہلے اس علاقے کا اہم ترین شہر غزنہ [رک بآن] تھا، لیکن گزشتہ چار سو سال سے کابل [رک بآن] نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں کابل کو حکومتی مرکز تسلیم کر لیا گیا تھا اور درّانی بادشاہوں نے بجاے قندہار کے اسی کو اپنا دارالسّلطنت بنا لیا تھا۔ اس کا قدیم حریف پشاور [رک بآن] ہے۔ یہ ان قبائل کا قدرتی مرکز ہے جو دریاے سندھ کے آس پاس میدانی علاقے میں رہتے ہیں۔

(۲) قندہار: ولایتِ قندہار زمین داور کے قدیم صوبے پر مشتمل ہے۔ اس میں دریاے ہِلمند، تَرنک، اَرغَنداب اور اَرغَسان کی زیریں وادیاں شامل ہیں۔ دُرّانی زیادہ تر یہیں آباد تھے۔ موجودہ شہر قندہار [رک بآن]، جو دریاے اَرغَنداب پر واقع ہے، چودھویں صدی عیسوی سے اس ولایت کا حکومتی مرکز چلا آ رہا ہے اور اس نے گِرِشک [رک بآن] اور بُست [رک بآن] کے قدیم شہروں کی جگہ لے لی ہے۔

(۳) سیستان: سیستان [دیکھیے مادّۂ سِجِستان] اس گرم، زرخیز اور سیراب علاقے کا نام ہے جو ہامون کے اردگرد واقع ہے، مگر اس کا بڑا حصّہ ایران کی مملکت میں شامل ہے۔ اس میں کوئی بڑا شہر آباد نہیں۔

(۴) ہرات: ولایتِ ہرات ہری رُود کی زرخیز وادی اور اس کھلے میدانی علاقے پر مشتمل ہے جو کوہستان ہزارہ اور سرحدِ ایران کے درمیان واقع ہے۔ اس میں ان پہاڑوں کا بھی بڑا حصّہ شامل ہے جن میں ہزارہ [رک بآن] اور چَہار اَیماق [رک بآن] قبائل آباد ہیں۔ اس ولایت کا دارالحکومت شہر ہرات تاریخِ مشرق میں بہت مشہور و معروف ہے۔ اگرچہ یہ سابقہ عظمت و شان بہت بڑی حد تک کھو چکا ہے تاہم اب بھی ایک اہم مقام ہے اور رہے گا۔ امن اور وسائل حمل و نقل کی ترقی کے ساتھ بلاشبہہ بہت پھولے پھلے گا۔ اس ولایت کے جنوبی حصّے میں سبزوار [رک بآن] بھی ایک بارونق شہر ہے۔

(۵) ہزارستان [رک بآن]: ہزارہ اور چہار اَیماق قبائل کا وطن اس کوہستان کے جمگھٹ میں واقع ہے جو شمال میں کوہِ بابا، مغرب میں ہرات کے کھلے میدان اور مشرق و جنوب میں وادی ہِلمند سے محدود ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو قدیم زمانے میں غُور [رک بآن] کے نام سے مشہور تھا۔ شہر غُور کے کھنڈر غالباً قدیم زمانے کے دارالحکومت فیروزکوہ کے محلِّ وقوع کی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں بارھویں صدی عیسوی میں شاہانِ غُور حکمرانی کرتے تھے۔ اب اس علاقے میں کوئی اہم شہر آباد نہیں۔

(۶) ترکستان: کوہِ بابا کے شمال میں دریاے جیحون تک جو علاقہ چلا گیا ہے اسے ترکستان کہتے ہیں۔ اس کا پرانا حکومتی مرکز بَلخ [رک بآن] اب اپنی گزشتہ اہمیت کھو چکا ہے۔ اس کے موجودہ انتظامی مراکز مزار شریف [رک بآن]، تاش کُرگان (تاشقرغان) اور مَیمَنہ [رک بآن] ہیں۔

(۷) بَدَخشان: جو علاقہ ہندوکش کے شمال اور ترکستان کے مشرق میں دریاے جیحون کے بائیں کنارے واقع ہے اسے بدخشان [رک بآن] کہتے ہیں۔ اس علاقے کو دریاے قُندُز اور اس کے معاون سیراب کرتے ہیں۔

(۸) وَخان: مزید مشرق میں جو طویل کوہستانی وادی پامیر تک پھیلی ہوئی ہے اسے وَخان [رک بآن] کہتے ہیں۔

(۹) نُورِستان: ہندوکُش کا ایک پہاڑی حصّہ، جو وادی کابل کے شمال اور کُنَر کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا نام پہلے کافرستان تھا، لیکن جب ۱۸۹۶ء میں امیر عبدالرحمٰن خان نے اس ملک کو سر کیا تو اس کا نام بدل کر نورستان رکھ دیا گیا۔ [آج کل مملکتِ افغانستان سات بڑے صوبوں، یعنی کابل، مزار، قندہار، ہرات، قطغن، ننگرہار (سابق مشرقی صوبہ) اور پاکتیا (سابق جنوبی صوبہ) اور گیارہ چھوٹے صوبوں، یعنی بدخشان، فراہ، غزنی، پَرْوَن، گِرِشک، میمنہ، شبرغان، غورات، طالقان، بامیان اور اُرزُگان پر مشتمل ہے۔ ہر بڑے صوبے کا گورنر نائب الحکومت اور چھوٹے کا حاکم اعلیٰ کہلاتا ہے].

(۲) نسلیات

افغانستان کی آبادی حسبِ ذیل بڑے نسلی گروہوں پر مشتمل ہے: (۱) افغان؛ (۲) تاجیک اور دوسرے ایرانی؛ (۳) ترکی منگولی اور (۴) ہندوکش کے انڈوآریائی (جن میں کافر بھی شامل ہیں)۔ ۱۹۴۷ء میں جو اندازہ کیا گیا تھا اس کے مطابق افغانستان کی کل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ان میں سے ترپن فی صد افغان، چھتیس فی صد تاجیک، چھے فی صد ازبک، تین فی صد ہزارہ اور تین فی صد دیگر اقوام کے افراد بیان کیے جاتے ہیں؛ لیکن یہ اعداد و شمار یقینی نہیں۔ کسی بھی ''خالص نسل'' کے لوگ یہاں موجود نہیں، ہر لسانی گروہ متعدّد نسلی انواع پر مشتمل ہے اور باشندوں کے باہمی اختلاط نیز فارسی اور پشتو کو ثانوی زبان کے طور پر اختیار کر لینے سے وہ امتیاز، جو شاید پہلے کبھی موجود ہوگا، خاصا دھندلا پڑ گیا ہے۔ نسلی تعیّن میں نظریات کے اختلاف کی جو مشکلات حائل ہیں ان سے قطع نظر ان مقامی گروہوں کے متعلّق جو صاف طور سے علٰیحدہ علٰیحدہ ہیں ایسی نسلیاتی معلومات بھی بہت قلیل ہیں جن میں ان کی تقسیم صاف صاف کی گئی ہو۔ یہ سب اسباب ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ اس باب میں جو کچھ بیان کیا جائے اس میں ہم پوری احتیاط سے کام لیں۔

(۱) افغانوں کے متعلق دیکھیے جداگانہ مادّہ ''افغان''۔

(۲) تاجیک افغانستان کے فارسی بولنے والے باشندوں کا عمومی نام ہے (قب مادۂ تاجیک)، جنھیں اکثر پارسی وان بھی کہتے ہیں یا جو مشرقی اور جنوبی حصّوں

میں دِہگان اور دِہُوار بھی کہلاتے ہیں۔ یہ دیہاتی لوگ ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر شہروں کے باشندے بھی فارسی بولتے ہیں۔ بعض دور افتادہ اقطاع کے سوا تاجیکوں کی کوئی قبائلی تنظیم نہیں۔ دیہات میں یہ لوگ پرامن مُزارع ہیں۔ ہرات اور سیستان میں ان کا سلسلہ براہِ راست ایران کے ایرانیوں سے ملتا ہے اور شمالی افغانستان میں (میمنہ سے بدخشاں تک) یہ لوگ روس کے تاجیکوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ جنوبی و مشرقی افغانستان میں تاجیک غزنہ کے اردگرد کے اضلاع اور خطۂ کابل (کوہ دامن، پنج شیر وغیرہ) کے نہایت زرخیز زرعی اقطاع میں آباد ہیں۔ نسلی اعتبار سے یہ لوگ نہایت مخلوط ہیں، لیکن بدخشاں کے پہاڑی تاجیک اور شمالی افغانستان کے تاجیک بالعموم نسلاً ''اَلپی'' نمونے کے ہیں۔ ہندوکش کے جنوب میں بسنے والے بہت سے تاجیک غالباً ایرانی افغانی نسل سے ہیں۔ بدخشان کے بعض کوہستانی تاجیکوں نے اپنی قدیم ایرانی زبانوں کو ابھی تک محفوظ رکھا ہے۔ یہی کیفیت شمالی کابل کے پَراچیوں اور وادی لُوگر [لُوغَر] کے اَزمُڑون کی ہے۔ قِزِلباش ایرانی ترکوں کی نسل سے ہیں، جنھیں نادرشاہ نے ہرات اور کابل میں آباد کیا تھا۔

(۳) ترکی اور منگولی قبائل: شمالی افغانستان کے میدانی علاقوں میں ترکی قبائل آبادی کا اہم بلکہ غالب عُنصُر ہیں۔ ان کی اکثریت اُزبک [رَک بآن] ہے، جو دیہات اور شہروں میں آباد ہیں۔ جارنگ (Jarring) نے ان کی تعداد کا اندازہ تقریباً پانچ لاکھ کیا ہے۔ ان کے مغرب میں اَندخُوئی اور بالا مُرغاب کے درمیان خانہ بدوش ترکمان [رَک بآن] رہتے ہیں، جو زیادہ تر اَرسَری ہیں، (تعداد کا اندازہ دو لاکھ نفوس ہے)۔ افغانی پامیر میں کوئی تیس ہزار قِرغِز [رَک بآن] خانہ بدوش ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے ترکی قبیلوں کے افراد بھی افغانستان میں پائے جاتے ہیں۔ کابل کی شمالی جانب کوہستان اور کوہ دامن میں جو ترک بستے ہیں وہ غالباً سب کے سب اب اپنی قومی زبان ترک کر چکے ہیں۔

غزنہ سے ہرات اور بامیان کے شمال سے وسط ہِلمَند تک کا کوہستانی علاقہ منگول قبائل یا مخلوط ترکی منگولی نسل اور وضع قطع کے قبائل سے آباد ہے، جو ایران میں بھی پھیلتے چلے گئے ہیں — اس علاقے کا مشرقی حِصّہ ہزارہ [رَک بآن] (یا بربری) قبائل کا گھر ہے۔ وہ متعدّد قبائل میں بٹے ہوئے ہیں، مثلاً دے کُندی، دے زنگی، جاغُر وغیرہ۔ ہزارہ لوگ دیہات میں آباد ہیں اور ان کے سردار، جو عہدِ سابق میں بہت طاقت ور تھے، اپنے امیرانہ قلعوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ شیعہ ہیں اور امیر عبدالرحمٰن کے عہد تک انھوں نے اپنی نیم آزادانہ حیثیت برقرار رکھی۔ مزید مغرب کی جانب ہری رُود کے دونوں طرف نیم خانہ بدوش سُنّی چَہار اَیماق [رَک بآن] (چار قبیلے) ملتے ہیں۔ یہ اصطلاح بظاہر قدرے بے احتیاطی سے بولی جاتی ہے، لیکن بالعموم اس کا اطلاق تیمُنی (ہری رود کے جنوب میں)، فیرُوز کُوہی (ہری رود کے شمال میں)، جَمشیدی (کُشک)، تیمُوری (ہرات کے مغرب کی طرف ایران میں) اور ہزاری (قلعۂ نو) قبائل پر ہوتا ہے۔ یہ ہزاری مشرق کے ہزارہ قبائل سے الگ ہیں اور انھیں ان کے ساتھ مُلتَبَس نہیں کرنا چاہیے۔ ہزارہ کو بسا اوقات چنگیز خان کے لشکریوں کی اولاد خیال کیا جاتا ہے۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ چنگیز خان اور اس کے جانشینوں نے جن علاقوں کو اجاڑ دیا تھا ان میں بتدریج زیادہ تر منگول اور کم تر ترک عناصر آ بسے (دیکھیے Bacon: وہی کتاب)۔

(۴) انڈوآریائی اور کافر: افغانستان کے انڈوآریائی ''دَرْدِی'' قبائل میں سب سے زیادہ اہم کوہستانِ کابل لَغمان اور کُنَڑ کی زیریں وادی کے پَشائی ہیں (ان کا مقامی نام دِہگان بھی ہے)۔ یہ لوگ کپیسا اور نگرہار کے قدیم ہندو اور بدھ باشندوں کی باقی ماندہ اولاد ہیں۔ کُنَڑ کے علاقے میں انڈوآریائی اصل کی کچھ اَور چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی موجود ہیں۔ نُورستان (سابقہ کافرستان) میں متعدّد قبائل آباد ہیں، جو لسانی اعتبار سے حقیقی انڈوآریائی لوگوں سے ممیّز ہیں (قب مادّۂ کافرستان)۔ ان قبائل کو امیر عبدالرحمٰن نے ۱۸۹۶ء میں قطعی طور پر مغلوب کر لیا اور مسلمان بنا لیا۔ دردی قبائل میں سے بعض لوگ نسبتۂ قریب زمانے تک لامذہب رہے۔ اب کافروں کو نورستانی یا جدیدی، یعنی نومسلم، کہا جاتا ہے۔ ان کا قدیم مذہب ہندوؤں کے نمونے کی اصنام پرستی تھا، جس میں ہر قبیلے کے دیوتا الگ تھے۔ ان کے ہاں بہت سی قدیم رسمیں بھی باقی رہ گئی تھیں۔ ان کے یونانی الاصل ہونے کے متعلّق (جیسا کہ بعض اوقات دعوٰی کیا جاتا ہے) کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ہمسائے انھیں دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: اول ''سیاہ پوش'' (کٹی اور کام) اور دوسرے سفید پوش (وائگلی، اَشکُن اور پَرشُون یا پَرُونی)۔ نسلی اعتبار سے کافر لوگ مشرقی دِنَری (Dinaric) اور نَورِدی (Nordic=قدیم شمالی) عناصر پر مشتمل ہیں۔ علاوہ بریں ان میں چھوٹی لمبوتری کھوپری والی نسل کے لوگ بھی ہیں، جن کا تعلّق مغربی ہمالیہ کے لوگوں سے ہے۔ بعض قبائل میں بھورے رنگ کے بالوں اور نیلی آنکھوں والے لوگوں کی تعداد خاصی ہے۔

افغانستان میں کچھ جٹ ''بنجارے'' (gipsies) [رَک بآن] اور کچھ گوجر [رَک بآن] بھی ہیں، جو وادی کُنَڑ میں آباد ہیں۔ ہندو کابل اور دوسرے شہروں میں تاجروں اور مہاجنوں کی طرح اور کوہ دامن میں باغبانوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

(۳) زبانیں

بابر نے لکھا ہے کہ کابل کے خطّے میں گیارہ زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن پورے ملک میں بولی جانے والی بولیوں کی واقعی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ باشندوں کی اکثریت پشتو یا فارسی بولتی ہے۔ یہ دونوں زبانیں ایرانی الاصل ہیں۔ پشتو کے لیے دیکھیے مادّۂ افغان۔

دیگر ایرانی زبانیں: ان فارسی بولیوں میں جو افغانستان میں رائج ہیں، زیادہ تر مشرقی نمونے کی ہیں [رَک بہ نیز مادۂ ایران، حِصّۂ زبان]، جنھوں نے یای مجہول، واو مجہول اور یای معروف، واو معروف کا فرق قائم رکھا ہے۔ ہرات کے

علاقے میں یہ بولیاں مغربی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور ہزارہ کی بولی اپنی امتیازی خصوصیات رکھتی ہے۔ بلوچی سرحد کو عبور کر کے صرف جنوبی صحراؤں تک پہنچتی ہے۔ کابل کے جنوب میں وادی لوگر (لُوغَر) کے اندر آرمڑی ختم ہو رہی ہے، لیکن وزیرستان کے علاقۂ کانی گُرام میں ابھی تک بولی جاتی ہے۔ ایک اَور قدیم مقامی ایرانی زبان پَراچی ہے، جو شمال کابل کے چند ایک دیہات میں پائی جاتی ہے۔ ہندوکُش کے شمال میں بدخشان کے پہاڑوں میں نام نہاد پامیری یا غَلْچہ زبانیں تاحال باقی ہیں، لیکن ان کا استعمال غالباً روز بروز کم ہو رہا ہے اور ان کی جگہ بتدریج تاجیکی فارسی لے رہی ہے۔ ان میں مندرجۂ ذیل شامل ہیں: مُنْجی، جو مُنْجُد ان میں بولی جاتی ہے (اس کی ایک شاخ ـ یَدْغہ ـ چترال میں ہے)؛ وَخی، جو وَخان کی نہایت قدیم زبان ہے (اور اپنے علاقے سے باہر نکل کر گلگت اور چترال میں بھی پہنچ گئی ہے)؛ سَنْگلیچی؛ زِیبا کی اور اِشکاشمی دریاے جیحون کے موڑ پر، نیز وَرْدُوج کی بالائی وادی میں؛ شُغْنی اور رُوشانی، اِشکاشم کے شمال کی جانب جیحون کی وادی میں۔

انڈو آریائی اور کافر زبانیں: لَہندا زبان کے علاوہ، جسے ہندو بولتے ہیں، شمالی و مشرقی افغانستان میں نورستان کی سرحدوں پر متعدّد انڈو آریائی زبانیں اور بولیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ سب انڈو آریائی زبانوں کی نام نہاد دَرْدِی شاخ سے تعلّق رکھتی ہیں۔ ان میں ممتاز ترین پَشَئی ہے، جو متعدّد اور نہایت مختلف بولیوں پر مشتمل ہے نیز لوک گیتوں سے مالا مال ہے۔ وادی کُنَڑ میں چترال کی سرحد کے قریب گاوَرْباتی بولی جاتی ہے، کافری زبانیں (کَتی وائِگلی، اَشْکُن اور پَراسُون) قدرے جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں اور ضرور ویدوں سے پیشتر کے زمانے میں انڈو آریائی زبان سے الگ ہوگئی ہوں گی، لیکن ان زبانوں پر اب بڑی حد تک خالص انڈو آریائی عناصر کی بھاری تہیں چڑھ چکی ہیں۔

غیر انڈو آریائی زبانیں: شمالی افغانستان کے اُزْبک ترکمان اور قِزِلْ غِزتر کی بولیاں بولتے ہیں، ہزارہ کی اکثریت اپنی زبان ترک کر چکی ہے اور غالباً چہار اَیْماق کا بھی یہی حال ہے؛ تاہم ایک نجی مراسلت کے مطابق میکنزی (F. Mackenzie) ۱۹۵۱ء، میں بھی بِیْسُود کے ہزارہ اور شمال مَیْمنہ کے منگولوں کے ہاں ایسے رائج الفاظ کی فہرست تیار کر سکا جن کی اصل منگولی ہے۔ مزار شریف کے مغرب کے بعض خانہ بدوش قبائل کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ابھی تک عربی بولتے ہیں۔ تاجیکستان کے بعض عربوں کا بھی یہی حال ہے [دیکھیے مادّۂ عرب]۔

(۴) مذہب

قبولِ اسلام کے وقت سے افغانستان کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ بہت بڑی اکثریت سنّیوں کی ہے۔ ہزارہ، قزلباش، سیستان و ہرات کے کَیانی، چند ایک سرحدی پٹھان قبائل (تُوری خیل اور تیراہ کے سیّدوں کے علاوہ اوْرَک زئیوں اور بَنگَش کی بعض شاخیں)، کچھ کوہستانی اور بدخشی (خاص کر غَلْچہ) شیعہ ہیں۔ ان میں سے بدخشاں کے باشندے (شُغْنان اور وَخان وغیرہ سمیت) اور لَغْمان نیز نواحِ وادیوں کے بہت سے پَشَئی اسمٰعیلی ہیں۔ بدخشی اپنے کو مُلّائی کہتے ہیں اور پَشَئی علی اللّٰہی کہلاتے ہیں (قب ایوانوف (Ivanow): *Guide to Ism.*، *Lit.*، ص ۹)۔

راسخ العقیدہ اسلام افغانستان میں بہت مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہو چکا ہے اور اسلامی شریعت کو مانا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور شیعوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا جاتا ہے، لیکن احمدیوں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ عیسائی تبلیغی جماعتوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے، مقامی اولیا اور ان کے مزارات [کی تعظیم میں اکثر حد سے تجاوز کیا جاتا ہے]۔ سرحد کے پٹھان قبائل میں ملّاؤں نے مقامی سیاست اور جہاد کی تلقین میں بسا اوقات بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۵) تاریخ

(۱) زمانۂ قبل از اسلام: ان علاقوں میں جو اب افغانستان کہلاتے ہیں پہلے اور دوسرے ہزار سالہ دور ق۔م میں، جب آریائی اقوام کی نقل مکانی جاری تھی، ایرانی قبائل بستے تھے، جنھیں کوروش (سائرس، خورس، خسرو) نے [چھٹی صدی قبل مسیح میں] ہخامنشی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سکندرِ اعظم کی فتوحات [۳۳۰ق۔م تا ۳۲۳ق۔م] کے بعد (قب W. W. Tarn: *Alexander the Great*، کیمبرج ۱۹۴۸ء) یہ علاقے یونانی باختریوں اور پارتھیوں کے درمیان موجبِ نزاع بنے رہے (قب W. W. Tarn: *The Greeks in Bactria and India*، کیمبرج ۱۹۵۲ء)۔ پہلی صدی قبل مسیح میں یوہے چی (یوچی Yueh-chi) قوم کے قبیلۂ کوشان (Kushan) کے زیرِ قیادت ایرانی قبائل کی ایک نئی رَو ان اقطاع میں داخل ہوئی۔ کوشانی سلطنت، جس کی ترقی پہلی صدی عیسوی میں کوزولو (کُجولو) کدفیزس (Kujula kadphises) کے زیرِ قیادت اور دوسری صدی عیسوی میں کَنِشْک کے زیرِ عَلَم معراجِ کمال کو پہنچی (قب *Cambridge History of India*، ج ۱، ۱۹۳۵ء؛ R. Ghirshman: *Bēgram. Recherches archéologiques et historiques sur les Kouchans*، قاہرہ ۱۹۴۶ء)، بالآخر غالباً چوتھی صدی عیسوی کے وسط سے پہلے شاپور ثانی کے عہد میں ساسانیوں سے مغلوب ہوگئی۔ ۳۵۰ء کے بعد جلد ہی یوہے چی (یوچی) قبائل پر، جو کاشگریہ [کاشغر] میں رہ گئے تھے، مشرقی جانب سے ترکی اور منگولی عناصر کا دباؤ پڑا تو وہ باختریہ میں نمودار ہوے۔ ان کے مددگاروں میں اس نسل کے دوسرے قبائل کی متحدہ جمعیت بھی شامل تھی، جنھیں چیونی (Chionites) کہا جاتا ہے (دیکھیے R. Ghirshman: *Les Chionites - Hephtalites*، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ص ۶۹ ببعد)؛ اگرچہ شاپور رومیوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا، تاہم وہ لشکر لے کر ان حملہ آوروں کے مقابلے پر آیا، مگر صلح پر مجبور ہوگیا۔ انھیں باختریہ اور نواحی علاقوں میں آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی اور شرط یہ ٹھیری کہ وہ رومیوں کے مقابلے میں مدد دیں۔

یوہے چی یا ''کوشانی ہائے خرد'' کے بادشاہ کیدارا (Kidara) نے جلد ہی فتوحات کا دائرہ کوہستان ہندوکُش کے جنوب تک بڑھا کر پاروپامی سد (Paropamisad) [کابل وغزنین] اور گندھارا [سوات وپشاور کا علاقہ] کو اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ غزنین کے علاقے میں چیونیوں کے ایک قبیلے زابل کا آباد ہونا توسیع مملکت کے اسی دَور کا واقعہ قرار دینا چاہیے۔ بعدازاں جب کیدارا نے آزادی کا حق منوانے کی کوشش کی اور نتیجے میں شاپور سے ازسرِنو تصادم کی نوبت آئی تو چیونی قبائل نے شاپور کا ساتھ دیا۔ کیدارا کی مملکت بھی چھن گئی اور غالباً اس کی جان بھی گئی۔ باختریہ چیونیوں کے قبضے میں آ گیا، جو اپنے حکمران خاندان کے نام پر یفتلی (Hephtalites) [ہیاطلہ] کے نام سے معروف ہوے۔ ۴۰۰ء کے قریب کوہ ہندوکش کے شمال وجنوب کی سرزمین چیونی یفتلیوں کے قبضے میں تھی، جنھیں ہندوکُش کے سلسلۂ کوہستان نے دوشاخوں میں تقسیم کررکھا تھا، مگر جنوبی، یعنی قبیلۂ زابل کی شاخ، شمالی شاخ کی برتری کو تسلیم کرتی تھی اور دونوں ریاستیں ایرانی ساسانیوں کی باج گزار تھیں۔ ایران کا شاہی خاندان جب تک طاقت وراور مضبوط رہا باج گزاری کی یہ کیفیت قائم رہی، لیکن پانچویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں جب یفتلیوں نے دیکھا کہ ایران کے لیے رومیوں کے خلاف رزم و پیکار اور وحشی قبائل کے مقابلے میں کوہ قاف کے دروں کی حفاظت مشکلات کا باعث ہورہی ہے تو وہ ایرانی اقتدار کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے، مگر انجام کار بہرام گور نے دوبارہ انھیں مغلوب کرلیا؛ ادھر گپتا خاندان کے راجاؤں نے ہندوستان کی سرزمین میں ان کا اقدام روک دیا تھا۔

پانچویں صدی عیسوی کا وسط ایرانیوں اور یفتلیوں [ہیاطلہ] کے باہمی تعلّقات میں انقلاب کا وقت تھا، فیروز کے عہد (۴۸۴ء) میں یفتلیوں نے ایرانیوں پر فتح پائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یفتلی باج گزار رہنے کے بجاے ایرانیوں کے حاکم بن گئے اور ساسانی بادشاہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک یفتلیوں کو خراج دیتے رہے۔ آخر ۵۶۰ء کے قریب وسط ایشیا کی سیاسی بساط پر ایک نئی قوم نمودار ہوئی، یعنی مغربی ترک۔ ان کے اور خسرو اوّل (نوشیرواں) بادشاہ ایران کے اتّحاد نے یفتلیوں کی مرکزی سلطنت کا خاتمہ کردیا (ساسانیوں کے ساتھ ان کے تعلقات کا حال جاننے کے لیے قب A. Christensen: *L'Iran sous les Sassanides*، طبع ثانی، ۱۹۴۴ء)۔

زابلی بادشاہی، یعنی جنوبی چیونیوں کی مملکت اپنے ہنجار پر قائم رہی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہندوکُش کی جنوبی جانب ایک نیا خاندان برسرِ حکومت تھا۔ اس کے دو بادشاہوں تورامانا (Toramana) اور مے ہیراکولا (مہرگل Mihiracula) نے ہندوستان میں وسیع فتوحات حاصل کیں (۵۱۵-۵۴۴ء)۔ مؤخّر الذکر (مہرگل) نے، جو سورج دیوتا مہرہ کا پرستار تھا، ظالمانہ داروگیر کی نہایت ہی تلخ یاد پیچھے چھوڑی۔ ظلم وستم اس وقت تک جاری رہا جب تک ہندوستان کے ایک قومی وفاق نے اس کا سر نہیں کچل دیا۔ جنوبی چیونیوں کی بادشاہی کا خاتمہ شمالی اقطاع میں یفتلیوں کے اقتدار کی تباہی سے چند سال پہلے ہوچکا تھا۔

ان دوسلطنتوں کی تباہی کے بعد ان کے علاقے چھوٹے چھوٹے امرا کے قبضے میں رہے، جن میں سے بعض ساسانیانِ ایران کے باج گزار تھے اور بعض ترکوں کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں مشرقی افغانستان کی سیاسی کیفیات کا نقشہ چینی سیّاح ہیون سانگ (Hioun-Tsang) کے سفرنامے میں کھینچا گیا ہے۔ ایک تاریخی ماخذ میں افغان قوم کا یہ اوّلین ذکر ہے، یعنی ہیون سانگ نے ان اقطاع کو جو کوہ سلیمان کے شمال میں واقع ہیں ''اے پئو، کین'' کا ملک قرار دیا ہے (دیکھیے A. Foucher: *La vieille route de l'Inde de Bactres à Taxila*، پیرس ۱۹۴۷ء، ۲:۲۳۵، ۲۵۲، حاشیہ ۱۷)۔

ہیون سانگ کی سیاحت کے کچھ عرصہ بعد چین کے شاہی خاندان تنانگ (T'ang) نے مغربی ترکوں کا قلع قمع کردیا اور اپنا اقتدار پامیر کے مغربی علاقے تک قائم کرلیا۔ تقریباً سو سال تک (۶۵۹-۷۵۱ء) ہندوکش کے شمال اور جنوب کی سولہ بادشاہیاں چینیوں کی بالادستی تسلیم کرتی رہیں، جو حقیقی کی بجاے زیادہ تر برائے نام تھی۔ عرب فاتحین کو، جنھوں نے بڑی تیزی سے ایران کی ساری مملکت سر کرلی تھی، افغانستان کے ان حصّوں کے آخری چھوٹے چھوٹے فرمانرواؤں کی طرف سے شدید اور مسلسل مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ کہیں نویں صدی عیسوی کے اواخر میں جا کر کوہ ہندوکش کی جنوبی جانب مسلمان پوری طرح کامیاب ہوے۔ بایں ہمہ یفتلی موجودہ افغانستان کی نسلی ہیئت ترکیبی میں اپنے آثار چھوڑے بغیر ناپید نہ ہوے۔ بدخشاں میں آبادی کا ایک بڑا گروہ اب بھی یفتل (ہیطل) کے نام سے موجود ہے۔ ابتدائی زمانے کے تاریخی پسِ منظر کے لیے قب W. M. McGovern: *The Early Empires of Central Asia*، ۱۹۳۹ء۔

(R. CHIRSHMAN)

افغانستان میں ظہور اسلام

ساتویں صدی عیسوی میں، جب آفتاب اسلام افقِ بطحا سے طلوع ہورہا تھا، مملکتِ افغانستان دو سیاستوں اور دو مذہبوں سے متأثر تھی: مغربی حصّے، یعنی سجستان (سیستان)، ہرات اور اس کے ملحقات پر ایرانی ساسانیوں کا سیاسی، ادبی اور مذہبی اقتدار قائم تھا، جن کا مذہب زردشتی تھا اور زبان پہلوی؛ مشرقی حصّے، یعنی وادی دریاے کابل (گندھارا) میں کابل سے قندھار تک بُدھ اور برہمنی مذاہب رائج تھے۔ مشہور چینی سیّاحوں، ہیون سانگ (Hioun Tsang، ۶۳۰ء) اور وانگ ہیون سی (Wang Hioun Tse، ۶۵۷ء) کی سیاحت کے وقت ولایاتِ گندھارا (وادی دریاے کابل)، لمپا (لغمان) اور نگرہارا (ننگرہار) آریائی کشتری خاندان کے کابلشاہوں کے زیرِ اقتدار تھیں۔ ان کا مرکز کاپِیسا (موجودہ بگرام، کابل کے شمال میں) تھا۔ انھیں اسلامی مؤرّخین نے رِتبیل، زنبیل اور زنتبیل لکھا ہے (تازہ ترین تحقیقات کے مطابق یہ دراصل زندہ پیل،

یعنی فارسی کا ژندہ پیل، بمعنی فیل ژِیاں، تھا۔ قبؔ فردوسی: بہ تن ژندہ پیل و بہ جاں جبرئیل — دوسری صورتیں اسی کی تصحیف ہیں)۔ ان کشتری راجاؤں کی حکومت ٹیکسلا اور ویہنڈ (موجودہ ہَنڈ، علاقۂ صوابی میں)، یعنی دریاے اٹک کے مغربی کنارے سے کابل، رُخَّج، بُست اور سیستان تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے القاب تَگِین اور تَجِن تھے۔ اس سلسلے کا بانی بُرہاتگین تھا اور آخری حکمران لکہ تُورمَن (پشتو میں بمعنی شمشیرزن)۔

اس خاندان کے علاوہ بعض مقامی امرا و رؤسا کا اقتدار پہاڑی درّوں میں قائم تھا۔ یہ خاندان کُوشانُو یفتلی کے بچے کھچے افراد تھے، مثلاً مَرو میں ماہوی، بامیان میں شِیرہ، سَرَخس میں راذْوَیہ، غرجستان (سِرِ پُل اور بادغیس کے درمیانی علاقے) میں شار یا بَرازبَندہ، سجستان میں فِیرُوز، فُوشَنج اور ہرات میں رازان، بادِغیس میں نیزک خان، طخارستان (موجودہ قَطْغَن) میں یَبْغُو اور علاقۂ سُور وغُور میں جہان پہلوان۔ مقامی بادشاہوں کے جس آخری سلسلے نے عربوں کا مقابلہ کیا وہ برہمن شاہوں یا رایانِ کابلی کا خاندان تھا۔ یہ خاندان پہلے وزارت کے مرتبے پر فائز تھا اور اس کی بنیاد ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں کَلّر (Kallar) (نیز موسوم بہ لَلِیَّہ (Lalliya)) نے ڈالی۔ البیرونی کے ہاں رایانِ کابلی میں سے حسبِ ذیل کے نام ملتے ہیں: سامَنْدَ (سامَنْتَہ دِیوَہ)، کَمَلُو (کَمْرَہ؟)، بھیم (بھیمَہ دِیوَہ)، جے پال (جَیَہ پالَہ)، اَنَنْدَ پال (اَنَنْدَہ پالَہ)، تَرَوْجَن پال (ترلوچَنْ پالہ)۔ علاوہ ازیں چار اور حکمرانوں کے نام کا پتا مشرقی افغانستان اور پنجاب سے دستیاب شدہ سکّوں سے چلا ہے، یعنی سَپالَہ پَتی۔ پَدَمَہ، خُودُووَیَکَہ (Khuduwayaka) (؟) اور وَنْکَہ دِیوَہ۔ یہ خاندان ورودِ اسلام سے ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء تک موجود رہا۔ جب افغانستان کے مشرقی حصّوں پر اسلامی لشکر کا قبضہ ہو گیا تو اس کا دارالحکومت گردیز اور کابل سے اوہنڈ (ویہنڈ) میں منتقل ہو گیا۔

اس طرح ظہورِ اسلام کے وقت سلطنت افغانستان قبائلی حکمرانوں میں منقسم تھی اور یہاں پشتو، پہلوی، مغولی نیز سنسکرت کی پراکرتیں رائج تھیں۔ مغرب میں زردشتی مذہب کے پیرو تھے اور مشرق میں بدھ مت، برہمنی دھرم اور شِومت کے نام لیوا۔ گویا یہاں یونانی، ہندی، مغل اور ایرانی عناصر کا ایک مخلوط تمدّن ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

عہد فاروقی: ابھی نیرِّ اسلام کو طلوع ہوے زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں عربوں کے جہاں گیر لشکر نے ایران میں ساسانیوں کی قدیم بادشاہی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ان کے آخری شہنشاہ یزدگرد نے جَلُولا اور نِہاوَند کی لڑائیوں میں شکست کھانے کے بعد خراسان اور بلخ کی طرف راہِ فرار اختیار کی اور جب اسے ماوراءالنہر کے خاقان سے کوئی مدد نہ ملی تو مرو کے علاقے میں ماہوی سُوری کے ہاں پناہ لی، جو افغانستان کے غربی حصّوں اور غور کا حاکم تھا اور بقول فردوسی و الطبری خراسان کا فرمان روا سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے احنف بن قیس نے یزدگرد کا تعاقب کیا اور بغیر جنگ کیے خراسان فتح کر لیا۔ چونکہ ماہوی سوری، حکمرانانِ ماوراءالنہر کے ساتھ یزدگرد کے تعلّقات سے خائف تھا، لہٰذا اُسے ایک پن چکّی والے کے ہاتھوں مروا دیا (۳۱ھ/ ۶۵۱ء) اور بقولِ فردوسی اپنی حکومت بلخ، ہرات اور بخارا تک وسیع کر لی۔ اَحْنَف نے ماہوی کو بھی خراسان اور مرو میں شکست دے کر جیحون پار کے علاقے تک پیچھے ہٹا دیا اور آخر عمر تک خلافت کی طرف سے خراسان کا عامل رہا، جس کی مشرقی سرحد مرو الرّود سے چار فرسنگ کے فاصلے پر تھی۔

اُدھر جنوب میں بھی عبداللہ بن بُدیل خزاعی کے زیرِ قیادت عربوں کا ایک لشکر خراسان کے دروازوں — طَبَسَیْن (قلعۂ طَبَس اور قلعۂ کَرِین) — تک پہنچ چکا تھا۔ یہ علاقے افغانستان کی موجودہ مغربی سرحد، یعنی گرم سیر سے متّصل ہیں۔

۲۲-۲۳ھ میں عبداللہ بن عامر نے کرمان کی فتح کے بعد سجستان (سیستان) پر حملہ کر دیا، جہاں کا مرزبان (حاکم) زَرَنگ (عربی: زَرَنج) میں قلعہ بند ہو گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسلامی لشکر قندہار بلکہ سندھ کی حدود تک پہنچ چکا ہے تو زَرَنگ مسلمانوں کے حوالے کر کے صلح کر لی۔

ایک اَور اسلامی لشکر سیستان سے مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ارغنداب میں زنتبیل کے لشکر نے مقابلہ کیا اور زنتبیل مارا گیا (۲۴ھ/ ۶۴۴ء)۔ البلاذُری نے ہیاطلہ کے نام سے اس کی مملکت کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ وہ ہرات تک پھیلی ہوئی تھی۔

عہد عثمانی (۲۵-۳۵ھ): عہد عثمانی میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اور بڑھا۔ عبداللہ بن عامر نے شدید محاصرے اور جنگ کے بعد کابل فتح کر لیا، لیکن جب عربوں کا لشکر واپس ہوا تو وہاں مزید پانچ سال کے لیے مقامی فرمانرواؤں کی حکومت قائم ہو گئی۔ حضرت عثمانؓ نے اَحْنَف بن قیس کو مرو و ہرات میں، خُبیب بن قُرّہ الیربوعی کو بلخ و طخارستان میں اور عبداللہ بن عمیر لیثی کو سیستان میں حاکم مقرر کیا۔ ان دنوں افغانستان میں بغاوت برپا ہو گئی؛ چنانچہ حاکمِ سیستان نے باغیوں کو شکست دے کر کابل کو مسخّر کر لیا، مشاجح بن مسعود، حاکمِ کِرمان، نے قبائل قَفْص (= کُوچ = کفچ = موجودہ قَبیلَہ کوچی اور علاقۂ گرم سیر — جنوبی افغانستان — کے بلوچ) کو خون ریز لڑائی کے بعد مطیع کیا، اَحْنَف بن قیس نے ۳۲ھ/ ۶۵۲ء تک بلخ اور طخارستان کو سَنْگان تک باغیوں سے صاف کر دیا اور ایک عرصے تک افغانستان کے شمالی صوبوں بلخ، مرو الرّود، گوزگان اور تالقان میں جنگ جاری رکھی۔ اسی سال اس کا مقابلہ مرو الرّود کے مقامی فرمانروا بازان سے ہوا، جس کے ساتھ تیس ہزار فوج تھی اور اسے شکست فاش دی۔ خالد بن عبداللہ نے ہرات، بادغیس، غور اور خراسان پر قبضہ کر لیا۔ سرخس کے مقامی حاکم راذْوَیہ نے جزیہ ادا کرنا قبول کیا اور صلح کر لی۔ ۳۲ھ/ ۶۵۳ء ہی میں قارن ہراتی چالیس ہزار لشکر لے کر عربوں کے خلاف صف آرا ہوا، لیکن عبداللہ بن خازم، حاکم نیشاپور، نے زبردست لڑائیوں کے بعد اسے کچل کر رکھ دیا۔

۳۰ھ/ ۶۵۰ء کے لگ بھگ ربیع بن زیاد سیستان میں آیا اور پَہْرَہ (فَہْرَج)

اور زالق (جالق) کو فتح کرلیا۔ پھر ہلمند سے گزر کر وہ زُوشت میں پہنچا، جو زرنج (دارالحکومت سجستان یا سیستان) سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سخت لڑائی کے بعد سیستان کے دہقان یا مرزبان (حاکم) اَپَرْ وِیْز (ایران بن رستم) نے مصالحت چاہی اور زرنج مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ بعدازاں ربیع سنارُود اور قرنین پر قبضہ کر کے خواش (خاشرُود) اور بُست تک پہنچ گیا۔ سیستان سے ربیع کی مراجعت کے بعد سیستانیوں نے شورش برپا کر کے اس کے نائب کو زرنج سے نکال دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اب ایک برگزیدہ صحابی عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کو حسن بصریؒ اور متعدد فقہا کی معیت میں زَرنج بھیجا، جس کا انھوں نے ۳۳ھ/ ۶۵۳ء میں محاصرہ کرلیا۔ اَپَرْ وِیز نے اطاعت قبول کی، بیس لاکھ درہم اور دو ہزار غلام دینا قبول کیا اور فقہا کی مدد سے اسلام کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہوگیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی اطلاع ملنے پر عبدالرحمٰنؓ نے امیر بن احمر کو زرنج میں اپنا قائم مقام بنایا اور بصرے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کی غیر حاضری میں اہلِ سیستان نے پھر بغاوت کردی اور امیر کو وہاں سے نکال دیا۔

عہدِ مرتضویؓ (۳۵-۴۰ھ): حضرت علیؓ نے عبدالرحمٰن بن جَزْ ءِ الطّائی کو سیستان کا حاکم مقرر کیا (۳۶ھ/ ۶۵۶ء)، لیکن وہ حَنَکَہ بن عَتّاب سے لڑتا ہوا ہلاک ہوگیا۔ اب عبداللہ بن عباسؓ حاکم بصرہ، نے ربعی بن کاس عنبری کو چار ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔ ابن عتاب مارا گیا اور سیستان ربعی کے زیر اقتدار آ گیا۔

۳۸ھ/ ۶۵۸ء میں ثاغیر بن دعور اور حارث ابن مُرّہ کے زیرِ قیادت اسلامی لشکر سیستان سے نکلا اور قیعان (موجودہ قلات) تک بڑھتا چلا گیا، جہاں بیس ہزار قیعانیوں نے پُرزور مدافعت کی۔ خون ریز لڑائی اور طویل محاصرے کے بعد مسلمانوں نے ان کے ہزارہا افراد گرفتار کر کے انھیں منتشر کر دیا، لیکن اس لڑائی میں حارث شہید ہوگئے۔

۳۹ھ/ ۶۵۹ء میں حضرت علیؓ نے زیاد کو خراسان بھیجا اور اس نے وہاں امن وسکون قائم کیا۔ اسی زمانے میں مرو کا حاکم ماہویہ کوفے چلا گیا۔ اس نے مرو کے زمینداروں اور نمبرداروں کو اسلامی طریق پر جزیہ دینے کی ترغیب دی تھی، جس پر لوگوں نے شورش برپا کردی۔ اسے فرو کرنے کے لیے جَعْدَہ مخزومی کو بھیجا گیا۔

عہد اموی (۴۱-۱۳۲ھ): ۴۰ھ/ ۶۶۰ء میں امیر معاویہؓ نے خراسان کی طرف لشکر روانہ کیا۔ شمال میں قیس بن الہیثم السُلَمی باذغیس اور فوشنج (ہرات سے جنوب مغرب میں) کو فتح کر کے بلخ پہنچا اور عبادت خانۂ نوبہار کو تباہ و برباد کیا۔ اس کے نائب، عطا نے بلخ کے دریاؤں پر پل باندھے، جو اب تک اس کے نام سے منسوب چلے آتے ہیں۔ ۴۵ھ/ ۶۶۵ء تک عبداللہ بن خازم بلخ میں، امیر بن احمد مرو میں، قیس بن الہیثم طالقان، فاریاب اور مروالرّوذ میں اور حکم بن عمرو الغفّاری خراسان کے دوسرے حصّوں میں امارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۵۱ھ/ ۶۷۱ء میں ربیع بن زیاد حارثی، حاکمِ خراسان، نے دریاے آمُو کے اِس پار (بائیں جانب) پچاس ہزار عربوں کو بسایا۔ سعید بن عثمان کے عہدِ امارت میں پہلی بار آمُو کے اس پار (دائیں جانب) عربوں کا لشکر پہنچا۔ یزید بن معاویہؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے خراسان کے امیر مہلب کے خلاف بغاوت کر دی، چنانچہ مرو، طالقان اور گوزگان میں سلیمان بن یزید کو اور خراسان کے دوسرے حصّوں میں عبداللہ بن خازم کو عہدۂ امارت پر فائز کیا گیا، لیکن اس اثنا میں عرب سرداروں کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ عبداللہ نے ہرات میں بنی ربعہ اور بنی تمیم کا محاصرہ کرلیا اور ایک سال کی خون ریز جنگ کے بعد، جس میں آٹھ ہزار افراد ہلاک ہوے، ہرات پر قبضہ کر کے اسے اپنے بیٹے موسیٰ کے حوالے کر دیا (۶۴ھ/ ۶۸۳ء کے بعد)۔ ۷۵ھ/ ۶۹۴ء میں ایک شخص وکیل نامی عبداللہ بن خازم کو قتل کر کے خراسان پر قابض ہوگیا۔ ۷۹ھ/ ۶۹۸ء میں عراق و خراسان کے عامل حجاج نے یہ ملک مہلب کے سپرد کر دیا، جو مروالرود سے بڑھ کر رودِ بلخ تک اور وہاں سے دریاے آمو کو عبور کر کے علاقۂ ماوراء النہر میں دو برس مصروفِ جنگ رہا۔ ۸۵ھ/ ۷۰۴ء میں مہلب کے بھائی مُفَضّل بن ابی صفرہ نے باذغیس فتح کیا۔ ۸۶ھ/ ۷۰۵ء میں مشہور فاتح قتیبہ بن مسلم کو حجاج کی سفارش پر عبدالملک نے خراسان کا حاکم بنا دیا۔ قتیبہ نے بلخ، طالقان اور طخارستان فتح کیے، پھر ماوراء النہر میں فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا (حدود ۸۹ھ/ ۷۰۸ء)۔ اس نے طخارستان کی آخری حدود تک خراسان کے تمام مخالف عناصر کو کچل ڈالا۔ شمالی افغانستان میں جن لوگوں نے مقابلہ کیا ان میں سے یَزْدَک باذغیسی بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ وہ جَغْجُوْیہ کی طرف سے طخارستان کا حاکم تھا اور ایک عرصے تک ماوراء النہر میں قتیبہ کا ہم رکاب رہا تھا۔ جب وہ نوبہار (بلخ) پہنچا تو خودمختاری کا اعلان کر دیا اور بلخ، مروالرود، طالقان، فاریاب (موجودہ شمالی یَمْگَنہ) اور گوزگان (موجودہ سرپل) کے باشندوں کو اپنے ساتھ شریک کر لینے کے علاوہ کابلشاہ سے بھی امداد کا وعدہ حاصل کرلیا۔ قتیبہ نے بلخ سے طخارستان پر حملہ کیا۔ طالقان میں مقابلہ ہوا، جس میں یَزْدَک نے شکست فاش کھائی اور قتیبہ چارفرسخ تک یَزْدَک کے ساتھیوں کو پھانسی پر لٹکاتا چلا گیا۔ یَزْدَک اپنے صدر مقام بغلان میں چلا آیا۔ قتیبہ نے سمنگان پر قبضہ کرنے کے بعد دو ماہ تک یزدک کو محصور کیے رکھا۔ آخر ایک شخص اس باغی کو پناہ دلانے کی امید پر لایا؛ قتیبہ نے غدّاروں اور باغیوں کو عبرت دلانے کے لیے اسے اس کے سات سو ہم راہیوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس کی بغاوت میں خدا جانے کتنے مسلمان خونِ شہادت میں لوٹے تھے۔ اس طرح شمالی افغانستان کا موجودہ علاقہ تمام غلّ وغش سے پاک ہوگیا (۹۱ھ/ ۷۰۹ء)۔ چند برس بعد مرکزی حکومت سے قتیبہ کا اختلاف ہوگیا؛ چنانچہ اس نے خراسان میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور ۹۶ھ/ ۷۱۴ء میں طویل جدوجہد کے بعد اموی خلیفہ ولید نے اپنے سپہ سالار قُتَیبہ کے ذریعے اس کا خاتمہ کرا دیا۔ قتیبہ کے بعد کوئی قابلِ ذکر واقعہ اس حصّے میں خاصے عرصے تک رونما نہ ہوا، البتہ بعض لوگ بنوامیہ کے مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ خلافت بنی ہاشم کے قبضے میں آ جائے۔ بنوہاشم اور بنوامیہ کی باہمی مخالفت ہی کے باعث حضرت علیؓ کی اولاد میں سے یحییٰ بن زید عازمِ بلخ ہوے، جہاں کے حاکم عقیل بن مفضل نے

انھیں گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا۔ ہشام اموی کی وفات (۱۰۵ھ/ ۷۲۳ء) کے بعد نئے خلیفہ ولید بن یزید نے ان کی رہائی کا حکم دیا، لیکن چند ہی روز بعد یحییٰ اپنے سات سو رفقا کے ساتھ بنوامیّہ کے کارندوں کے قابو میں آ گئے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی، جس میں یحییٰ شہید ہو گئے۔ اس زمانے کا دوسرا اہم واقعہ غور و غرجستان پر اسد بن عبداللہ، حاکم خراسان، کی پیش قدمی ہے۔ اسد نے وہاں کی شورشیں فرو کیں اور غرجستان کے مقامی حاکم نمرون کو مشرف بہ اسلام کیا (۱۰۷ھ/ ۷۲۵ء)۔

اب جنوبی افغانستان کی طرف آیئے۔ ۴۳ھ/ ۶۶۳ء میں امیر معاویہؓ نے عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کو سیستان کا حاکم بنا کر بھیجا تھا۔ انھوں نے ۴۴ھ/ ۶۶۴ء تک وہاں کی شورشیں کچلنے کے علاوہ بُست، کَش (مضافاتِ ہلمند)، زمین داور اور رُخّج کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ کوہِ زور کے عبادت خانے میں (دیکھیے مادّۂ سوری) ایک بہت بڑا طلائی بت پاش پاش کر کے زابل اور وادی ترنک سے ہوتے ہوئے پہلے غزنہ، پھر کابل پہنچ گئے۔ ۴۴ھ/ ۶۶۴ء میں منجنیقوں کی مدد سے کابل فتح کر لیا گیا۔ اس فتح کے دوران میں ایک بڑے فاضل صحابی ابورفاعہ عَدَوی تمیمؓ بن اسید (الأصابة، ۱۰:۱۸۵) نے اور بروایت دیگر ابوقتادہ العَدَویؓ نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کا مزار اب تک کابل میں مشہور ہے۔ اسی سال ابن سمرہ کے حکم سے مہلّب بن ابی صفرہ ایک لشکر لے کر درّۂ خیبر کے راستے پشاور کی طرف بڑھا اور کابلشاہ کو شکست دی، جس کے پاس سات ''ژندہ پیل'' اور ہر ''ژندہ پیل'' کے ساتھ چار ہزار سوار تھے۔ اس کے بعد مہلب نے دریاے سندھ عبور کیا اور لاہور و ملتان ہوتا ہوا قندابیل (گندھاپھل۔ حدودِ قلّات میں قصدار سے پانچ فرسخ شمال مشرق میں) کو فتح کر کے بہت سا مالِ غنیمت لے کر واپس ہوا۔ ۴۷ھ/ ۶۶۷ء میں ربیع الحارثی، والیِ سیستان، نے بُست اور رُخّج (رُخَد) پر حملہ کیا اور زنتبیل کو ہندوستان کی طرف بھگا دیا۔ ربیع نے زابلستان، وادی ارغنداب اور سیستان میں خراج، محاسبہ اور استیفاء (وصولی مواجباتِ سرکار) کے دفاتر کھولے اور حسن بصریؒ کی مدد سے یہاں اسلامی قوانین و ضوابط نافذ کیے۔ ۵۱ھ/ ۶۷۱ء میں عبیداللہ بن ابی بکرہ نے سیستان میں آتش پرستوں (''گبرگان'') سے، پھر بُست، رخّج اور کابل تک پیش قدمی کر کے زنتبیل سے معرکہ آرائی کی۔ مؤخّر الذکر نے بیس لاکھ درہم دے کر اطاعت قبول کر لی۔ ۵۹ھ/ ۶۷۹ء میں سیستان کے نئے حاکم عبّاد بن زیاد نے کابل کے قریب ایک ہندی لشکر پر فتح پائی۔ ۶۲ھ/ ۶۸۱ء میں افغانستان کے باشندوں نے شاہ کابل کی سرکردگی میں بغاوت کر دی۔ سیستان کے نئے امیر یزید بن زیاد اور سپہ سالار ابوعبیدہ بن زیاد نے کابل پر حملہ کیا، جہاں ان کی شدید مزاحمت کی گئی۔ بہت سے مسلمان شہید ہوے اور ابوعبیدہ کو قید کر لیا گیا۔ بنابریں دمشق سے طلحۃ الطالحات کو سیستان کی تنظیم کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے باغیوں کی دل جوئی کی اور ۶۴ھ/ ۶۸۳ء میں اپنے بیٹے عبداللہ کو سیستان کا امیر بنا دیا۔ طلحہ کی وفات کے بعد عرب سردار ایک بار پھر اختلافات کا شکار ہو گئے اور ان میں سے ہر شخص نے افغانستان کے کسی نہ کسی حصّے پر قبضہ جما لیا۔ مروان الحکم کے عہدِ خلافت میں عبدالعزیز بن عبداللہ عامر سیستان کا حاکم مقرر ہوا۔ اس نے ۶۴ھ میں وہاں پہنچ کر طلحہ کے لشکر کو مجتمع کیا اور باغی افغانوں کی سرکوبی کے لیے بُست اور کابل کا رخ کیا۔ زنتبیل نے شکست کھائی۔ ۷۳ھ/ ۶۹۲ء میں عبداللہ بن امیہ نے، جسے خراسان کے عامل حجاج نے سیستان بھیجا تھا، بُست پر حملہ کر کے زنتبیل کو بھاری تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا۔ ۷۵ھ/ ۶۹۴ء میں عبداللہ معزول ہوا تو انتظام پھر بگڑ گیا۔ ۷۸ھ/ ۶۹۷ء میں عبیداللہ بن ابی بکرہ (عبیدہ بن بکرہ) بیابان کے راستے بست، زابل اور کابل پر حملہ آور ہوا، لیکن اسے زنتبیل کو سات لاکھ درہم دے کر صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ ۷۹ھ/ ۶۹۸ء میں عبیداللہ بُست میں فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا بُوبُرْدَعَہ زنتبیل سے سات لاکھ درہم چھین کر سیستان آ گیا۔ ۸۱-۸۲ھ/ ۷۰۱ء میں حجاج کے حکم سے عبدالرحمٰن ابن اشعث نے سیستان میں خارجی سالار ہمام بن عدی کے زبردست لشکر کو شکست دی۔ پھر اس نے بُست پر حملہ کر کے زنتبیل سے جنگ کی اور بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا۔ سیستان، زابل اور کابل پر پورا اقتدار قائم کرنے کے بعد عبدالرحمٰن نے حجاج سے مقابلے کی ٹھانی، لیکن ہزیمت اٹھا کر زرنج لوٹ آیا۔ حجاج کی ہدایت پر شمالی خراسان کے حاکم مہلّب نے مفضّل کو بھاری لشکر دے کر عبدالرحمٰن کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ وہ بُست کی جانب پیچھے ہٹ گیا، لیکن مفضّل نے تعاقب کیا۔ بُست اور رخّج کے درمیان عبدالرحمٰن نے شکست کھا کر زنتبیل کے پاس پناہ لی اور جب زنتبیل نے دائمی دوستی اور لگان کی معافی کے وعدے پر اسے اور اس کے رفیق ابو العنبر کو حجاج کے ایلچی کے سپرد کرنا چاہا تو دونوں نے چھت سے کود کر جان دے دی۔ یہ تمام واقعات ۸۴-۸۵ھ/ ۷۰۴ء میں ظہور پذیر ہوے۔ ۸۶ھ/ ۷۰۵ء میں مسمع بن مالک نے سیستان میں ابوخلدہ خارجی سے کئی لڑائیاں لڑ کر اسے گرفتار کر لیا۔ اسی سال مسمع کی وفات پر قتیبہ بن مسلم یہاں کا حاکم مقرّر ہوا، جس کے قائم مقام اشعث بن عمرو نے ۸۸ھ/ ۷۰۶-۷۰۷ء میں بمقام بُست زنتبیل سے جنگ کی اور پھر قتیبہ کے بھائی عمرو نے مؤخّر الذکر کو آٹھ لاکھ درہم دے کر صلح کر لی لیکن ۹۴ھ/ ۷۱۳ء میں جب قتیبہ خراسان کی مُہمّات سے واپس ہوا تو زنتبیل نے دس لاکھ درہم سالانہ خراج ادا کرنا منظور کر لیا۔ ۱۰۹ھ/ ۷۲۷ء میں محمد بن جحش نے سیستان سے نکل کر زنتبیل سے سخت لڑائیاں کیں۔ اس کے بعد یہاں عربی قبائل میں جھگڑے پیدا ہو گئے؛ چنانچہ سلطنت بنی امیّہ کے زوال تک سیستان خانہ جنگی کا مرکز بنا رہا۔ اگرچہ دوسری طرف اسلامی لشکر سمندر کے راستے ہندوستان پہنچ کر سندھ و ملتان فتح کر چکے تھے (۹۶ھ/ ۷۱۴ء) اور اس طرح افغانستان کے عقب میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رہا، تاہم افغانستان کے باشندے آخر تک مقابلہ کرتے رہے۔

عہدِ عبّاسی (۱۳۲-۲۰۵ھ): خلافتِ راشدہ اور اموی سلطنت کا ایک سو تیس سال کا دور جنگ و جدال ہی میں گزرا۔ جب تک بنوہاشم اور بنوامیّہ کے حامی قبائل میں اختلافات جاری رہے، افغانستان کے باشندے آلِ ہاشم کے طرف دار رہے۔ جب بنوامیّہ پر زوال آنے لگا تو خراسان کے ایک بااثر شخص عبدالرحمٰن

المعروف بہ ابومسلم مروزی (پیدائش ۱۰۲ھ) نے شہر انبار سے خلافتِ بنی ہاشم کی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ۱۲۴ھ/ ۷۴۱ء میں اس نے کوفے جا کر عبّاسی امام ابراہیم سے ملاقات کی اور لوگوں کو آلِ عباس کی حمایت پر ابھارا۔ ۱۲۹ھ/ ۷۴۶ء میں اس نے مرو سے طُخارستان تک کے باشندوں کی حمایت حاصل کر کے بنوعباس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ ۱۳۱ھ/ ۷۴۸ء میں جب خلیفہ مروان کے حکم سے ابراہیم (بن محمد بن علی بن عبداللہؓ بن عباسؓ) ہلاک کر دیے گئے اور ان کا بھائی عبداللہ السفاح کوفے کی طرف بھاگ گیا تو ابومسلم خراسان سے اپنا لشکر لے کر بڑھا، کوفے میں داخل ہو کر جامع مسجد میں السفاح کے نام کا خطبہ پڑھا اور سلطنت بنی امیہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا (۱۳۲ھ/ ۷۴۹ء)۔ بنوعباس کی خلافت قائم ہونے کے بعد ابومسلم واپس مرو چلا گیا اور ۱۳۵ھ/ ۷۵۲ء تک وہاں کا نظم و نسق درست کرتا رہا، پھر ماوراء النہر بھی فتح کر لیا۔ ۱۳۶ھ/ ۷۵۳ء میں وہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عازمِ مکّہ ہوا اور ۱۳۷ھ/ ۷۵۴ء میں السفاح کے بھائی منصور الدوانیقی کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا، کیونکہ منصور اس کے روز افزوں اثر و رسوخ سے خائف تھا۔ ۱۴۲ھ/ ۷۵۹ء میں فیروز سنبا زُرد ُشتی نے بغاوت کر دی اور ہرات کے مغرب میں رے اور ہمدان تک بڑھتا چلا گیا، لیکن بعد ازاں خلیفہ منصور کے بیٹے مہدی کی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ ۱۴۴ھ/ ۷۶۱ء میں بُست اور قندہار میں شورش ہوئی، جسے سیستان کے حاکم زُہیر بن محمد الأزدی نے فرو کیا۔ ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء میں استاد سیس ہروی نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ خلیفہ کے حکم سے خازم بن خزیمہ چوبیس ہزار کا لشکر لے کر اسے کچلنے کے لیے آگے بڑھا۔ ادھر طخارستان سے قتیبہ کے بیٹوں عمرو اور ابی عوان نے اس پر حملہ کر دیا۔ استاد سیس گرفتار ہو گیا اور اس کی بیٹی مرجیلہ کی شادی الہارون سے کر دی گئی، جس کے بطن سے المأمون پیدا ہوا۔ ۱۵۱ھ/ ۷۶۸ء میں معن بن زایدہ سیستان کا حاکم مقرّر ہوا اور وہاں کی شورشیں فرو کرتا ہوا رُخّج تک بڑھتا گیا۔ معن نے زنتبیل سے بھی جنگ کی اور اس کے داماد ماوند (ماوید) کو تیس ہزار فوج کے ساتھ گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا، لیکن ۱۵۲ھ/ ۷۶۹ء میں اہلِ سیستان نے معن کا پیٹ چاک کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں خارجیوں کی شورش زوروں پر تھی۔ ۱۵۹ھ/ ۷۷۵ء میں خلیفہ مہدی کی طرف سے حمزہ بن مالک نے آ کر سیستان میں نوح خارجی کا قلع قمع کر دیا۔ اس دور میں یہاں کا دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۶۹ھ/ ۷۸۵ء میں تمیم بن سعید نے سیستان کا حاکم مقرّر ہو کر بُست اور رُخّج کی طرف لشکر کشی کی، پھر کابل شاہی زنتبیل سے جنگ کر کے اس کے بھائی کو گرفتار کیا اور عراق بھیج دیا۔ ہارون الرشید کی تخت نشینی کے سال میں سیستان میں ایک بار پھر شورش برپا ہوئی اور وہاں کا عرب حاکم کثیر بن سالم بغداد بھاگ گیا۔ اس کے بعد عثمان بن عمارہ سیستان کو اپنے حلقۂ اقتدار میں لے آیا اور رُخّج کے مقام پر کابل شاہ سے نبرد آزما ہوا؛ علاوہ ازیں اس نے بشر بن فرقد اور حصنین سیستانی سے سخت لڑائیاں کیں، جنھوں نے بُست اور سیستان میں سرکشی اختیار کر لی تھی۔ ۱۷۶ھ/ ۷۹۲ء میں داؤد بن بشر، حاکم سیستان، نے حصنین کا خاتمہ کیا۔ پھر اس کے جانشین یزید بن جریر نے ۱۷۸ھ/ ۷۹۴ء میں زابل اور کابل پر حملہ کیا۔ ۱۸۲ھ/ ۷۹۸ء میں سیستان کا نیا حاکم عیسٰی کابل تک بڑھ گیا۔

اب خراسان کی طرف آیئے۔ الہارون کے عہد میں فضل بن یحییٰ برمکی وہاں کا حاکم مقرّر ہوا (۱۷۷ھ/ ۷۹۳ء)۔ اس نے ''لشکر بغداذ'' کے نام سے پانچ لاکھ افراد پر مشتمل ایک مضبوط لشکر کی تشکیل کی اور بڑا اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ البرامکہ کے زوال (۱۸۷ھ/ ۸۰۲ء) کے بعد ۱۹۰ھ/ ۸۰۵ء میں علی بن عیسٰی بن ماہان، ۱۹۱ھ/ ۸۰۶ء میں ہرثمہ بن اعین اور ۱۹۳ھ/ ۸۰۸ء میں عباس ابن جعفر خراسان کے حاکم مقرّر ہوئے۔

افغانستان کے جن مقتدر خاندانوں نے خلافتِ بنی عباس کے قیام میں ابو مسلم خراسانی کا ساتھ دیا ان میں غور کا سُوری خاندان قابلِ ذکر ہے۔ عہدِ بنی امیہ کے آخری دنوں میں اسی خاندان کا ایک فرد شنسب بن خرنک غور کے پہاڑوں میں حکومت کرتا تھا۔ اس کے بیٹے امیر پولاد نے مہمّاتِ خراسان میں ابومسلم کا ساتھ دیا (۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء، کے آس پاس دیکھیے مادّہ ہای غور، غوریہ، سور)۔ ۱۸۲ھ/ ۷۹۸ء میں امیر حمزہ بن عبداللہ نے، جو زَوطہما سپ کی نسل سے تھا، عیسٰی بن علی، حاکم سیستان، کو بھگا کر زرنج پر قبضہ کر لیا اور عیسٰی کا تعاقب کرتا ہوا ہرات اور فوشنج تک بڑھتا چلا گیا، لیکن پھر عیسٰی کے ہاتھوں شکست کھا کر سیستان کی طرف پسپا ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک تازہ دم فوج منظم کر کے نیشاپور پر حملہ کیا اور خون ریز لڑائیوں کے بعد ۱۸۸ھ/ ۸۰۴ء میں سیستان لوٹ آیا۔ ۱۹۳ھ/ ۸۰۸ء میں ہارون الرشید بہ نفسِ نفیس خراسان آیا۔ حمزہ تیس ہزار کا لشکر لے کر نیشاپور کی طرف بڑھا۔ ربیع الآخر ۱۹۳ھ میں خلیفہ نے طُوس میں وفات پائی اور حمزہ لڑے بغیر واپس ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے بلوچستان اور سندھ پر حملہ کیا۔ وہاں سے وہ ۱۹۹ھ/ ۸۱۴ء میں لوٹا اور ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء میں مارا گیا۔ اسی زمانے میں خاش (سیستان) کے ایک باشندے حرب بن عبیدہ نے بست سے خروج کیا اور ۱۹۹ھ تک عباسی افواج سے برسرِ پیکار رہا۔ اس کے بعد سیستان میں عباسیوں کی حکومت محض برائے نام قائم رہی ورنہ حقیقت میں اقتدار آلِ طاہر کے قبضے میں آ چکا تھا۔

بنوامیّہ اور بنوعبّاس کے عہد میں افغانستان کے مدنی اور اجتماعی حالات: ہجرت کی پہلی دو صدیوں ہی میں اسلام نے افغانستان میں مذہب زردشت، بدھ مت اور برہمن دھرم کی جگہ لے لی۔ عربی زبان اور رسم الخط پورے ملک میں پھیل گیا، تاہم مشرقی علاقوں میں تقریباً اڑھائی سو سال تک سنسکرت (یعنی سردا اور ناگری مخلوط) رسم الخط عربی کے کوفی رسم الخط کے ساتھ ساتھ جاری رہا؛ چنانچہ عربی کا قدیم ترین کتبہ (جمادی الاولٰی ۲۴۳ھ/ ۸۵۷ء)، جو ٹوچی کی وادی میں دستیاب ہوا ہے، عربی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ہے (عجائب خانۂ پشاور)۔ خراسان، ہرات اور سیستان میں بھی پہلوی زبان نے اپنی جگہ موجودہ دری فارسی کے لیے خالی کر دی اور اسلامی علوم، یعنی تفسیر، حدیث، رجال اور سیرت بھی افغانستان

میں رواج پا گئے۔ زرنج، بلخ، ہرات، مرو وغیرہ میں بڑے بڑے اسلامی مدرسے کھل گئے اور اس سرزمین سے مشہور زاہد اور بزرگ عالم پیدا ہوے، مثلاً امام اعظم ابوحنیفہؒ بن ثابت بن زوطی کابلی، ابن المبارک مروزی، محمد بن کرّام سیستانی، بانی مذہب کرّامیہ، ابراہیم بن طہمان محدّث باشانی (ہراتی)، ابواسحٰق بن یعقوب محدّث جوزجانی، مشہور صوفی ابراہیم ادہم بلخی، ابوسلیمان موسیٰ بن سلیمان جوزجانی (فقیہِ حنفی)، ابراہیم بن رستم مروی (جو حضرت ابوحنیفہؒ کے تلامذہ میں سے تھے)، ابوداؤد سجستانی (صاحب سنن)، ابی حاتم سہل بن محمد محدث سجستانی، ابومعشر بلخی (منجّم)، ابن قتیبہ مروزی (مؤرّخ)، بشار بن برد طخارستانی (عربی شاعر) اور علی بن الجہم خراسانی (عربی شاعر) وغیرہ۔ اہلِ خراسان، مثلاً البرامکہ، کے ذریعے ایرانی تمدّن اور عجمی آدابِ معاشرت عباسیوں کے دربارِ خلافت میں منتقل ہوے۔ عربی زبان اور دری زبان نے مل کر موجودہ فارسی کی صورت اختیار کی۔ عرب فاتحین افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں بہت زیادہ تعداد میں آباد ہو گئے۔ اس طرح ایک مخلوط تہذیب اور ایک مخلوط نسل وجود میں آئی اور یہاں عربی آداب ورسوم کی اشاعت ہونے لگی۔ مستقل آباد ہونے والے عربوں سے قطع نظر اس ملک کے اندر مقیم افواج میں عربوں کی بڑی تعداد موجود تھی؛ چنانچہ بقول ابن الاثیر عہدِ اموی میں صرف قتیبہ کے زیرِ قیادت نو ہزار بصری، سات ہزار بکری، دس ہزار تمیمی، چار ہزار عبدقیسی، دس ہزار ازدی اور سات ہزار کوفی، یعنی کل سینتالیس ہزار خالص عربی النسل سپاہی موجود تھے۔

اموی اور عبّاسی دَور میں ملتان، دیبل، منصورہ، وَیہنڈ، الور (روڑ)، قندابیل (گنداوی) قزدار (خضدار) وغیرہ اور کشمیر سے دریاے مہران (سندھ) کے دہانے تک وادی سندھ اور توران (بلوچستان کا ایک حصّہ) کے آباد اور پُررونق شہروں اور تجارتی مرکزوں سے ہندوستانی مصنوعات خراسان، سیستان اور ہرات کے راستے ایران، عراق اور شام کے شہروں میں لائی جاتی تھیں۔ الاصطخری اور ابن حوقل کی روایت کے مطابق قزدار، مکران اور تورانی چینی کی تجارت سارے خراسان اور عراق میں ہوتی تھی۔ بقول بشّاری مقدسی توران میں سفید دانہ دارچینی کے کارخانے موجود تھے۔ پنجاب کے تجارتی قافلے کابل، غزنی، خراسان، بخارا اور ماوراء النہر میں سے گزرتے تھے اور وہاں سے چینی کے برتن ہندوستان لے جاتے تھے۔ مشہور سامان تجارت میں خراسان اور مرو کا ریشمی کپڑا بھی ہوتا تھا۔ ہیڈ کی ''تاریخ تجارت اموی'' میں لکھا ہے کہ اس دور میں تجارت نے خاصی وسعت اختیار کر لی تھی؛ چنانچہ افغانستان کے راستے عربی ولایت کے مغربی حصّوں میں ہندوستانی برتن، خراسانی لوہا، رنگین کشمیری کپڑا، چینی عود، مشک اور دارچینی، نخ کے ملبوسات، ناریل، لونگ، عود نیز ہندوستانی اور سندھی ہاتھی پہنچائے جاتے تھے۔ ابوزید سیرافی لکھتا ہے کہ ''ہندوستان اور خراسان کے درمیان قافلوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ ان قافلوں کا راستہ زابلستان (قندہار) ہے کہ اسی مقام سے قزدار اور کیزکان (قلات) اور مکران جاتے ہیں اور شال (کوئٹہ)، درّۂ بولان اور سیبی کے راستے سندھ سے بھی تجارت جاری ہے''۔

حدود العالم میں ہے کہ بلہاری بھی ایک ہندوستانی تجارتی مرکز تھا اور وہاں ہندوستانی اور خراسانی تاجر آباد تھے۔ خراسان ایک آباد اور پُررونق علاقہ تھا، جس میں نعمتیں میسر، سونا، چاندی اور جواہرات کی کانیں موجود تھیں۔ یہ گھوڑوں، فیروزوں، ادویہ، ریشم اور روئی کا گھر تھا۔

خراسان اور سیستان میں بڑے بڑے تجارتی مرکزوں کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ اس وقت زراعت، آب یاری، تجارت، کان کنی اور صنعت وحرفت وغیرہ کو ترقی اور عروج حاصل تھا۔ عرب حکومت کو اس سرزمین سے وصول ہونے والے محاصل ومالیات کی مقدار بہت زیادہ تھی۔ الجہشیاری اور ابن خلدون کے قول کے مطابق عباسی حکومت نے ان اطراف پر مندرجۂ ذیل محاصل خراج، زکوٰۃ، غنائم اور عشر کی صورت میں عائد کیے تھے: خراسان: دو کروڑ اسّی لاکھ درہم، دو ہزار روپے (قطعہ) نقرہ، چار ہزار لدّ و جانور، ایک ہزار غلام، بیس ہزار ملبوسات، تیس ہزار رطل ہلیلہ؛ سجستان: چالیس لاکھ درہم، تین سو ملبوسات، بیس ہزار رطل شکر سفید؛ توران ومکران: چار لاکھ درہم۔ قدامہ بن جعفر: کتاب الخراج کے مطابق زمانۂ صلح میں سلطنت عباسیہ کے محاصل یہ تھے: خراسان: تین کروڑ ستر لاکھ درہم؛ سجستان: دس لاکھ درہم، توران ومکران: دس لاکھ درہم۔

اموی اور عباسی خلفا کے سکّوں کے علاوہ خراسان میں سندھ کی گزرگاہ تک غیر اسلامی سلطنتوں کے سکّے بھی رائج تھے۔ بعض اوقات ساسانی بادشاہوں اور گندھارا، پنجاب اور باختر کے بدھ یا ہندو فرمانرواؤں کے سکّوں پر خلیفہ کا نام اور کلمۂ طیبہ ضرب کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہر خراسانی بادشاہ اپنے اور خلیفۂ وقت کے نام کے سونے اور چاندی کے سکّے کوفی رسم الخط میں جاری کرتا تھا۔ البتہ آگے چل کر غزنوی دور میں بعض سکّے سنسکرت رسم الخط میں بھی مضروب ہوے۔ الاصطخری اور ابن حوقل کے مطابق سندھ کے ساحلی علاقوں میں ایک سکّہ گندھارا کے نام سے منسوب تھا (قنہری = گندھاری)۔ یہ سکّے ملتان سے اسمٰعیلی اور لودھی حکمرانوں نے ضرب کروائے تھے۔ چاندی کا سکّہ پانچ درہم عراقی اور خالص طلائی سکّہ تین درہم ہندی کے برابر تھا۔ منصورہ، ملتان، قندہار اور توران میں ''من'' کا وزن ''منِ مکّی'' کے برابر تھا۔ اسی طرح ایک اَور پیمانہ ''کیجی'' کیچ توران میں رائج تھا اور چالیس من کے برابر تھا۔

سلطنت اموی کی سیاسی تقسیم یوں تھی کہ خراسان و ماوراء النہر سے کابل، پنجاب اور سندھ تک کا تمام مفتوحہ علاقہ ولایتِ عراق عجم میں شامل تھا، جس کے والی کی طرف سے دو گورنر مقرر کیے جاتے تھے: ایک حاکمِ خراسان ہوتا تھا، جس کا صدر مقام مرو تھا اور دوسرا حاکمِ کابل، جو پنجاب اور سندھ کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ افغانستان میں اسلامی فتوحات کی وسعت کے ساتھ عہدِ عبّاسیہ میں اس ملک کی تقسیم یوں ہو گئی: (۱) ولایتِ خراسان، جو نیشاپور اور ہرات سے بلخ اور طُخارستان (موجودہ قطغن) کے علاقے پر مشتمل تھی؛ (۲) ولایتِ سیستان، جو کابل تک پھیلی ہوئی تھی؛ (۳) ولایتِ توران ومکران، جو سندھ کی حدود تک وسیع

تھی۔ ان ولایتوں میں باقاعدہ دفتری اور مالی نظام قائم تھا جس کی تفصیل الخوارزمی: مفاتیح العلوم میں ملتی ہے۔ لگان مندرجۂ ذیل تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں حکومت وقت کو ادا کیا جاتا تھا: (۱) محاسبہ (نقد یا جنس)؛ (۲) مقاسمہ (پیداوار پر عائد کردہ مالیہ)؛ (۳) مقاطعہ (حکومت اور کاشتکار کے مابین طے شدہ مالیہ)۔ تمام ولایتوں میں مالیات، ڈاک، فوج، رسل و رسائل، صدقات، مصادرات، اوقاف، وظائف (تنخواہ)، پولیس اور عدالت کے محکمے موجود تھے۔ لشکر عموماً سوار اور پیادہ فوجوں پر مشتمل ہوتے تھے، تلوار، زرہ، خود، نیزہ، تیر، کمان، منجنیق، دبّابہ، اور ضبور (ٹینک کی ابتدائی شکل) سے مُسلّح؛ فوج کی وردی قمیص، اونچی شلوار اور چپلی پر مشتمل تھی، یعنی آج کل کے پہاڑی افغانوں کا لباس۔ لشکروں کے دستے پانچ حصّوں میں تقسیم کیے جاتے تھے: (۱) قلب، جو قائدِ عمومی کی کمان میں ہوتا تھا؛ (۲) میمنہ، یعنی دائیں ہاتھ کا لشکر؛ (۳) میسرہ، یعنی بائیں ہاتھ کا لشکر؛ (۴) کُتیبہ یا مقدمہ، یعنی سامنے کا یا درمیانی لشکر، جو زیادہ تر سواروں پر مشتمل ہوتا تھا؛ (۵) ساقہ، جو لشکر کے پیچھے رہتا تھا اور اس میں لشکر کے بڑے بڑے قائدین (غالباً عرب) رہتے تھے۔

عہد بنی امیّہ میں عدلیہ کے انتظام کی تفصیل یہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ اور تابعین کو خلیفہ کی طرف سے بڑے بڑے شہروں میں مقرر کیا جاتا تھا جو قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس کے مطابق جھگڑوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ وہ اپنے اجتہاد اور نفاذِ شریعت میں امرا کی سیاست کے اثر سے آزاد تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں قاضی میں پانچ صفات کا ہونا ضروری ہے، یعنی علم، حرص سے پاک ہونا، بردباری، ائمہ کی پیروی اور اہلِ علم اور اصحاب الرائے سے صحبت رکھنا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، پیمائش و اوزان، لین دین کے معاملات کی نگرانی اور احکامِ دین کی تبلیغ کے لیے شرعی محتسب مقرر تھے۔ علما وصلحا مفتوحہ علاقوں میں تبلیغِ اسلام کے لیے آتے رہتے تھے۔ ۴۷ھ/۶۹۲ء میں سیستان اور زابلستان کے عرب حاکم ربیع الحارثی نے مشہور عالم اور زاہد بزرگ حضرت حسن بصریؒ کی مدد سے اپنی ولایت میں اسلامی قوانین رائج کیے تھے۔

عہدِ خلافتِ عباسیّہ کی مزید تشریح اور تفصیلات کے لیے مندرجۂ ذیل کتابوں کے ابواب متعلقۂ خلفاے عباسیّہ دیکھیے: حدود العالم؛ تاریخ الاسلام السیاسی....؛ البشاری؛ الاصطخری؛ تاریخ التمدّن الاسلامی؛ کتاب الوزراء والکتاب؛ مقدمۂ ابن خلدون؛ سفرنامۂ سیرافی؛ تاریخ تجارت در عصر اموی، از ابن حوقل؛ حضارۃ الاسلام؛ ابن قدامہ: کتاب الخراج؛ کتاب الھند والسند؛ مختصر تاریخ عرب؛ فتوحات عرب در آسیاے میانہ؛ ابن الاثیر: الکامل؛ تاریخ سندھ؛ تاریخ ادبیاتِ فارسی؛ ابن ندیم: الفہرست؛ تاریخ افغانستان، ج ۳؛ تاریخ سیستان نیز عجائب خانۂ پشاور کے کتبات۔

اسلامی دور، افغانوں کی قومی مملکت کے قیام تک:

عہدِ طاہریان (۲۰۵-۲۵۹ھ): یہ فوشنج (موجودہ زندہ جان، مغربی ہرات میں) کا ایک ممتاز خاندان تھا، جس کا ایک فرد مصعب بن زریق بن ماہان عباسیوں کے عہد میں فوشنج کا حکمران اور ادب و بلاغت کے مشاہیر میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا بیٹا حسین ۱۵۸-۱۵۹ھ میں پیدا ہوا اور عباسی دربار کی طرف سے شام اور بغداد کا حاکم مقرّر ہوا۔ ۱۸۰ھ/۷۹۶ء میں وہ فوشنج کا حاکم تھا۔ الہارون کی وفات (۱۹۳ھ) کے بعد اس کے بیٹوں امین اور مأمون کے درمیان اختلافات رونما ہوے تو حسین کے بیٹے طاہر [رک بآں] نے مأمون کا ساتھ دیا۔ امین نے، جو بغداد میں خلیفہ ہو گیا تھا، علی بن عیسٰی کو ساٹھ ہزار فوج دے کر مامون کے خلاف لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ مامون کی طرف سے طاہر نے اپنی چار ہزار خراسانی فوج کی مدد سے کیا۔ لشکر بغداد کو شکست ہوئی اور اس کا سردار مارا گیا (۱۹۵ھ/۸۱۱ء)۔ طاہر نے ۱۹۸ھ/۸۱۳ء میں بغداد فتح کیا اور امین کو موت کے گھاٹ اتار کر مأمون کو تخت پر بٹھا دیا۔ ان خدمات کے عوض پہلے تو طاہر شام کا حاکم، بغداد کا صاحب الشرطہ (کوتوال) پھر خراسان کا حاکم بنایا گیا اور ذوالیمینین کے لقب سے مُلقّب ہوا (۱۹۹ھ/۸۱۴ء)۔ اس نے کرمان، سیستان، ہرات، نیشاپور، مرو، جوزجان، بلخ اور طُخارستان کو اپنے قبضے میں لانے کے بعد ۲۴ جمادی الاُخرٰی ۲۰۷ھ/[۱۴ نومبر ۸۲۲ء] کو خطبۂ جمعہ میں مامون کا نام ترک کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا، لیکن اسی رات وہ اس دنیا سے چل بسا۔ طاہر کے بعد خراسان کی حکومت پر خلافتِ بغداد کی طرف سے اس کے اخلاف فائز رہے، یعنی طلحہ بن طاہر (م ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء)، عبداللہ بن طاہر (تا ۲۳۰ھ/۸۴۴ء)، طاہر بن عبداللہ (تا ۲۴۸ھ/ ۸۶۲ء) اور محمد بن طاہر (تا ۲۵۹ھ/ ۸۷۳ء)، جسے یعقوب بن لیث الصفّاری [رک مادّۂ صفّاریہ] نے قید خانے میں ڈال کر طاہری خاندان کے سلسلے کو ختم کر دیا (تفصیل کے لیے دیکھیے مادّہ ہاے طاہریہ و ایران)۔

طاہریوں کا اثر و رسوخ مغربی و شمالی افغانستان تک محدود تھا اور جنوبی و مشرقی افغانستان پر کابلشاہی ہندو حکمران تھے۔ آلِ طاہر نے خلافت بغداد سے دوستانہ مراسم قائم رکھے۔ ان کی درباری اور ادبی زبان عربی تھی۔ انھوں نے افغانستان میں بچے کھچے زردشتیوں کے خلاف متعدّد اقدامات کیے۔

عہد صفّاریان (۲۴۷-۳۹۳ھ/۸۶۱-۱۰۰۳ء): بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد میں سیستان ہمیشہ سیاسی تحریکوں، خصوصاً خوارج کا مرکز رہا۔ انھیں دنوں یہاں ''اہل فتوت'' نے زور پکڑا، جو موجودہ سیاسی جماعتوں کی طرح کی ایک جمعیت تھی۔ اس کے ایک رکن یعقوب نے، جو سیستان کے ایک گاؤں قرنین کے ایک ٹھیرے لیث کا بیٹا تھا، اپنے بھائی عمرو بن لیث کی معیت میں صالح بن نضر، حاکمِ سیستان، کے دربار میں رسائی حاصل کر لی اور سیستان کے نائب حاکم درہم بن نصر کے ہاں سپہ سالاری کے عہدے پر جا پہنچا۔ ۲۴۷ھ/۸۶۱ء میں اس نے درہم اور خوارج کو شکست دے کر اہلِ سیستان سے بیعت لے لی۔ صالح نے کابلشاہ زنتبیل سے مدد چاہی تو یعقوب نے اسے بھی شکست فاش دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا اور بُست پر قبضہ کر لیا۔ بعدازاں زابل میں اُس نے صالح کو گرفتار کیا، پھر

اسے قید خانے ہی میں مار ڈالا (۲۵۱ھ/۸۶۵ء)۔ ۲۵۷ھ/ ۸۷۱ء میں یعقوب نے فارس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو اس کی توجہ ہٹانے کے لیے خلیفہ نے اسے بلخ، طخارستان اور سندھ کے علاقے جاگیر میں دے دیے۔ ۲۵۸ھ/ ۸۷۱ء تک وہ رخّج، بلخ، بامیان، زمین داور، والشان، تگین آباد، قندہار، غزنہ اور کابل فتح کر چکا تھا۔ ۲۵۹ھ/ ۸۷۲ء میں اس نے آلِ طاہر کا خاتمہ کر کے خراسان کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ بقول ابن خلّکان ۲۵۹ھ/ ۸۷۲ء سے ۲۶۳ھ/ ۸۷۶ء تک اس نے تمام اطراف و اکناف (مثلاً ملتان، رخّج، طَبَسَین، زابلستان، سندھ، مکران) کے بادشاہوں کو مطیع کرلیا۔ چونکہ خلیفہ نے اس کی حکومت تسلیم نہیں کی تھی اس لیے وہ حاکمِ فارس کو شکست دے کر خوزستان کے راستے بغداد کی جانب بڑھا، لیکن شکست کھا کر خوزستان کی طرف پسپا ہوا اور سترہ سال کی حکمرانی کے بعد ۱۴ شوال ۲۶۵ھ/ ۹ جون ۸۷۸ء، بروز شنبہ مرضِ قولنج میں مبتلا ہوکر جندیشاپور (فارس) میں فوت ہوگیا۔ یعقوب ایک منصف، کریم النّفس اور شجاع انسان تھا۔ وہ پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے دریائے آمو سے سیستان تک اور بادغیس، مرو اور ہرات سے کابل، گردیز اور زابلستان تک پورے افغانستان پر قبضہ کیا۔ اس نے اپنی فوجوں اور اسلحہ خانوں کی تنظیم اور خزانے کی آمدنی بڑھانے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ المسعودی (مروج الذھب، ج ۲) نے اسے دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار کیا ہے اور اس کی خوبیِ تدبیر وسیاست کے بارے میں ایک سیر حاصل باب لکھا ہے۔ اس کے لشکر میں پانچ ہزار بُختی اونٹ اور دس ہزار صفّاری خچرّ تھے۔ اس کی وفات کے وقت سیستان کے خزانے میں پانچ کروڑ درہم اور آٹھ کروڑ دینار تھے۔

یعقوب کا جانشین اس کا بھائی عمرو بن لیث ہوا۔ خلیفہ نے اسے خراسان، سیستان، فارس، کرمان، سندھ اور ماوراء النّہر کا حاکم تسلیم کرلیا۔ ۲۶۶ھ/ ۸۷۹ء میں احمد بن عبداللہ خجستانی نے، جو طاہریوں کا ایک امیر تھا، خراسان میں شورش برپا کی اور ہرات وسیستان کی حدود تک بڑھ آیا، لیکن بالآخر عمرو کے ہاتھوں شکست کھائی (۲۶۷ھ/ ۸۸۰ء)۔ اس اثنا میں خلیفہ نے عمرو کی موقوفی کا اعلان کر کے رافع بن ہرثمہ کو روانہ کیا، جس نے ہرات اور فراہ پر قبضہ کرلیا۔ عمرو ان دنوں فارس اور عراق میں مصروفِ جنگ تھا۔ وہاں سے لوٹ کر اس نے رافع کو شکست دی۔ اب رافع نے ماوراء النّہر میں جا کر سامانی بادشاہ نصر بن احمد سے مدد مانگی، لیکن عمرو اسے خراسان سے خوارزم تک پسپا ہی کرتا چلا گیا، جہاں وہ عمرو کے نائب السّلطنت محمد بن عمرو خوارزمی کے ہاتھوں قتل ہوا (۲۸۳ھ/ ۸۹۶ء)۔ ۲۸۷ھ/ ۹۰۰ء میں عمرو بلخ میں اسمٰعیل بن احمد سامانی سے لڑتا ہوا گرفتار ہوگیا۔ اسے بغداد بھیج دیا گیا، جہاں اس نے موت کی سزا پائی۔ بقول ابن خلّکان وہ بھی حسنِ سیاست اور تدبیرِ مملکت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ ابن الأثیر کے مطابق اسے اپنے لشکر اور ملک کے حالات کا کما حقہٗ علم تھا۔ اس نے ایک ہزار رباط، پانچ سو جامع مسجدیں، بہت سے پل اور کئی سڑکیں تعمیر کرائیں۔ عمرو کے بعد صفّاریوں کو زوال آ گیا اور بخارا کے سامانیوں نے حدودِ سیستان تک شمالی افغانستان اور ہرات پر قبضہ کرلیا؛ البتہ سیستان پر کچھ مدّت تک صفّاری حکمران رہے۔ ۲۸۹ھ/ ۹۰۱ء میں عمرو کا نواسہ طاہر بن محمد اور اس کا بھائی یعقوب سیستان پر قابض ہو گئے اور لڑتے بھڑتے ۲۹۱ھ/ ۹۰۳ء میں بُست اور رخّج تک بڑھ گئے۔ ۲۹۶ھ/ ۹۰۸ء میں اسی خاندان کے ایک فرد لیث بن علی ابن لیث نے عمرو بن لیث کے غلام سُبُکری کی مدد سے طاہر اور یعقوب کو گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا اور خود شیر لُبادہ کے لقب سے سیستان کا امیر بن گیا۔ بُست، کش اور فراہ تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ ۲۹۸ھ/ ۹۱۰ء میں سُبُکری نے خلیفہ المقتدر کی شہ پا کر لیث کو گرفتار کر کے بغداد میں قید کر دیا تو اہلِ سیستان نے علی (ابوعلی محمد) بن علی بن لیث الاوّل کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ کابل، بُست اور غزنہ تک اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا (۲۹۸ھ/ ۹۱۰ء)، لیکن وُہ اسی سال رخّج کے مقام پر احمد بن اسمٰعیل سامانی کے ہاتھوں گرفتار ہُوا۔ اسے سُبُکری کے ساتھ بغداد بھیج دیا گیا اور سیستان میں آلِ سامان کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ ۲۹۹ھ/ ۹۱۱ء میں سیستان کے سامانی حکمران اسحٰق کے خلاف بغاوت ہوگئی اور ایک دہ سالہ صفّاری بچّے ابوحفص عمرو بن یعقوب بن محمد بن عمرو بن لیث کو مولیٰ سندلی کی سرپرستی میں آگے لا کر سامانی حکمران کو گرفتار کرلیا گیا، لیکن سامانی دربار کی طرف سے حسین ابن علی مروزی کو سیستان بھیجا گیا اور دانش مند سامانی وزیر ابومنصور جیہانی نے ۳۰۳ھ/ ۹۱۵ء میں زابلستان اور زمین داور تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ بعدازاں سامانی امرا نے رخّج اور وادی ارغنداب تک یہ ملک اپنے قبضے میں لے لیا اور ہندوان (طرابیل) کے باقی ماندہ سیاسی حریفوں کو زابلستان میں گرفتار کرلیا (۳۱۰ھ/ ۹۲۲ء)۔ اب سیستان کا نظم ونسق احمد بن قدام اور عزیز بن عبداللہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ ۳۱۱ھ/ ۹۲۳ء میں یہاں کے باشندوں نے پھر شورش بپا کی اور ابوجعفر احمد بن احمد بن محمد بن خلف بن لیث کی امارت کا اعلان کر دیا۔ ابوجعفر رخّج اور ہرات کی حدود تک تمام ملک پر قابض ہوگیا تا آنکہ ۳۵۲ھ/ ۹۶۳ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ابوجعفر کے بیٹے خلف بانُو (تا ۳۹۳ھ) اور امیر طاہر بوعلی (۳۵۲-۳۵۹ھ) کے درمیان دشمنی پیدا ہوگئی، جو یعقوب بن لیث کے دادا کے بھائی کی نسل سے تھا۔ ۳۵۹ھ/ ۹۶۹ء میں طاہر فوت ہوگیا تو اس کا بیٹا امیر حسین (۳۵۹-۳۷۳ھ) امیر خلف بانُو سے برسرِ پیکار رہا۔ ۳۷۳ھ/ ۹۸۳ء میں امیر خلف نے امیر سبکتگین، حاکمِ غزنی، کی امداد حاصل کر کے حسین سے صلح کرلی اور جب حسین نے وفات پائی تو وہ بلاشرکتِ غیرے سیستان کا حاکم ہوگیا۔ ۳۹۰ھ/ ۹۹۹ء میں امیر خلف بانُو نے ایک لاکھ دینار سالانہ خراج ادا کرنے کے اقرار پر سلطان محمود بن امیر سبکتگین کی اطاعت قبول کرلی۔ ۳۹۳ھ/ ۱۰۰۲ء میں سلطان محمود نے قلعۂ طاق سپہبد میں اس کا محاصرہ کیا اور بعدازاں اسے گوزگان وخراسان کی طرف جلاوطن کر دیا۔ اس کا بیٹا ابوحفص ہمیشہ سلطان محمود کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ یوں سیستان میں صفّاریوں کی خودمختار حکومت کا خاتمہ ہوگیا، گو ۸۸۵ھ/ ۱۴۸۰ء تک

یہاں صفّاری امرا غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کی سلطنت کے ماتحت حکومت کرتے رہے (دیکھیے مادّۂ صفّاریہ)۔

صفّاری منصف، مجلس پسند اور علم دوست تھے۔ وہ افغانستان کے پہلے مسلمان بادشاہ تھے جنھوں نے سلطنت کو دینی اور سیاسی وحدت کا رنگ دیا۔ ان کے عہد میں فارسی کو درباری اور ادبی زبان کا مقام ملا۔ اسی زمانے میں مشرقی افغانستان کے بعض علاقوں نے (مثلاً کابل سے گردیز تک) بدھ اور ہندو حکمرانوں کے اقتدار سے نجات حاصل کی (نیز دیکھیے مادّہ ہاے صفّاریہ و ایران)۔

عہد سامانیان (۲۷۹-۳۸۹ھ/ ۸۹۲-۹۹۹ء): اس خاندان کا بانی سامان خداۃ، جو بہرام چوبین کی نسل سے تھا، مرو میں مامون کے ہاتھ پر مسلمان ہوا (۱۹۷ھ/ ۸۱۲ء) اور اس کے بیٹے (اسد) اور پوتوں (نوح، احمد، یحییٰ اور الیاس) کو سلطنت عباسیہ میں ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ۲۶۱ھ/ ۸۷۴ء میں خلیفہ معتمد نے نصر بن احمد بن سامان کو ماوراء النہر کا امیر مقرر کیا، جس نے بخارا کی حکومت اپنے بھائی اسمٰعیل بن احمد کے سپرد کر دی۔ ۲۷۵ھ/ ۸۸۸ء میں ان دونوں بھائیوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی، نصر نے شکست کھائی اور اسے سمرقند کی طرف بھیج دیا گیا، جہاں ۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء میں وہ اس دنیا سے چل بسا۔ ماوراء النہر اور خراسان اسمٰعیل کے قبضے میں آ گیا اور خلیفہ نے بھی رسمی طور پر اسے وہاں کا حکمران تسلیم کر لیا۔ یہی آلِ سامان کے سلسلے کا اصل بانی ہے۔ اس نے ۲۸۷ھ/ ۹۰۰ء میں طخارستان سے مرو اور ہرات تک ایران کا شمالی علاقہ، ماوراء النہر اور مغربی افغانستان کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور ۲۹۵ھ/ ۹۰۷ء میں راہیِ ملک عدم ہو گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا احمد ہوا، جس کے عہد میں حسین بن علی مروزی نے اس کی طرف سے بُست اور رخّج تک کے علاقے پر قابض صفّاری حکمرانوں معدل اور بوعلی کا خاتمہ کیا۔ ۳۰۱ھ/ ۹۱۳ء میں احمد اپنے غلاموں کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس کا ہشت سالہ بیٹا نصر ثانی بن احمد تخت پر بیٹھا۔ اس کے دَور کا قابلِ ذکر واقعہ منصور بن اسحٰق سامانی اور حسین بن علی مروزی کی بغاوت ہے۔ ۳۰۶ھ/ ۹۱۸ء میں منصور فوت ہو گیا اور حسین نے اطاعت قبول کر لی۔ اس زمانے میں سیستان کبھی مقامی حکمرانوں کے قبضے میں رہا اور کبھی سامانی امرا کے۔ ۳۳۱ھ/ ۹۴۲ء میں نصر نے وفات پائی اور اس کا بیٹا نوح اوّل تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں شمالی افغانستان اور خراسان کے حکمران بوعلی چغانی بن محتاج نے بغاوت کی۔ نوح نے اسے شکست دی، لیکن ۳۴۱ھ/ ۹۵۲ء میں اسے پھر خراسان کا امیر مقرّر کر دیا۔ ۳۴۳ھ/ ۹۵۴ء میں نوح کی وفات پر اس کے بیٹے عبدالملک کو سلطنت ملی۔ ۳۴۵ھ/ ۹۵۶ء میں ابوالحسن سیمجور خراسان کا سپہ سالار مقرّر رہا، پھر اس کی جگہ ۳۴۹ھ/ ۹۶۰ء میں ابومنصور عبدالرّزاق اور اس کے بعد حاجب الحجّاب الپتگین نے لی۔ ۳۵۰ھ/ ۹۶۰ء میں عبدالملک نے انتقال کیا اور اس کا بھائی منصور بن نوح اوّل اس کا جانشین قرار پایا۔ اس نے ابومنصور عبدالرّزاق کو خراسان کی حکم رانی اور الپتگین کی مدافعت پر مقرّر کیا۔ الپتگین ۳۵۰ھ میں نیشاپور سے پسپا ہو گیا اور غزنہ پہنچ کر غزنوی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ۳۵۳ھ/ ۹۶۴ء میں سرہنگ ابوعلی محمد بن عبّاس نے ہرات کے قلعۂ تولک میں بغاوت برپا کی، جسے ابوالحسن سیمجور کی طرف سے ابوجعفر نے فرو کر کے تولک کے علاوہ غور کے بھی بعض قلعے فتح کر لیے۔ منصور کو سیستان کے حاکم خلف بن احمد کے خلاف سات سال تک برسرِ پیکار رہنا پڑا۔ بالآخران میں صلح ہو گئی، لیکن بقولِ ابن الاثیر یہ واقعات سامانی سلطنت کے ضعف کا باعث ہوے۔ ۳۶۶ھ میں منصور نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کے بیٹے نوح دوم نے لی۔ اس کے عہد میں خراسان پر ابوالحسن سیمجور تادمِ مرگ (۳۷۸ھ/ ۹۸۸ء) حکومت کرتا رہا۔ ادھر غزنہ میں الپتگین کی وفات سے کچھ عرصے بعد حکومت اس کے داماد سبکتگین کے ہاتھ آئی۔ ابوالحسن کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ابوعلی نے بلخ کے حکم ران فائق خاصہ کے ساتھ مل کر سرکشی اختیار کی۔ نوح دوم نے سبکتگین سے اعانت طلب کی۔ سبکتگین اپنے بیٹے محمود کے ساتھ پہنچا اور ہرات کے قریب ۳۸۴ھ/ ۹۹۴ء میں ابوعلی اور فائق کو شکست دے کر انھیں دیلمیوں کے علاقے میں بھگا دیا۔ نوح نے سبکتگین کو ناصر الدّین کا لقب دے کر غزنہ، کابل اور بلخ تک خراسان کا اور محمود کو سیف الدّولہ کا لقب دے کر نیشاپور کا حاکم مقرّر کیا۔ امیر نوح اور سبکتگین دونوں کا ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں انتقال ہوا۔ نوح دوم کا نابالغ بیٹا منصور دوم تخت پر بیٹھا، لیکن آلِ سامان کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایلک خان نے بخارا پر قبضہ کر لیا، فائق اور بکتوزون نے منصور دوم کو اندھا کر کے (۳۸۹ھ/ ۹۹۸ء) اس کے بھائی عبدالملک دوم کو تخت پر بٹھایا۔ منصور کا بدلہ لینے کے لیے محمود نے چڑھائی کر دی۔ آخر ان شرطوں پر صلح ہوئی کہ ہرات اور بلخ (یعنی کابل تک موجودہ افغانستان کا علاقہ) محمود کے قبضے میں رہیں اور نیشاپور و مرو بکتوزون و فائق کے حوالے ہوں۔ ۳۸۹ھ میں محمود کے واپس ہوتے ہی ایلک خان نے بخارا پر قبضہ کر کے عبدالملک دوم کو پہلے قید، پھر قتل کر دیا۔ سامانیوں کا آخری حکمران ابوابراہیم منتصر بن نوح دوم تھا۔ وہ محمود کے بھائی نصر اور ایلک خان کے خلاف بہادری سے لڑتا رہا اور آخر کار مارا گیا (۳۹۵ھ/ ۱۰۰۴ء)۔ اس طرح سامانی حکومت کا خاتمہ ہوا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّہ ہاے ایران؛ سامانیہ؛ عبدالملک؛ منصور؛ نصر؛ نوح وغیرہ)۔

اس عہد کے مشاہیر میں سے دو وزیر بہت مشہور ہیں: محمد بن احمد جیہانی، جس نے جغرافیے کی ایک کتاب مرتب کی، لیکن وہ اب مفقود ہو چکی ہے اور محمد بن محمد بلعمی، جس نے تاریخ طبری کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ قدیم فارسی شعرا میں سے رودکی، ابوشکور بلخی اور دقیقی اور پشتو شعرا میں سے ابومحمد ہاشم (م ۲۹۷ھ) قابلِ ذکر ہیں۔ سامانیوں کے دَور میں فارسی ادب اور زبان کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام اور تمدّنِ اسلام کابل تک پھیل گیا، البتہ افغانستان کے مشرقی سرحدی علاقوں (مثلاً ننگرہار، لغمان، خوست، منگل وغیرہ) میں قدیم زبانیں، مذاہب اور تمدّن باقی رہے۔

عہدِ دودمانِ پشتون (حدود ۳۰۰ھ): تیسری صدی ہجری میں کوہ سلیمان اور اس کے نواحی علاقے پر ایک پٹھان خاندان حکومت کرتا تھا۔ اس خاندان میں

تین بھائی تھے: غَرغُشت، بیٹنی اور سَرْبَن۔ وہ عبدالرّشید قیس نامی پٹھان کے بیٹے تھے۔ اگرچہ ان کے بارے میں بہت سے مقامی افسانے پشتو میں رائج ہیں، لیکن قدیم تذکرہ نگاروں، مثلاً سلیمان ماکو: تذکرۃ الاولیاء (حدود ۶۱۲ھ/ ۱۲۱۵ء)؛ ابوالفضل علّامی: آئین اکبری (۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۷ء)؛ اخوند درویزہ (م ۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء): تذکرۃ الابرار اور مخزن اسلام؛ نعمت اللہ ہروی: مخزن افغانی (۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء) اور شیخ امام الدین خلیل (م ۱۰۶۰ھ): تاریخِ افغانی سے پتا چلتا ہے کہ تینوں بھائی ۲۰۰ھ سے ۳۰۰ھ تک افغانستان میں کوہِ غور سے کوہ سلیمان تک حکومت کرتے تھے۔ قبائلی رسوخ کے علاوہ روحانی اعتبار سے بھی ان کا بڑا اثر تھا۔ شیخ بیٹنی کی بعض پشتو مناجاتیں منقول و موجود ہیں۔ کوہ سلیمان سے آگے کوہ غُونڈ ان تک قلات غلزئی پر خرشبون بن سَرْبن کا قبضہ تھا۔ وہ ۴۱۱ھ/ ۱۰۲۰ء میں کوہ سلیمان کے جنوبی دامن مرغہ میں فوت ہوا۔ اسمٰعیل بن بیٹنی کو کوہ سلیمان میں روحانی اثر و رسوخ کے علاوہ حکومت حاصل تھی۔ اس کا علاقہ کوہ سلیمان کے شمال مغرب (وازہ خواہ) میں غزنی تک پھیلا ہوا تھا۔ ان دونوں کے اشعار بھی قدیم پشتو میں منقول ہیں۔ خرشبون کے تین بیٹے کَند، زَمَند اور کاسی افغان اقوام کے مشہور اسلاف میں ہیں (دیکھیے علم الانساب و نژاد شناسی افغانستان).

عہد فریغونیان (۲۵۰-۴۱۰ھ): یہ خاندان قبل اسلام کے بادشاہوں (گوزگانان خداۃ) کی نسل سے تھا، سامانیوں اور غزنویوں کے عہد میں گوزگانان پر حکمران رہا۔ اس کے بادشاہ صلح دوست اور علم پرور تھے، سامانیوں اور غزنویوں دونوں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کی سلطنت شمال کی طرف دریائے آمو اور جنوب کی طرف غرجستان، غور (جہاں کا حکمران غَرشاہ فریغونیانِ گوزگانان کے ماتحت تھا) اور طالقان میں ہلمند کے گرد و نواح تک تھی۔ خود گوزگانان کا اطلاق موجودہ سرپل کے گرد و نواح پر ہوتا تھا۔ بقول العتبی اس سلسلۂ خاندان کا سردار فریغون تیسری صدی ہجری میں رباط افریغون کی حدود میں رہتا تھا، جو المقدسی کی رُو سے اندخود (موجودہ اندخوی) اور کرکی سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھی۔ اس خاندان میں فریغون کا بیٹا احمد پہلا شخص ہے جس کا ذکر ہمیں تاریخ اسلام میں ملتا ہے۔ بقول نرشخی ۲۸۷ھ/ ۹۰۰ء میں، جب امیر اسمٰعیل سامانی بلخ میں عمرو لیث صفّاری سے برسرِ پیکار تھا تو عمرو نے احمد فریغونی کو بلخ کا حاکم مقرّر کیا۔ قابوس نامہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت سے گلّوں کا مالک تھا۔ الاصطخری نے زمین داور سے رباط کروان (ہری رود بالائی کے قریب) تک کی سرزمین ابن فریغون کے علاقے میں شمار کی ہے۔ اس خاندان کے ایک اَور حکمران ابوالحارث محمد بن احمد کا ذکر فارسی زبان کے قدیم جغرافیے حدود العالم میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ۳۷۲ھ/ ۹۸۲ء میں اسی علم دوست حکمران کی نذر کی گئی تھی۔ اس کے عہد میں یہ خاندان اپنے عروج پر تھا۔ الاصطخری نے ۳۴۰ھ/ ۹۵۱ء کے لگ بھگ اس کے کاتب جعفر بن سہل کا ذکر کیا ہے۔ بارٹولڈ کے قول کے مطابق اس نے ۳۶۵ھ/ ۹۷۵ء میں اپنی ایک بیٹی کی شادی نوجوان سامانی بادشاہ نوح بن منصور کے ساتھ کر دی۔ ۳۸۰ھ/ ۹۹۰ء میں اس نے نوح بن منصور کی مدد کرتے ہوئے امیر فائق خاصہ سے جنگ کی، لیکن شکست کھائی۔ ابن الأثیر نے لکھا ہے کہ ۳۸۳ھ/ ۹۹۳ء میں نوح خراسان سے گوزگانان کی طرف آیا اور ابوالحارث اس سے جاملا۔ جب سبکتگین نے ۳۸۵ھ/ ۹۹۵ء میں فائق پر چڑھائی کی تو ابوالحارث اوّل الذّکر کی مدد کے لیے ہرات آیا۔ اسی زمانے میں العتبی کے قول کے مطابق اس نے اپنی دوسری بیٹی کی شادی محمود سے کی اور سبکتگین کی ایک بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے ابوالنصر احمد بن محمد کے ساتھ کر دیا۔ ۳۸۶ھ/ ۹۹۶ء میں جب سبکتگین اس جہان سے رخصت ہوا تو ابوالحارث نے محمود اور اس کے بھائی اسمٰعیل کے درمیان صلح کرا دی اور خود محمود کے ساتھ غزنہ چلا گیا۔ ۳۸۹ھ/ ۹۹۸ء میں محمود نے اسمٰعیل کی گرفتاری کا فرض بھی ابوالحارث کے سپرد کیا تھا۔ تاریخ کے اوراق میں اس کے متعلّق یہ آخری ذکر ملتا ہے.

العتبی نے ۳۹۴ھ/ ۱۰۰۳ء میں ایک شخص فریغون بن محمد کا ذکر کیا ہے، جسے محمود نے آخری سامانی شہزادے منتصر کے تعاقب میں بلخ سے اندخود اور مرورود کی حدود تک بھیجا تھا، لیکن اس کے متعلق کوئی تحقیق نہیں ہو سکی.

العتبی اور گردیزی کے مطابق اس خاندان کا ایک اَور فرد ابونصر احمد بن محمد ابوالحارث معروف بہ والی گوزگانان، قراخانیوں اور محمود کے بھائی کے درمیان جنگ پل چرخیان (۳۹۸ھ/ ۱۰۰۷ء) میں محمود کے قلبِ لشکر کا قائد تھا اور بھیم نگر کی لڑائی (۳۹۹ھ/ ۱۰۰۸ء) میں بھی محمود کے ہم رکاب تھا۔ اس نے ۴۱۰ھ/ ۱۰۱۹ء میں وفات پائی۔ البیہقی نے اِسی سال کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ محمود غور کی مہمّات پر گیا اور اس کے شہزادے — مسعود اور محمد — امیر افریغون گوزگانان کے بیٹے حسن کے ساتھ زمین داور میں رہے۔ یہی حسن، جو سبکتگین کا نواسہ تھا، گوزگانان کے تخت کا وارث ہوا۔ العتبی اور عوفی کا بیان ہے کہ سلطان محمود نے امیر ابونصر کی بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے محمد کے ساتھ کر دیا تھا اور گوزگانان کا علاقہ ابونصر کو واپس کر کے وہاں کے نظم و نسق کے لیے اس کے ساتھ ابومحمد حسن بن مہران کو مقرر کیا تھا۔ گویا یہ خطّہ ۴۰۸ھ/ ۱۰۱۷ء میں غزنویوں کے زیرِ اقتدار آ گیا تھا۔ ناصر خسرو کے اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے:

کجاست آنکه فریغونیان زهیبت او
ز دست خویش بدادند گوزگانان را

شمالی و مغربی افغانستان کے ان بادشاہوں نے علوم پروری اور عدل و انصاف میں بڑی شہرت پائی۔ ان کے درباری علما میں بدیع الزمان ہمدانی اور ابوالفتح بُستی، صاحبِ مفاتیح العلوم، کے علاوہ حدود العالم کا گم نام مؤلّف قابلِ ذکر ہے.

عہد لودِیانِ ملتان (۳۷۰-۴۰۱ھ): غزنہ پر سبکتگین کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد (۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء) سامانی حکمرانوں پر زوال آ گیا اور طخارستان و بلخ سے گوزگانان تک اور ہرات، سیستان، بُست اور کابل سے گردیز تک

افغانستان کا سارا علاقہ غزنہ سے ملحق ہوگیا (۳۶۸ھ/ ۹۷۸ء)۔ ان دنوں لاہور سے خیبر تک راجہ جے پال حکومت کرتا تھا اور مشرقی افغانستان کے بعض حصّے ماوراے سندھ اور ملتان تک ملتان کے مشہور خاندانِ لودیان سے متعلّق تھے۔ جب جے پال نے دوسری بار سبکتگین سے شکست کھائی (۳۸۱ھ/ ۹۹۱ء) تو شیخ حمید لودی، حاکمِ ملتان، نے سبکتگین کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا (۳۸۲ھ/ ۹۹۲ء)۔ اس کا جانشین اس کا بھتیجا شیخ رضی ہوا، جو اخبار اللودی میں احمد لودی کی روایت کے مطابق پشتو کا شاعر تھا اور حمید لودی کے عہد میں کہسار افغانان (کوہ سلیمان) میں تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دریاے سندھ اور غزنہ کے درمیانی علاقوں کے بعض افغانوں نے اس زمانے تک اسلام قبول نہیں کیا تھا؛ چنانچہ الاصطخری غور کو ایسا دار الکفر قرار دیتا ہے جہاں مسلمان بھی بستے ہیں۔ ۳۷۲ھ/ ۹۸۲ء میں حدود العالم کا مصنّف قندہار شہر (کنارِ سندھ) کو برہمنوں اور بتوں کی جگہ، لغمان کو بت خانوں کا مرکز اور بُنیہار کو بت پرستوں کا مقام خیال کرتا ہے۔ اس وقت بُست، زرنج اور رخّج اسلامی شہر تھے اور کابل شہر کی نصف آبادی مسلمانوں کی اور نصف ہندوؤں کی تھی۔ شیخ رضی کے بعد ملتان کی حکومت نصر بن حمید کے ہاتھ میں آئی (۳۹۰ھ/ ۹۹۹ء)۔ جب سلطان محمود نے ملتان پر پہلا حملہ کیا (۳۹۶ھ/ ۱۰۰۵ء) تو وہاں کا حاکم ابوالفتوح داؤد بن نصر (۳۹۵-۴۰۱ھ) تھا۔ اس پر سلطان نے بے دین اور اسمٰعیلی ملحد ہونے کا الزام عائد کیا، لیکن پشتو مآخذ، مثلاً پٹھ خزانہ اور خود اس کے ایک پشتو شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بے دین اور ملحد نہ تھا۔ محمود کے حملے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک سال قبل (۳۹۵ھ/ ۱۰۰۴ء) جب اس نے بھاٹیہ حکمران باجی راؤ پر حملہ کیا تھا تو داؤد نے بے اعتنائی برتی تھی۔ بہرحال سات روز کے محاصرے کے بعد داؤد لودی نے تاوان جنگ اور سالانہ خراج ادا کرنے کے وعدے پر صلح کر لی۔ ۴۰۱ھ/ ۱۰۱۰ء میں محمود پھر ملتان پر حملہ آور ہوا اور داؤد کو قلعۂ غورک میں قید کر دیا، جہاں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اگرچہ اس سے لودیوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا لیکن وہ ملتان میں بدستور موجود رہے؛ چنانچہ فخر مدبر کے قول کے مطابق سلطان مسعود کی وفات (۴۳۲ھ) کے بعد داؤد کے بیٹے شیخ (؟) نے بغاوت کر دی۔ جب سلطان مودود کا بھیجا ہوا لشکر وایوہ کے قلعے میں پہنچا تو شیخ منصورہ کی طرف چلا گیا اور ملتان پر غزنوی لشکر کا قبضہ ہوگیا۔ تاریخ میں لودیانِ ملتان کا آخری ذکر اسی قدر ملتا ہے۔

یہ خاندان ہندوستان میں افغانی اور اسلامی تہذیب وتمدّن کا پہلا بانی ہے۔ اس کے دو فرد، شیخ رضی اور نصر بن حمید، پشتو کے شاعر تھے۔ ان کے اشعار مع سوانح کے لیے دیکھیے پٹھ خزانہ و تذکرۂ شعراے پشتو (بحوالۂ احمد بن سعد اللودی، ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء: کتاب اللوذعی فی اخبار اللودی)۔ فرشتہ نے انھیں افغان بتایا ہے۔ لودیوں نے دوبارہ ۸۵۵ھ میں سلطان بہلول لودی کے زیرِ قیادت اپنی حکومت ہندوستان میں قائم کی، جو ایک سو برس تک (۹۳۲ھ/ ۱۵۲۵ء) جاری رہی، لیکن افغانستان کی تاریخ سے اس کے خاندان کا براہِ راست کوئی تعلّق نہیں۔

(عبدالحیّ حبیبی [تلخیص: سیّد امجد الطاف])

اسلامی دور: افغانوں کی قومی مملکت کے قیام تک جن علاقوں سے افغانستان کی تشکیل ہوئی وہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ہزار سالہ دَور میں مختلف صوبوں میں منقسم تھے۔ اگرچہ یہ صوبے اکثر ایک سے انقلابات کا تختۂ مشق بنتے رہے، تاہم وہ کسی بھی وقت باہم مل کر ایک جداگانہ وحدت نہ بنے اور نہ افغانوں نے میر وَیس، بلکہ احمد شاہ درّانی کے وقت تک اپنی کوئی سلطنت قائم کی۔ پیشتر کی تاریخ افاغنہ کے متعلّق مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مختلف صوبوں پر مقالات، مثلاً خراسان، سجستان، زابلستان، زمین داور، طخارستان، کابلستان؛ نیز مختلف خاندانوں کے متعلّق مقالات، جو ان اقطاع پر حکم ران رہے اور وہ مقالات جو اہم شہروں، مثلاً بلخ، غزنہ، ہرات، کابل وغیرہ پر لکھے گئے ہیں۔

اسلامی فتوحات کے وقت اس ملک کے جو صوبے ساسانیوں کی سلطنت میں شامل تھے جلد ہی سَر ہوگئے۔ اسلامی حملوں کی ایک رَو سجستان میں سے ہوکر گزری، لیکن اس مرکز سے کابل کو فتح کرنے کے لیے جو کوششیں ابتدائی صدیوں میں ہوتی رہیں وہ خاندانِ صفّاریہ [رتبیل بآن] کے برسرِ عروج آنے کے وقت تک مستقلاً نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ ولایتِ کابل نے دوسرے مشرقی صوبوں کی بہ نسبت اسلام [کی یلغار] کا مقابلہ زیادہ دیر تک کیا اور صرف غزنویوں کے عہد میں جا کر فتوحات کا یہ عمل پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

[غزنویہ (۳۵۱ھ/ ۹۶۲ء-۵۸۳ھ/ ۱۱۸۶ء): عبدالملک اوّل سامانی کی وفات کے بعد خراسان کے سپہ سالار امیر حاجب الپتگین نے اس کے جانشین منصور بن نوح کے خلاف بغاوت کر دی (۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) اور ۳۵۱ھ میں] شہر غزنہ وہاں کے حکمران [ابوعلی انُوک یا امیر ابوبکر لاویک] سے چھین لیا۔ [لاویک غالباً کابل کے امراے کوشانو یفتلی میں سے تھا۔ خود الپتگین اور اس کے جانشین، جن کے ناموں کے آخر میں لفظ تگین آتا ہے، ترکی-افغانی مخلوط النّسل بادشاہوں کی اولاد تھے، جو چینی سیاح وُوکُونگ (Wou Kong) کے بیان کے مطابق ۷۶۰ء میں افغانستان کے مشرقی حصّوں پر نیز ہندوکش کے جنوب میں حکومت کرتے تھے؛ چنانچہ سلطان محمود کے اخلاف کے عہد تک موجودہ قندہار کے شمال مغرب میں ان کی یادگار ایک شہر تگین آباد باقی تھا۔ غزنہ کے بعد الپتگین نے] زابلستان کا ملک سَر کیا اور اس جگہ اپنی آزاد ریاست قائم کر لی، جو پہلے اس کے بیٹے اسحٰق (۳۵۲-۳۵۵ھ) کو وراثۃً ملی، بعد ازاں اس کے ایک غلام [اور رفیق] بُلکا تگین [یا بُلکا تگین] کے قبضے میں آئی۔ [بُلکا تگین بڑا متّقی، جنگ جو اور انصاف پسند تھا۔ اس نے دس سال تک حکومت کی، ۳۵۹ھ/ ۹۶۹ء میں اپنے نام کا سکّہ جاری کیا اور محاصرۂ گردیز کے دوران ۳۶۵ھ/ ۹۷۵ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد الپتگین کے رفقا میں سے ایک مُفسِد شخص امیر پیری تگین غزنہ پر قابض ہوگیا (۳۶۵ھ)۔ لوگوں نے ناخوش ہوکر امیر لاویک کو بلا بھیجا، جس نے کابلشاہ کے بیٹے کی مدد سے چرخ (لُوگر-جنوبی کابل) پر حملہ کر دیا، لیکن الپتگین کے داماد امیر سبکتگین سے شکست کھائی اور وہ دس ہاتھیوں پر قبضہ کر کے انھیں غزنہ لے آیا،

جہاں لوگوں نے اسے امیر بنالیا (۲۷ شعبان ۳۶۶ھ/۲۱ اپریل ۹۷۶ء)۔]
یہی سبکتگین خاندان غزنویہ [رک بآن] کا بانی تھا اور غزنہ (غزنین، غزنی) اس کا دارالحکومت تھا.

[امیر سبکتگین ایک دانشمند اور بہادر شخص تھا۔ تاریخ گزیدہ کے بیان کے مطابق اس نے زابل کے رئیس کی بیٹی سے شادی کی۔ اس طرح وہ افغانوں کا داماد بن گیا اور تمام افغان اس کے لشکر میں شامل ہونے لگے۔ اس نے بُست، قُصدار (موجودہ خزدار— قلات کے جنوب میں)، زمین داور، بامیان، طخارستان، غور، زابلستان اور کابل کو، جو قراتگین کے گماشتوں کے قبضے میں تھے، فتح کر کے پروان (شمالی کابل) میں اپنا سکّہ جاری کیا۔ اس نے لغمان میں، جہاں بڑے مستحکم قلعے اور بت کدے تھے، ویہنڈ کے برہمن فرمانروا جے پال کے ایک لاکھ کے لشکر کو شکست دے کر پشاور تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا اور وہاں دینِ اسلام کی تبلیغ کی (۳۸۱ھ/۹۹۱ء)۔ ان لڑائیوں میں کثیر مالِ غنیمت ملنے سے سبکتگین کی قوّت بہت مستحکم ہوگئی اور بقول ابن الأثیر اس کے بعد افغان اور خلجی اس کے دائرۂ اطاعت میں آگئے۔ اس کے عہد کا دوسرا اہم واقعہ جنگِ ہرات (۳۸۴ھ/ ۹۹۴ء) ہے، جس میں فتح پا کر اس نے سامانی بادشاہوں کے دشمنوں کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ اکیس برس حکومت کرنے کے بعد ۳۸۷ھ/ ۹۹۷ء میں سبکتگین نے مدرموی کے مقام پر وفات پائی اور غزنہ میں دفن ہوا۔ اس وقت وہ دریاے آمو سے قُصدار تک اور دریاے سندھ سے نیشاپور اور سیستان تک اپنی سلطنت کی تشکیل کر چکا تھا اور وہاں کے مقامی حکم ران خاندانوں، مثلاً سیستان میں صفّاریوں کے جانشین، گوزگانان میں فریغونی امرا اور ملتان میں لودھی بادشاہوں نے اس کی سیادت تسلیم کر لی تھی.

سبکتگین کے چھ بیٹوں میں سے اسمٰعیل غزنہ پہنچ کر اس کا جانشین ہوگیا۔ چونکہ اسے کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے مخالفین نے سرکشی اختیار کی اور اس کے بڑے بھائی محمود نے، جو نیشاپور میں خراسان کا حاکم تھا، اس پر چڑھائی کر دی۔ غزنہ کے دروازے پر دونوں بھائیوں کا مقابلہ ہوا۔ بازی محمود کے ہاتھ رہی۔ اسمٰعیل صرف سات ماہ حکومت کر سکا اور اس شکست کے بعد قید خانے ہی میں چل بسا۔ اسی سال (۳۸۷ھ) محمود نے شمالی افغانستان بھی فتح کر لیا اور بلخ میں سریر آراے سلطنت ہوا۔ اس سے فارغ ہو کر محمود عبدالملک بن نوح سامانی سے جنگ آزمائی کے لیے مرو کی طرف بڑھا، لیکن بالآخر سامانی حکمران نے طخارستان سے بلخ اور ہرات تک خراسان کی حکومت محمود کو سپرد کر کے صلح کر لی (۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء)۔ اس سے کچھ ہی عرصے بعد عباسی خلیفہ القادر باللہ نے اسے ''یمین الدولۃ امین الملۃ ولیِ امیر المؤمنین'' کا خطاب عطا کر کے خراسان اور غزنہ کا فرمانروا تسلیم کر لیا (ذوالقعدہ ۳۸۹ھ/ اکتوبر ۹۹۹ء)۔ اس خطاب کے علاوہ محمود کو نظام الدّین، ملک الممالک اور ملک الملوک کے القاب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ فردوسی اسے ''شاہ'' لکھتا ہے۔ العتبی اسے کبھی کبھی ''سلطان'' اور دوسرے غزنوی مؤرّخین، مثلاً البیہقی اور گردیزی، اسے ''امیر'' کہتے ہیں۔ نظام الملک (سیاست نامہ)، ابن الأثیر (الکامل) اور منہاج سراج (طبقات ناصری) نے لکھا ہے کہ سلطان کا لقب پہلی بار محمود نے اختیار کیا تھا اور مجمل التواریخ والقصص (مطبوعۂ تہران) کے مؤلّف کا قول ہے کہ اس نے یہ لقب امیر خلف صفّاری کی تقلید میں اختیار کیا تھا، تاہم اس کے اور اس کی اولاد کے سکّوں پر یہ لقب نظر نہیں آتا؛ پہلی بار یہ ابراہیم غزنوی (۴۵۱-۴۹۲ھ) کے سکّے پر کندہ کیا گیا تھا۔ محمود کے کتباتِ مزار میں سے جو باقی رہ گئے ہیں اور قریب قریب کوفی رسم الخط میں ہیں، اس کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے تھے، ان میں اس کا نام ''الامیر الاجلّ السیّد نظام الدّین ابی القاسم محمود بن سبکتگین'' مندرج ہے اور یہی سب سے قدیم اور مستند ثبوت ہے.

[ہندوستان پر محمود کے چھوٹے بڑے متعدد حملوں اور وسطِ ایشیا میں اس کی سلطنت کی تشکیل کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّہ ہاے غزنویہ و محمود غزنوی].

اپنی عمر کے آخری ایّام میں محمود ایک وسیع مملکت پر حکومت کرنے لگا تھا، جس میں جانبِ غرب خراسان، جبال کا کچھ حصّہ اور طبرستان اور مشرق کی طرف پورا پنجاب شامل تھا؛ شمال کی جانب اس کا اقتدار دریاے جیحون کے آگے پہنچ چکا تھا، لیکن اس سلطنت کا مرکزی حصّہ وہ سارا ملک تھا جو اب افغانستان کہلاتا ہے [اس طرح اس نے اصفہان، عراق، ہمدان اور طبرستان سے مشرق میں گنگا کے کنارے تک، شمال میں آموتک اور جنوب میں سواحلِ بلوچستان اور کاٹھیاواڑ تک کا علاقہ مطیع کر لیا تھا۔ وہ بہت لائق، بہادر، سخی اور امورِ سلطنت سے کماحقہٗ آگاہ بادشاہ تھا۔ بقولِ العتبی اس نے ترک، افغان، تاجیک، ہنود اور خلجی (=غلجی، ترکی اور افغانی مخلوط النّسل لوگ، جو بقول الأصطخری و یاقوت خراسان اور سیستان، نیز کابل تک کے علاقے میں آباد تھے) عناصر سے مرکب لشکر کی تشکیل کی، افغان قبائل کو کوہسار غور، کوہِ سلیمان اور کوہِ سفید (سپین غر) وغیرہ میں مطیع کر کے مشرّف بہ اسلام کیا اور بقول الذہبی و ابن الأثیر معتزلہ، باطنیہ، جہمیہ، مشبّہہ اور روافض وغیرہ فرقوں کو عبرت ناک سزائیں دے کر کچل ڈالا۔ اس کا دربار ہمیشہ بڑے بڑے شعرا (مثلاً فردوسی، فرخی منوچہری، عنصری) اور علما (مثلاً البیرونی، ابن سینا، الثعالبی، ثمنار اور العتبی) کا ملجأ و مأوٰی رہا۔ آخر عمر میں محمود دق کی بیماری میں مبتلا ہوگیا تھا؛ چنانچہ وہ تینتیس سال کی حکمرانی کے بعد اکسٹھ برس کی عمر میں ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ/ ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا]۔ اس فاتح اعظم کی شخصیّت نے عوام کے دلوں پر گہرا نقش ثبت کیا اور وہ اس سرزمین کا قومی بَطَل قرار پایا.

[محمود کے بعد اس کا بیٹا محمد گوزگانان سے غزنہ آکر باپ کا جانشین ہوا، لیکن فوج اور اکثر امرا محمود کے ایک اَور بیٹے مسعود کے حامی تھے؛ چنانچہ جب مسعود ہرات سے غزنہ کی طرف روانہ ہوا تو خود محمد ہی کے سپہ سالار اور حاجب نے اپنے آقا کو پکڑ کر اندھا کر دیا اور شوّال ۴۲۱ھ/ اکتوبر ۱۰۳۰ء میں مسعود کو تخت پر بٹھا دیا.

مسعود نے ۴۲۲ھ/ ۱۰۳۱ء میں کرمان اور مکران پر قبضہ کیا اور ۴۲۵ھ/

۱۰۳۳ء میں آمل، ساری اور طبرستان پر غلبہ پایا۔ ۴۲۷ھ/ ۱۰۳۵ء میں اس نے ہانسی اور ہندوستان کے دوسرے قلعے فتح کیے اور ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۶ء میں اپنے بیٹے مجدود کو لاہور کا حاکم بنا کر غزنہ لوٹ گیا۔ اس کے بعد چند سال خراسان اور بلخ میں سلجوقی ترکمانوں کی شورشیں فرو کرنے کی سعی کرتا رہا، لیکن بالآخر میکائیل سلجوقی کے بیٹوں طغرل اور چغری بیگ نے خراسان پر نیشاپور، ہرات، بلخ اور سیستان تک قبضہ کر لیا اور دندانقان کی لڑائی میں مسعود کو شکست دی۔ نیشاپور میں مسعود کے نام کا آخری سکّہ ۴۳۱ھ/ ۱۰۳۹ء میں ضرب ہوا اور اس کے بعد یہاں ۴۳۳ھ میں طغرل کا سکّہ جاری ہو گیا۔ سلطنت کے حالات کو مخدوش پا کر مسعود نے اپنے بیٹے مودود کو غزنہ میں چھوڑا اور خود محمود کے خزانوں، لشکر اور اپنے نابینا بھائی محمد کو لے کر ہندوستان کا رخ کیا، لیکن ابھی وہ (ٹیکسلا اور راولپنڈی کے درمیان) مارگلہ تک پہنچا تھا کہ سپاہ نے بغاوت کر کے محمد کو بادشاہ بنا دیا اور مسعود کو قلعۂ گیری میں قید کر کے طاہر بن محمد کے ذریعے ہلاک کرا ڈالا (۱۱ جمادی الاولیٰ ۴۳۲ھ/ ۱۷ جنوری ۱۰۴۱ء)۔ اس کے مفصّل حالات کے لیے دیکھیے مادّۂ مسعود.

غزنہ میں امیر مودود باپ کا جانشین ہوا اور لشکر لے کر ہندوستان کی طرف چلا۔ ننگرہار میں بہ مقام دینور اپنے چچا محمد کی فوج کو شکست فاش دی اور اسے نیز اس کے بیٹے طاہر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا (۴۳۲ھ/ ۱۰۴۱ء)۔ مودود نے سلجوقیوں سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کی کوشش کی، حتّٰی کہ چغری بیگ کی بیٹی سے شادی بھی کر لی، لیکن اس کے باوجود وہ ان کے شر سے محفوظ نہ رہ سکا (رک بہ مادّۂ غزنویہ)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے دل جیتنے کی بھی خاصی کوشش کی؛ چنانچہ اس کے سکّوں پر شِو کے بَیل کی تصویر اور ''سری سمنہ دیوہ'' کی عبارت دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ نقش اوہنڈ کے بادشاہوں کے سکّوں سے ماخوذ ہیں۔ مودود نو سال حکومت کرنے کے بعد ۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ء میں فوت ہوا.

غزنویوں کی سلطنت دو ماہ تک مسعود دوم، ابن مودود اور اس کے چچا علی بن مسعود کے نام پر قائم رہی۔ پھر عبدالرشید بن سلطان محمود اُن پر غلبہ پا کر مالک تخت بن گیا (۴۴۱ھ)۔ اس کے عہد میں خراسان کا حاکم داؤد سیستان کے راستے بُست اور زمین داور اور اس کا بیٹا آلپ ارسلان طخارستان کی طرف سے غزنہ تک آ پہنچا۔ عبدالرشید کے سپہ سالار طغرل نے، جو سلطان محمود کا غلام تھا، درّۂ خمتار (موجودہ پل خمری) میں آلپ ارسلان کو، بُست میں داؤد کو اور سیستان میں داؤد کے چچا یبغو کو شکست دی، پھر غزنہ پہنچ کر عبدالرشید نیز چند غزنوی شہزادوں کو مار ڈالا (۴۴۴ھ/ ۱۰۵۲ء) اور تخت پر قابض ہو گیا؛ لیکن باشندگانِ غزنہ نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور نوشتگین نے اسے قتل کر کے فرخ زاد بن مسعود کو تخت پر بٹھا دیا (۴۴۴ھ)۔ فرخ زاد نے سات سال حکومت کرنے کے بعد صفر ۴۵۱ھ/ مارچ ۱۰۵۹ء میں وفات پائی اور اس کا بھائی ابراہیم بن مسعود حکمران بن گیا۔ اس نے آلپ ارسلان سے صلح کر لی۔ مشرقی افغانستان کے بعض حصّے لاہور تک اس کے قبضے میں رہے۔ اس نے متعدد بار ہندوستان پر لشکر کشی کی، بہت سے محل، مدرسے اور قلعے (ایمن آباد اور خیر آباد) تعمیر کرائے اور اکتالیس سال تک اطمینان و سکون سے حکومت کرنے کے بعد ۴۹۲ھ/ ۱۰۹۹ء میں وفات پا گیا۔ پھر ابراہیم کا بیٹا علاء الدّین مسعود سوم تخت نشین ہوا، جس کی شادی سلطان سنجر کی بہن سے ہوئی تھی؛ چنانچہ سلجوقیوں سے اس کے مراسم بڑے خوش گوار رہے اور اس طرح اسے ہندوستان میں مزید فتوحات کا موقع ملا۔ ۵۰۸ھ/ ۱۱۱۵ء میں اس کا بیٹا شیر زاد تخت پر بیٹھا، لیکن وہ اپنے بھائی ارسلان شاہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ارسلان نے اپنی سوتیلی ماں (سلطان سنجر کی ہمشیرہ) کی توہین کی اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے دوسرے بھائی بہرام شاہ نے سنجر کے ہاں پناہ لی، جس نے لشکر کشی کر کے ارسلان کو ہندوستان کی طرف بھگا دیا اور بہرام شاہ غزنہ کے تخت پر بیٹھ گیا۔ سلجوقوں کے رخصت ہوتے ہی ارسلان پھر غزنہ میں پہنچا اور بہرام شاہ کو نکال باہر کیا۔ لیکن جلد ہی سنجر نے غزنہ فتح کر لیا اور ارسلان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا (۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء)۔ بہرام شاہ کے عہد میں غزنویوں کی حکومت محض برائے نام رہ گئی تھی اور سکّہ بھی سلطان سنجر کے نام پر جاری ہو گیا تھا۔ بہرام شاہ نے بھی ہندوستان پر لشکر کشی کی۔ ۵۱۲ھ/ ۱۱۱۸ء میں اس نے محمد بالہیم کا خاندان سمیت صفایا کیا، جس نے ملتان میں سرکشی اختیار کر لی تھی اور شوالک میں ناگور کے قلعے کی بنیاد رکھی۔ جب وہ واپس غزنہ پہنچا تو اسے علاء الدین جہان سوز غوری سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ بہرام شاہ کا بیٹا جنگ میں کام آیا، خود بہرام ہندوستان کی طرف پسپا ہو گیا اور غزنہ غوریوں کے قبضے میں آ گیا۔ غوریوں کی مراجعت پر بہرام شاہ غزنہ لوٹا اور ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کا بیٹا خسرو شاہ جانشین ہوا، لیکن اسے غزوں نے غزنہ سے نکال دیا اور وہ لاہور آ گیا، جہاں ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء میں اِس دنیا سے رخصت ہو گیا اور اس کا بیٹا خسرو ملک لاہور کا فرمان روا ہوا۔ غزنویوں کی سلطنت اب سمٹ کر صرف ہندوستانی مقبوضات تک محدود رہ گئی تھی۔ ۵۸۳ھ/ ۱۱۸۷ء میں یہاں بھی ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ یوں کہ سلطان معزّ الدّین بن محمد سام غوری [رک بآں] نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا اور قلعۂ بلروان (غرجستان) میں قید کر دیا، جہاں اس نے ۵۸۷ھ/ ۱۱۹۱ء میں وفات پائی.

غزنویوں کی حکومت اڑھائی سو برس تک افغانستان، ایران اور ہندوستان کے علاقوں میں دریائے دجلہ سے دریائے گنگا کے کناروں تک قائم رہی اور غزنہ، بلخ اور لاہور ان کے دارالحکومت رہے۔ اس دوران میں اسلامی تمدّن اور فارسی زبان نے بڑی ترقی کی، اسلام پوری سلطنت میں رائج ہو گیا اور سلطنت کے مشرقی حصّوں میں ہندو شاہی مذہب اور حکومت کے آثار نابود ہو گئے۔ ابوالعبّاس اسفرائینی، احمد بن حسن میمندی، حسن بن محمد میکالی، خواجہ عبدالصّمد اور خواجہ طاہر سنوفی وغیرہ غزنویوں کے مشہور و معروف وزیر تھے۔ ایران، افغانستان، ہندوستان اور ماوراء النہر وغیرہ ممالک آباد تھے اور وہاں تجارت زوروں پر تھی۔ اس عہد کے مشہور علما، مؤرّخین اور مصنّفین یہ ہیں: البیرونی، ابن سینا، ابوالفتح بُستی، بدیع الزمان ہمدانی، ابوعلی مسکویہ، ابومنصور الثعالبی، ابوالفضل البیہقی، عبدالجبار العتبی، ابونصر مُشکان،

نصر اللہ (صاحبِ کلیلة و دمنة)، ابو منصور مؤفق ہروی (صاحبِ کتاب الأبنیة عن حقائق الأدویة)، عبد الحیّ گردیزی (صاحبِ زین الاخبار)، فخر مدبّر مبارک شاہ (صاحبِ آداب الحرب و الشجاعة) اور ابو الحسن الہجویری الغزنوی (صاحبِ کشف المحجوب)۔ شعرا میں فردوسی، طوسی، فرّخی، عنصری، منوچہری، عسجدی، سنائی، مسعود سعد سلیمان، ناصر خسرو، اسد طوسی، سید حسن غزنوی، ابو الفرج رونی لاہوری اور مختاری غزنوی اس دور کے مشاہیر ہیں۔ ایشیا میں غزنویوں کا دربار شعرا، علما اور اربابِ فن کی تربیت گاہ بنا ہوا تھا۔ خود سلطان محمود ایک عالم فرمان روا تھا۔ بقول ابن خلّکان علمِ حدیث میں اسے یدِ طولیٰ حاصل تھا اور اسی وجہ سے اس نے شافعی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ بعض علما نے اسے فقہ کی بعض کتابوں کا مصنّف قرار دیا ہے اور عوفی نے اس کے اشعار میں سے بعض قطعات نقل کیے ہیں۔ غزنویوں کے زمانے میں نفیس مصنوعات، فنونِ لطیفہ اور بحیثیتِ مجموعی ثقافت نے خاصی ترقی کی۔ مغلوں کی وحشیانہ دست برد سے جو آثار بچ گئے ہیں (سبکتگین اور محمود کے مزار، غزنہ کے دو مینار، بُست کی چھاؤنی کے باقی ماندہ آثار وغیرہ) وہ غزنوی عہد کے فنِ سنگ تراشی، فنِ تعمیر اور خطّاطی کی تروتازگی کا ثبوت ہیں۔

غزنوی عہد میں صوبوں کے نظم و نسق کے لیے مرکزی حکومت کی طرف سے حاکم مقرر کیے جاتے تھے، جن کا انتخاب سپہ سالاروں، حاجبوں، شہزادوں اور دوسرے شاہی مقرّبوں میں سے ہوتا تھا۔ بیہقی کا بیان ہے کہ وزیرِ مالیہ اور صدرِ اعظم کے عہدے وزیرِ دیوان و خواجۂ بزرگ کے سپرد تھے۔ وزارتِ دفاع کا دفتر سپہ سالار کے ماتحت تھا، محکمۂ سفارت اور دفترِ تحریراتِ سلطنت دبیرِ بزرگ اور دیوانِ وکالت حاجبِ بزرگ کی تحویل میں تھے۔ علاوہ ازیں دربار میں ندیم، وزیر، خازن اور کوتوال کے عہدے بھی تھے۔ صوبوں کے ساتھ مضبوط رابطے اور امن و امان کے باعث مالیات میں معتد بہ اضافہ یقینی تھا، چنانچہ ہم مختلف صوبوں سے حکومت کے خزانے میں آمدنی کا اندازہ بیس کروڑ درہم کر سکتے ہیں؛ سونے، جواہرات اور مالِ غنیمت کی بھاری مقدار، جو ہندوستان کی لڑائیوں میں حاصل ہوتی تھی، اس سے مستثنیٰ ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں نظامِ حکومت چلانے کے لیے محکمۂ ڈاک، محکمۂ جاسوسی اور محکمۂ پولیس قائم تھا۔ خلافتِ بغداد اور خوانینِ ماوراء النہر کے ساتھ غزنویوں کے سیاسی تعلّقات بہت دوستانہ تھے اور آپس میں سفیروں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

سلاجقہ، خوارزم شاہی اور ملوکِ سیستان (۴۲۹ - ۶۳۲ھ): سلطان محمود نے غز ترکوں کی شورشوں سے نجات پانے کے لیے ان کے ایک رئیس یَبْغُو ارسلان (المعروف بہ اسرائیل) بن سلجوق کو بطورِ یرغمال کالنجر میں نظر بند کر دیا تھا (۴۱۶ھ/ ۱۰۲۵ء)، لیکن اس کے بھائی میکائیل کے بیٹوں طغرل بیگ، اور چغری بیگ داؤد نے سلطنتِ غزنہ کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا، پھر دندانقان میں سلطان مسعود کو شکست فاش دے کر طغرل (۴۲۹ - ۴۵۵ھ) نے نیشاپور میں حکومت قائم کر لی۔ سلطان مودود کے عہد میں سلاجقہ کا اقتدار جنوب میں سیستان اور شمال میں بلخ و طخارستان تک بڑھ گیا تھا، چنانچہ چغری بیگ کا بیٹا آلپ ارسلان (۴۵۵ھ/ ۱۰۶۳ء - ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ء) طخارستان، بلخ، ترمذ، قباد یان، وخش اور ولوالج پر قابض تھا۔ آلپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ (۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ء - ۴۸۵ھ/ ۱۰۹۲ء) نے سلطان ابراہیم غزنوی سے دوستانہ مراسم قائم رکھتے ہوئے زابلستان اور کابل کے علاقے کو لاہور تک سلطنت غزنہ میں تسلیم کر لیا۔ ملک شاہ کے بیٹے سلطان سنجر (۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء - ۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء) نے بہرام ارسلان کے مقابلے میں شاہِ غزنہ کی حمایت کی اور اسے اپنے ماتحت لاہور تک غزنہ کا بادشاہ بنا دیا (۵۱۱ھ/ ۱۱۱۷ء)۔ یوں اس کی حکومت کی حدود لاہور تک پہنچ گئیں۔ ۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء میں سلطان سنجر کی لڑائی ہرات کے پہاڑوں میں سلطان علاء الدّین حسین جہان سوز سے ہوئی اور جہان سوز کو پکڑ کر غور واپس بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد قرہ خطائیوں اور غزّوں کے نیم وحشی قبیلوں نے وسط ایشیا کے کوہسار سے بغاوت کر کے سنجری حکومت کا صفایا کر ڈالا (۵۵۲ھ/ ۱۱۵۷ء) اور غزنہ، زابل اور سیستان پر یورش کر کے خسرو شاہ غزنوی کو لاہور تک پسپا کر دیا؛ لیکن غوریوں اور خوارزم شاہیوں نے غزوں کا فتنہ جلد ہی دبا دیا۔

افغانستان میں خوارزم شاہیوں کی حکومت کی ابتدا یوں ہوئی کہ ملک شاہ سلجوقی نے انوشتگین غرچہ کو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا تھا (۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء)۔ سنجر نے ۴۹۰ھ/ ۱۰۹۶ء میں اس کے بیٹے قطب الدّین احمد کو اسی عہدے پر مامور کیا۔ وہ فوت ہُوا (۵۲۲ھ/ ۱۱۲۸ء) تو اس کا بیٹا علاء الدولہ اتسز سنجر کے زیرِ سیادت خراسان کی حکومت پر قابض ہو گیا (۵۲۲ھ/ ۱۱۲۸ء - ۵۵۱ھ/ ۱۱۵۶ء)، لیکن کئی بار سنجر سے برسرِ پیکار ہوا۔ اتسز کے بعد اس کا بیٹا ایل ارسلان (۵۵۱ھ/ ۱۱۵۶ء - ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۱ء)، پھر علاء الدّین تکش بن ایل ارسلان (۵۶۸ھ/ ۱۱۷۲ء - ۵۹۶ھ/ ۱۱۹۹ء)۔ علاء الدّین محمد بن تکش (۵۹۶ھ/ ۱۱۹۹ء - ۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء) اور سلطان جلال الدّین منکبرتی بن علاء الدین محمد (۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء - ۶۲۸ھ/ ۱۲۳۰ء) نے افغانستان کے مغربی اور شمالی حصّوں پر حکومت کی۔ غوریوں سے خوارزم شاہیوں کی لڑائی اس عہد کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ غوری مدّت سے غور اور بامیان میں حکومت کر رہے تھے، لیکن ۶۱۱ھ/ ۱۲۱۴ء میں علاء الدّین محمد نے غور، فیروز کوہ اور غزنہ تک ہرات پر قبضہ کر کے انھیں باہر نکال دیا۔ آخری خوارزم شاہی بادشاہ جلال الدّین منکبرتی نے افغانستان میں تاتاریوں سے کئی جنگیں کیں، جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس خاندان کا ایک فرد تاج الدین نیالتگین سیستان، نیہ، غور، تولک اور اسفزار پر قابض ہو گیا تھا (۶۱۳ھ/ ۱۲۱۵ء)، لیکن تاتاریوں کے ہاتھوں سیستان کے قلعے میں محصور ہو کر مارا گیا [رک بہ مادّہ ہائے سلجوق، آل؛ خوارزم شاہ؛ قرہ خطائی]۔

اس وقت افغانستان چار حصّوں میں منقسم تھا: (۱) طخارستان سے مرو تک شمالی صوبے براہِ راست سنجری دربار سے ملحق تھے؛ (۲) غور، بامیان اور گوزگانان (ہرات کی حدود تک) کے علاقے غوریوں کے ماتحت تھے؛ (۳) علاقہ زابل

ہلمند سے غزنہ و کابل تک اور ننگرہار سے پشاور و لاہور تک آلِ محمود غزنوی کے پاس تھا اور (۴) ولایتِ سیستان (بُست اور زمین داور سے زرنج، فراہ اور نیہ تک) ملوک سیستان کے تابع تھی.

ملوکِ سیستان صفّاری اور مقامی امرا کے اخلاف میں سے تھے اور ان کے تعلقات سلجوقیوں، غوریوں، غزنویوں، حتّٰی کہ چنگیزی تاتاریوں کے ساتھ بھی دوستانہ رہے۔ ان میں سے طاہر بن محمد (م ۵۲۰ھ/ ۱۱۲۶ء) اور تاج الدّین بن طاہر (م ۵۵۹ھ/ ۱۱۶۳ء) سلطان سنجر کے سیاسی اقتدار کے ماتحت تھے۔ شمس الدّین سالیس بن تاج الدّین (م ۵۶۲ھ/ ۱۱۶۶ء)، اس کا بھتیجا تاج الدّین حرب (۵۶۴ھ/ ۱۱۶۸ء - ۶۱۲ھ/ ۱۲۱۵ء)، ناصر الدّین عثمان (م ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء)، بہرام شاہ بن تاج الدّین حرب (۶۱۳ھ/ ۱۲۱۶ء - ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء) اور نصر الدّین بن بہرام شاہ (م ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء) شاہانِ غور کے ساتھ رشتہ دارانہ اور دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ بعد ازاں محمود بن بہرام شاہ، محمود ابن حرب، شمس الدّین علی مہربانی (م ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء)، مبارز الدّین بن مسعود (م ۶۴۷ھ/ ۱۲۴۹ء) اور آلِ کرت (دیکھیے سطور آئندہ) کے بادشاہوں نے بھی تاتاری حملہ آوروں سے ساز باز کر کے سیستان کو اپنے قبضے میں رکھا۔ سیستانی ملوک کے اس صفّاری خاندان میں سے شاہ حسین بن ملک غیاث الدّین، مؤلفِ احیاء الملوک، نے زمانۂ قدیم سے اپنے زمانے تک صفّاریوں کی تاریخ لکھی۔ سیستان میں اس نسل کے امرا ایک ہزار سال تک باقی رہے.

غوری (سوری) (۴۰۵ - ۶۱۲ھ): خراسان و غور کے ایک قبیلے ''سوری'' کے امرا شیوعِ اسلام سے پہلے طخارستان، غور، ہرات اور خراسان کے کوہستان میں حکومت کرتے اور غُر شاہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے (غُر = پہاڑ)۔ شنسب بن خرنک (۴۰ - ۸۰ھ)، جس نے حضرت علیؓ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا، اس خاندان کا پہلا مسلمان حکمران ہے۔ اس کے بیٹے امیر پولاد (۱۳۰ھ/ ۷۴۷ء) نے ابومسلم خراسانی کی اعانت کرتے ہوئے عبّاسی تسلّط کے قیام میں بڑا حصّہ لیا۔ پولاد کے ایک بیٹے امیر کروڑ (=سخت اور مضبوط [رک بآن])، المعروف بہ جہان پہلوان (۱۳۹ - ۱۵۴ھ) کے عہد میں اس خاندان کا اقتدار زمین داور، بُست اور والشان پر چھایا ہوا تھا۔ امیر کروڑ پشتو کا اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا امیر ناصر (۱۶۰ھ/ ۷۷۶ء) حکمران ہوا۔ بقولِ منہاج سراج ۱۷۰ھ میں امیر نجی بن نہاران شنسبی غور کا بادشاہ تھا، جو اپنے سپہ سالار رشیش بن بہرام کے ساتھ ہارون الرشید کے دربار میں پہنچا، جہاں اسے ''قسیمِ امیر المؤمنین'' کا خطاب ملا۔ صفّاریوں کے عہد میں غور کی امارت امیر سوری کو مل چکی تھی (نواح ۲۵۳ھ/ ۸۶۷ء)۔ سلطان سبکتگین کے عہد میں غور پر حملے ہوئے، لیکن اس خاندان کی خودمختاری کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ سلطان محمود نے بقول البیہقی ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴ء اور بقول ابن الأثیر ۴۰۱ھ/ ۱۰۱۰ء میں دس ہزار فوج کے ساتھ حملہ کر کے غور کے حکمران امیر محمد سوری کو قلعۂ آہنگران میں محصور کر دیا، جس نے کچھ عرصے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ سلطان اسے اور اس کے چھوٹے بیٹے شیش کو اپنے ساتھ غزنہ لے گیا، لیکن اس نے قید کی ذلّت پر موت کو ترجیح دی اور راستے ہی میں زہر کھا لیا۔ اس کی وفات کے بعد سلطان نے اس کے بیٹے امیر ابوعلی بن محمد کو غور کا حکمران مقرّر کیا، جو ایک علم دوست انسان تھا۔ اس نے غور میں کئی مدرسے، مسجدیں اور محلّات بنوائے۔ مسعود غزنوی کے عہد میں اس کے بھتیجے عبّاس بن شیش نے اسے قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا (۴۲۵ھ/ ۱۰۳۳ء)۔ اسے علمِ نجوم کا شوق تھا، چنانچہ مندیش میں قلعۂ سنگھ کے اندر اس نے ایک رصد گاہ قائم کی؛ لیکن عبّاس بہت ظالم اور ستم گر تھا۔ لوگوں نے تنگ آ کر سلطان ابراہیم غزنوی سے فریاد کی، جس نے غور پر لشکر کشی کر کے اسے غزنہ میں قید کر دیا اور اس کے بیٹے امیر محمد کو غور کا حکمران بنا دیا۔ وہ ایک علم نواز، نیک سیرت اور عادل انسان تھا (۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء)۔ اس کا بیٹا اور جانشین قطب الدّین حسن (۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷ء)، جو سلاطین غور کا جدِ امجد تھا، ۴۹۳ھ/ ۱۰۹۹ء میں باغیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کا بیٹا ملک عزالدین حسین (۵۱۰ھ) وارثِ تخت ہوا۔ سنجری سلطنت سے اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کے سات بیٹوں نے خراسان، غور، زابل، غزنہ، بامیان اور طخارستان کے علاقے فتح کر کے ان پر حکومت کی، جس کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) قطب الدین محمد، المعروف بہ ملک الجبال (غرشاہ) نے شہر فیروزکوہ بسایا اور قلعہ تعمیر کیا۔ ولایتِ ورشاد پر بھائیوں سے اس کا جھگڑا ہو گیا اور وہ غزنہ چلا گیا، جہاں بہرام شاہ غزنوی کے ہاتھوں مارا گیا (۵۴۱ھ/ ۱۱۴۶ء)۔ یہی قتل غوریوں اور غزنویوں کے اختلاف کا باعث بنا.

(۲) بہاء الدّین سام، حاکم مندیش غور (۵۴۴ - ۵۵۴ھ): قطب الدّین محمد غزنہ جاتے ہوئے فیروزکوہ بہاء الدّین کے حوالے کر گیا، جہاں وہ ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے کئی قلعے تعمیر کرائے اور ملک بدرالدّین گیلان کی لڑکی سے نکاح کیا، جس کے بطن سے سلطان معزالدّین محمد سام اور سلطان غیاث الدّین پیدا ہوئے۔ اس نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے غزنہ پر یورش کی لیکن راستے ہی میں بمقام گیلان اس دنیا سے رخصت ہو گیا.

(۳) مادین کا خطّہ ملک شہاب الدّین محمد خرنک (۵۵۰ھ) کے حصّے میں آیا۔ اس کا بیٹا ملک ناصر الدّین ابوبکر، جو ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء میں گزیو اور تمران (شمالی قندہار) کا حاکم تھا، تاتاریوں کے حملے کے بعد التتمش کے دربار میں دہلی چلا گیا اور وہیں ۶۲۰ھ میں اس نے وفات پائی.

(۴) ملک شجاع الدّین علی جرماس کا حاکم تھا (۵۵۰ھ)، جس کا جانشین اس کا بیٹا علاء الدّین ابنِ علی ہوا (۵۹۹ھ/ ۱۲۰۲ء)۔ سلطان غیاث الدین نے بُست، وجیر، گرم سیر، درمشان، رُوزگان اور غزنہ کا خطّہ اس کے سپرد کر دیا۔ فتحِ خراسان کے وقت وہ نیشاپور میں حکمران تھا۔ سلطان معزالدّین نے اسے غرجستان اور زمین داور کا حاکم بنا دیا۔ ۶۰۱ھ/ ۱۲۰۴ء میں اس نے ملاحدۂ کوہستان کا قلعۂ

کا رخِ جناباد فتح کر لیا، لیکن سلطان معزالدّین کی شہادت کے بعد اسے قلعۂ غرجستان میں قید کر دیا گیا۔

(۵) علاءالدّین حسین (۵۴۴-۵۵۱ھ)، حاکم وجیرستان، ملک بہاءالدّین کی وفات کے بعد فیروزکوہ میں ممالک غور کے تخت پر بیٹھا۔ اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے وہ تگین آباد کے قریب بہرام شاہ غزنوی سے نبرد آزما ہوا اور شکست دے کر غزنہ پر قابض ہو گیا، شہر کو آگ لگا دی اور باشندوں کا قتل عام کیا۔ بُست کا بھی یہی حشر ہوا۔ اسی بنا پر اسے جہان سوز کا لقب ملا۔ اس نے طخارستان فتح کر کے اسے اپنے بھائی فخرالدّین کے سپرد کر دیا، پھر سلطان سنجر سے ٹکّر لی، لیکن گرفتار ہو گیا۔ سلطان نے از راہِ نوازش اسے واپس غور بھیج دیا۔ وہ بامیان، گرم سیر، داور، بُست، تولک، جبال ہرات، غرجستان اور مرغاب کو بھی حکومتِ غور کے قبضے میں لے آیا۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا سیف الدّین فیروزکوہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے ملاحدہ کے داعیوں کا قتلِ عام کیا اور غزّوں کے مقابلے کی سعی کی، لیکن ایک سال سے زیادہ زندہ نہ رہا اور اپنے ہی سپہ سالار کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔

(۶) سلطان سیف الدّین سوری (۵۴۳ھ/ ۱۱۴۸ء- ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء)، حاکمِ استیہ، غوریوں کا پہلا حکمران تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اس نے اپنے بھائی قطب الدّین کے خون کا بدلہ لینے کے لیے غزنہ پر چڑھائی کی اور بہرام شاہ کو بھگا کر غزنہ پر قابض ہو گیا؛ لیکن بہرام شاہ نے جلد ہی افغانوں اور خلجیوں کی فوج لے کر یلغار کر دی اور سلطان سوری نیز اس کے وزیر سیّد مجدالدین موسوی کو گرفتار کر کے پلِ طاق پر پھانسی دے دی۔ جہان سوز نے اسی کے انتقام میں غزنہ کو ویران کیا تھا۔

(۷) ملک فخرالدین مسعود (۵۴۰ھ) تمام بھائیوں میں سب سے بڑا اور کشی کا امیر تھا۔ جہان سوز نے طخارستان اس کے سپرد کر دیا۔ بعد ازاں اس نے جبال شغنان، پردرواز، وخش اور بدخشان تک قبضہ کر لیا۔ جنگ راغ زر میں اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اسے بامیان میں بھیج دیا گیا وہیں جاں بحق ہو گیا (۵۵۰ھ/ ۱۱۵۵ء)۔ اب اس کا بیٹا شمس الدین محمد بامیان کا امیر بنا۔ اس نے سلطان غیاث الدّین کی تائید سے افغانستان کے ایک وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا اور خوارزم شاہیوں کے مقابلے کے لیے غور کے لشکر میں شرکت کی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا علم دوست بیٹا بہاءالدّین سام تخت نشین ہوا، جس کے دربار میں امام فخرالدّین رازی، شیخ الاسلام جلال الدّین ورسل (؟) اور مولانا سراج الدّین جوزجانی جیسے علما موجود تھے۔ اس کی سلطنت کشمیر سے کاشغر، ترمذ سے بلخ اور جنوب میں غور و غرجستان کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان معزالدّین کی شہادت کے بعد امرا نے اسے غزنہ بلایا، لیکن وہ گیلان کے مقام پر فوت ہو گیا (۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء)۔ اس نے چودہ برس حکومت کی۔ اس کے بیٹے جلال الدّین علی نے حکومت سنبھالی اور اپنے بھائی علاءالدّین کو غزنہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ جب تاج الدّین یلدوز نے مؤخّر الذّکر پر حملہ کیا اور جلال الدّین اس کی مدد کے لیے گیا تو اس کے چچا علاءالدّین مسعود نے بامیان کے تخت پر قبضہ کر لیا، لیکن جلال الدّین نے غزنہ کا تصفیہ کرنے کے بعد واپس جا کر چچا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ عرصے بعد یلدوز نے پھر غزنہ پر حملہ کیا اور علاءالدّین شکست کھا کر محصور ہو گیا۔ جلال الدّین اس کی مدد کے لیے پہنچا، لیکن دونوں بھائی یلدوز کے ہتّھے چڑھ گئے اور بامیان کی طرف لوٹا دیے گئے۔ وہیں انھوں نے وفات پائی (نواح ۶۱۲ھ/ ۱۲۱۵ء)۔

یہ تھا غوری حکومت کی تشکیل کرنے والے سات بھائیوں کا مختصر سا حال۔ ان کے بعد سلطان غیاث الدّین محمد سام بادشاہ ہوا۔ اسے اور اس کے بھائی معزالدّین کو ان کے چچا علاءالدّین نے قلعۂ وجیرستان میں قید کر دیا تھا، لیکن سلطان سیف الدین ابن علاءالدّین (۵۵۱ھ) نے انھیں رہا کر دیا۔ سیف الدّین کو اس کے سپہ سالار ابوالعباس شیش نے قتل کر کے غیاث الدّین کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اسے فیروزکوہ میں تخت پر بٹھا دیا (۵۵۸ھ/ ۱۲۶۲ء)۔ غیاث الدّین کے عہد کے اہم واقعات یہ ہیں: اس نے ابوالعبّاس شیش کو مار ڈالا۔ راغ زر کے مقام پر اپنے چچا ملک فخرالدّین مسعود اور اس کے حلیفوں (ملک علاءالدّین تماج سنجری، حاکم بلخ اور تاج الدّین یلدوز، حاکمِ ہرات) کی متحدہ افواج کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی۔ تماج ہلاک ہو گیا اور ملک فخرالدّین مسعود کو پکڑ کر احترام کے ساتھ بامیان کی طرف لوٹا دیا گیا۔ بعد ازاں غیاث الدّین نے گرم سیر، زمین داور، قادس، کالیوَن، فیوار، سیف رود (غرجستان)، طالقان، مرو اور گرزیوان کو سلطنتِ غور سے ملحق کر لیا۔ اس کے بھائی معزالدّین نے ۵۲۹ھ/ ۱۱۷۳ء میں غزّوں کو غزنہ سے پسپا کر کے اسے بھی حدودِ سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۵ء میں ہرات ۵۷۳ھ/ ۱۱۷۷ء میں فوشنج کا بھی الحاق ہو گیا، ملوکِ سیستان نے بھی گھٹنے ٹیک دیے اور شمالی ممالک، مثلاً مرغاب، اندخود، میمنہ، فاریاب، پنجدہ وغیرہ بھی فتح کر لیے گئے۔ ۵۸۸ھ/ ۱۱۹۲ء میں غیاث الدّین نے جلال الدّین محمود بن ایل ارسلان خوارزم شاہ کو شکست دی، جس نے مملکت کے شمالی علاقوں کو گزند پہنچایا تھا۔ ۵۹۶ھ/ ۱۱۹۹ء میں خراسان کو صاف کر کے نیشاپور تک پیش قدمی کی گئی۔ اس طرح غیاث الدّین کی حدودِ سلطنت ہندوستان سے عراق تک اور دریاے جیحون سے آبناے ہرمز تک پھیلی ہوئی تھیں۔ خلیفۂ بغداد نے سلطنتِ غور کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا اور دونوں درباروں میں سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ غیاث الدّین نے ہرات میں بتاریخ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۵۹۹ھ/ ۱۱ فروری ۱۲۰۳ء وفات پائی۔ وہ علم دوست اور انصاف پرور بادشاہ تھا۔ شروع میں مذہبًا اپنے اسلاف کی طرح محمد کرّام سیستانی کا پیرو تھا، لیکن بعد ازاں اس نے شافعی عقیدہ اختیار کر لیا۔ اس کی مہر پر کلمۂ "حسبی اللّٰہ وحدہ" کندہ تھا۔ اس کا گرمائی دارالحکومت فیروزکوہ اور سرمائی دارالحکومت زمین داور تھا۔

سلطان غیاث الدین محمد سام کے حکم سے اس کا بھائی ابوالمظفر معزالدین

محمد بن سام قسیم امیر المؤمنین غزنہ کے تخت پر بیٹھا تھا (۵۶۹-۵۷۰ھ/۱۱۷۳ء)۔ ۵۷۰ھ میں اس نے گردیز فتح کیا اور قرامطہ سے ملتان چھین لیا؛ ۵۷۳ھ/ ۱۱۷۷ء میں سنقر ان کے باغیوں کی گوش مالی کی؛ ۵۷۴ھ میں بھیم دیو نہروالہ کے خلاف اس کی مہم ناکام رہی؛ ۵۷۵ھ میں اس نے فرشور (پشاور) اور ۵۷۷ھ/ ۱۱۸۱ء میں لاہور پر قبضہ کرلیا اور آخر عمر تک ہندوستان کو فتح اور اسے نورِ اسلام سے منوّر کرنے میں کوشاں رہا (تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ غوریہ)۔ ۳ شعبان ۶۰۲ھ/ ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو، جب وہ کھوکھروں کی بغاوت فرو کرکے ہندوستان سے غزنہ جارہا تھا فرقۂ ملاحدہ کے ایک فدائی نے اسے شہید کردیا۔ سلطان محمد غوری نے ایشیا کے وسط میں ایک وسیع مملکت کی بنیاد رکھی اور ہندوستان میں گنگا کے کنارے تک اسلامی پرچم لہرا دیا۔ اس کی سلطنت مشرق میں بنارس سے مغرب میں خراسان تک اور شمال میں خوارزم سے جنوب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پرچم دائیں طرف سے سرخ اور بائیں طرف سے سیاہ تھے اور بقول منہاج سراج خزانوں میں مال و دولت کی کثرت تھی۔

سلطان غیاث الدّین محمد کی وفات (۵۹۹ھ) پر سلطان معزالدّین نے اس کے بیٹے غیاث الدّین محمود کو بُست، فراہ اور اسفزار کا حاکم مقرر کیا تھا۔ سلطان معزالدّین کی شہادت کے بعد وہ غور کی سلطنت کو غرجستان، طالقان، گرزیوان، قادس اور گرم سیر سمیت اپنے حیطۂ اقتدار میں لے آیا۔ اس نے تاج الدّین یلدوز کو غزنہ اور قطب الدّین ایبک کو ہندوستان کی حکومت کا فرمان عطا کیا۔ بعد ازاں اس نے علاءالدّین اتسز شنسبی کے لشکر کو، جسے سلطان محمد خوارزم شاہ کی اعانت حاصل تھی، شکست دی اور علی شاہ بن تکش خوارزم کو، جو غور کی طرف بھاگ گیا تھا، قصرِ برکوشک میں قید کردیا۔ ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں غیاث الدّین محمود کو علی شاہ کے ملازموں نے اچانک قتل کردیا۔ اس کا چہاردہ سالہ بیٹا بہاءالدین سام صرف تین ماہ تک تخت نشین رہ سکا اور سلطان علاءالدین اتسز بن علاءالدین جہان سوز نے اسے نکال کر فیروزکوہ پر قبضہ کرلیا۔ اتسز نے چار سال حکومت کی، پھر ملک نصیرالدّین حسین، امیر شکار، نے غزنہ سے غور پر حملہ کرکے اتسز کو جرماس کے مقام پر قتل کر دیا (۶۱۱ھ/ ۱۲۱۴ء) اور غور غزنوی حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ ۶۱۱ھ میں تاج الدّین یلدوز نے علاءالدّین دُرِغور کو فیروزکوہ کے تخت پر بٹھا دیا، لیکن اگلے ہی سال وہ سلطان خوارزم شاہ کے قابو میں آگیا اور پورا غور خوارزم شاہی سلطنت میں شامل ہوگیا۔

سلطان محمد غوری کی شہادت (۶۰۲ھ) کے بعد ہی غوریوں کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور مختلف علاقوں پر سلطان کے مختلف امرا کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ تاج الدّین یلدوز، حاکمِ غزنہ، کی ایک بیٹی قطب الدّین ایبک (حاکمِ ہند) اور دوسری ناصرالدین قباچہ (حاکمِ سندھ) سے بیاہی گئی تھی۔ جب ایبک نے غزنہ پر حملہ کیا تو یلدوز پنج ند کے مقام پر شکست کھا کر کرم کی طرف چلا گیا۔ ایبک غزنہ پر چالیس روز حکومت کرنے کے بعد ہندوستان لوٹ گیا اور یہ علاقہ یلدوز ہی کے قبضے میں رہ گیا؛ تاہم سلطان محمد خوارزم شاہ کی فوجوں سے ہزیمت اٹھا کر یلدوز کو ہندوستان کی طرف فرار ہونا پڑا، جہاں وہ سلطان التتمش کے خلاف لڑتا ہوا گرفتار ہوا اور بدایون میں مارا گیا (۶۱۱ھ/ ۱۲۱۴ء)۔

حکومتِ غوریہ کے خاتمے (۶۱۲ھ/ ۱۲۱۵ء) پر خوارزم شاہیوں نے شمالی علاقوں اور غور و ہرات پر قبضہ کرلیا۔ سیستان سے بُست تک کا علاقہ نیز تگین آباد اور زابلستان مقامی ملوکِ سیستان کے قبضے میں آگئے۔

غوریوں کے عہد میں غزنوی تمدّن پورے کمال کو پہنچا۔ فارسی ادب غوری فاتحین کے توسط سے دہلی تک پہنچ گیا۔ پشتو شعر و ادب کی زبان بنی۔ اسلام پورے افغانستان نیز ہندوستان کے بہت بڑے حصّے میں پھیل گیا۔ فنِ تعمیر نے بڑی ترقی کی (جامع مسجد ہرات، قطب مینار دہلی)۔ نامور علما اور شعرا کی سرپرستی سے علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں سے امام فخرالدین رازی، نظامی عروضی سمرقندی، احمد میدانی نیشاپوری (صاحبِ مجمع الامثال)، علی باخزری (صاحبِ دمیة القصر)، قاضی منہاج سراج (صاحبِ طبقات ناصری)، ابونصر فراہی (صاحبِ نصاب)، محمد عوفی (صاحبِ لباب) وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

تاتاریوں کا خروج (۶۱۶-۶۴۰ھ): غزنویوں اور غوریوں کا اقتدار مٹ چکنے کے بعد سیستان میں مقامی بادشاہ، مشرقی افغانستان کے علاقوں میں غوریوں کے مقرر کردہ امرا، ہرات میں آلِ کرت اور شمالی افغانستان میں خوارزم شاہی حکومت کررہے تھے۔ چنگیز خان (تموچین، ولادت: ۵۴۹ھ/ ۱۱۵۴ء) منگولیا میں ایک وسیع سلطنت کی بنیاد رکھ چکا تھا۔ ۶۱۶ھ/ ۱۲۱۹ء میں اس کا تصادم سلطان محمد خوارزم شاہ سے ہوا، جس کے ایک عامل نے تاتاریوں کے ایک تجارتی قافلے کو لُوٹا اور چنگیز خان کے سفیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چنگیز خان اپنے کثیر لشکر کے ساتھ ایک بے پناہ سیلاب کی طرح اٹھا، سلطان کی فوج کو شکست دے کر بخارا، سمرقند، بناکت، خجند، جند اور ماوراءالنہر کے دوسرے شہروں کو تاراج کرکے ظلم و بربریت کی ایک عدیم النظیر مثال قائم کردی۔ خوارزم شاہ بھاگ کر مقابلہ کے لیے بلخ پہنچا اور افغانستان کے مشہور شہروں کو تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف امرا کے سپرد کردیا۔ ربیع الاوّل ۶۱۷ھ/ [مئی] ۱۲۲۰ء میں تاتاریوں نے بلخ فتح کرکے خوارزم شاہ کے تعاقب میں ہرات کا رخ کیا اور فوشنج تک قتلِ عام کرتے ہوئے طوس پہنچ گئے۔ خوارزم شاہ نے بحیرۂ خزر کے جزیرے آبسکون میں وفات پائی (شوال ۶۱۷ھ) اور تاتاریوں نے اس کے دارالسّلطنت ارگنج کو، جو ایشیا کا نہایت پُررونق شہر اور علم و دانش کا مرکز تھا، ویران کرڈالا۔ اس کا خاندان اسیر ہوگیا، البتہ اس کا بیٹا جلال الدّین نیشاپور اور بُست ہوتا ہوا ہرات پہنچ گیا۔ اس کے بعد چنگیز خان نے ترمذ اور بلخ کو فتح کرکے لوگوں کا قتلِ عام کیا اور اس کے بیٹے تُولی نے مرو، بیہق اور نسا سے فیروزکوہ، آستیہ اور تولک تک کے شہروں کو مسخّر اور تباہ و برباد کردیا۔ اس کے بعد ہرات، جوزجانان، اندخود، میمنہ، فاریاب، بامیان نیز طخارستان کے شہروں کا بھی یہی حشر ہوا (۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء)۔

اس وقت آخری خوارزم شاہ جلال الدّین منکبرتی نے ہرات سے غزنہ پہنچ کر افغان رؤسا کی اعانت سے ایک لشکر جرّار جمع کیا اور پروان (موجودہ جبل السراج) میں چنگیزی فوجوں کو، جن کا سپہ سالار قوتو قا تھا، شکست فاش دی؛ لیکن بدقسمتی سے خوارزم شاہ کے سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی اور چنگیز خان شکست کا انتقام لینے کے لیے طالقان فتح کر کے غزنہ پر چڑھ آیا۔ خوارزم شاہ نے بڑی جرأت اور جواں مردی سے اس کا مقابلہ کیا۔ دریاے سندھ کے کنارے اس کا بیٹا شہید ہو گیا، اہلِ حرم غرقاب ہو گئے اور خود لڑتا بھڑتا دریا کو عبور کر گیا۔ چنگیز خان نے تین ماہ تک پشاور اور پنجاب کی سرحدوں پر چترال تک قتلِ عام اور لوٹ مار کی، پھر اپنے دو بیٹوں اوگدائی اور چغتائی کو یہاں چھوڑ گیا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کی مثال سے حوصلہ پا کر ہرات اور نیشاپور میں لوگوں نے بغاوت کی، لیکن تاتاریوں نے ہر جگہ بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا۔ اس سلسلے میں نیشاپور تاراج ہو گیا۔ مزید براں چغتائی کے ہاتھوں سندھ، مکران اور وادی کرم کے شہر ویران و برباد ہوے۔ ۶۱۹ھ میں چنگیز اپنے بیٹوں سمیت ماوراء النہر لوٹ گیا۔ رمضان ۶۲۴ھ/اگست ۱۲۲۷ء میں اس کی موت نے دنیا کو ایک بڑے عذاب سے نجات دے دی اور افغانستان اس کے بیٹے تُولی خان کے حصّے میں آیا۔ اُدھر جلال الدّین نے ہندوستان پہنچ کر ایک جماعت تیار کر لی اور ناصر الدّین قباچہ، حاکمِ سندھ، کو شکست فاش دے کر ٹھٹھہ تک پیش قدمی کی۔ پھر وہ ۶۲۱ھ/ ۱۲۲۴ء میں کرمان (ایران) چلا گیا، جہاں اس نے تفلس، خلاط، گرجستان اور ارمنستان تک کے علاقے فتح کر لیے۔ ۶۲۸ھ/ ۱۲۳۰ء میں اس نے میّافارقین میں کُردوں کے ہاتھوں شہادت پائی اور اس طرح خوارزم شاہی خاندان کا آخری چراغ گُل ہو گیا۔

تاتاریوں کی ماتحتی میں ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء سے ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۵ء تک سیف الدّین حسن قرلغ نے غزنہ اور بامیان پر حکومت کی اور عباسی خلیفہ کے نام کا سکّہ چلایا۔ ۶۲۶ھ/ ۱۲۲۹ء میں جب خراسان کے باشندوں نے علَمِ بغاوت بلند کیا اور سرکشی کے شعلے پورے افغانستان میں پھیلے تو تاتاریوں نے دوبارہ قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ بعد ازاں جنتمور خراسان کا حاکم مقرّر ہوا (۶۳۰ھ/ ۱۲۳۲ء)۔ اس نے ملک بہاء الدّین کو خراسان کا امیر بنا دیا۔ پھر ۶۳۵ھ/ ۱۲۳۷ء کے قریب نُوسال اور ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء میں گرگوز واور ۶۴۱ھ/ ۱۲۴۳ء سے ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء تک امیر ارغون تاتاری دربار کی طرف سے خراسان کے حاکم رہے۔ اس دوران میں آلِ کرت تاتاریوں کے زیرِ اطاعت ہرات، فیروزکوہ اور غرجستان پر حکومت کرتے تھے، چنانچہ جب ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء میں چنگیز کا پوتا ہلاگو (۶۳۹ھ/ ۱۲۴۱ء-۶۴۹ھ/ ۱۲۵۱ء) خراسان میں آیا تو ملک شمس الدّین کرت نے اظہارِ اطاعت کیا۔ ماوراء النہر میں مقیم چغتائی سردار غزنہ اور کابل تک کے علاقے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ تلوار کے بل پر مسلّط رہے اور انھوں نے تیس برس کے عرصے میں جان و مال کے علاوہ یہاں کے علوم و تمدّن کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ افغانستان کے تمدّن میں، جو قدیم آریائی اور عربی اسلامی تمدّنوں کا ممزوج تھا، تاتاری عنصر بھی شامل ہو گیا، جس کا اثر زبان و لغات، آدابِ معاشرت، عادات و اخلاق، ہر بات پر پڑا۔ نظم و نسق اور دفتری و سیاسی امور بھی متأثّر ہوے بغیر نہ رہے۔ چنگیزی سپہ سالاروں نے یاسا، یعنی تاتاریوں کے قوانین و احکام، سختی سے نافذ کر دیے۔ بقولِ کاترمیئر (مقدمۂ جامع التواریخ، از رشیدی) تاتاری خوانین اپنے مسلمان مشیروں (حاجبوں اور قاضیوں) کے ذریعے اسلامی احکام و آداب کی نگہداشت بھی کرتے تھے۔ تاتاریوں کے مذہبی پیشوا (کشیش یا تؤین) سحر و جادو کے اثرات زائل کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے ہاں اویغوری رسم الخط رائج تھا۔ قُورچی (ہتھیار اٹھانے والا)، چَرَبی (دربان)، اُخْتہ چی (گھوڑوں کا محافظ)، یساول (نقیب)، قراؤل خاصہ اور کشکچی (محافظ)، بہادر (مبارز)، داروغہ (آمر)، نوئین یا نویان (شہزادہ)، اُلغ نویان (بڑا شہزادہ)، ترخان (لشکر کا سردار) وغیرہ دربار کے معزّز لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ بادشاہ کو قاآن اور خاقان کہتے تھے۔ لشکر دس دس ہزار کے دستوں (تومان) پر مشتمل اور میدانِ جنگ میں جُرُنغار (میسرہ)، برنغار (میمنہ)، قُول (قلب، جہاں خان کی قیام گاہ ہوتی تھی)، چنداول (ساقہ)، ہراول (مقدمہ) اور قراول (طلایہ) میں منقسم ہوتا تھا۔ خوراک، ساز و سامان اور عورتوں کے حصّے کو اغروق کہتے تھے۔ شاہ راہوں پر مسافروں کے لیے سرائیں (یام) بنی ہوئی تھیں، جہاں ڈاک کے گھوڑے (الاغ) موجود رہتے تھے۔ قضا کے محکمے کو یرغُو، قاضی کو یرغوچی ان کے حکم ناموں کو مُوچُلکا، خان کے مہر بردار کو تمغاچی اور مہر کو تمغا کہتے تھے۔ جس فرمان پر تمغا ثبت ہوتا تھا اس کی اطاعت لازم سمجھی جاتی تھی۔ بسا اوقات تاتاری سرداروں کی مجلس شوریٰ (قوریلتای) تشکیل دی جاتی تھی۔ جگہ جگہ فوجی چھاؤنیاں (یورت، اردو) قائم تھیں۔ اس عہد میں چین کے فنِ نقاشی کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ کاشی کاری، معماری اور ریشمی کپڑے، زربفت، قالین وغیرہ بننے کی صنعت نے بھی ترقی کی۔ چین سے افغانستان، ہند، ایران، عراق اور روم کے تعلّقات قائم ہونے لگے اور ان ممالک میں شاہ راہیں بن گئیں؛ لیکن صنعت و تجارت کی یہ ترقی اس وقت عمل میں آئی جب چنگیز کے مرنے کے بعد اس کے اخلاف میں وحشت و بربریت کم ہو گئی۔ تاتاریوں کے دور کے علما و شعرا میں مولانا روم، شیخ نجم الدّین دایہ (مرصاد العباد)، نصیر الدین طوسی، معین الدین جُوینی (نگارستان)، شیخ فرید الدین عطار، مولانا جامی، امامی ہروی، امیر حسینی غوری (نزھۃ الارواح) اور سلیمان ماکو (تذکرۂ اولیاء، پشتو) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

افغانستان پر حسبِ ذیل تاتاری بادشاہوں نے حکومت کی: (۱) چنگیز (۶۱۶-۶۱۸ھ)؛ (۲) اوگدائی بن چنگیز (۶۱۸ھ)؛ (۳) چغتائی بن چنگیز (۶۱۸-۶۳۹ھ)؛ (۴) قراہولاگو (۶۳۹-۶۴۹ھ) اور (۵) ارغون بن اباقا (۶۴۳ھ) کے علاوہ (۶) تُولی بن چنگیز (۶۲۰ھ)۔

آلِ کرت اور تاتاریوں کے عہد میں افغانستان کے داخلی امرا (۶۰۰-۷۸۳ھ): سلطان محمد غوری کے عہد میں اس کے ننھیالی رشتہ داروں میں سے دو

بھائی تاج الدّین عثمان مرغنی اور عزالدّین عمر مرغنی معزز درباریوں میں شمار ہوتے تھے۔ رکن الدّین محمد بن تاج الدّین کو چنگیزی ایلچیوں سے اچھا سلوک کرنے کی بنا پر خیسار، غور اور اس کے متصل شہروں کی حکومت سونپی گئی۔ اس کی وفات (۶۳۴ھ/ ۱۲۴۵ء) کے بعد اس کا بھانجا ملک شمس الدّین محمد مہین بن ابی بکر کرت جانشین ہوا، جو تاتاریوں کا مقرب تھا۔ ۶۴۴ھ میں اس نے تاتاری سپہ سالار سالین نوئین سے مل کر لاہور اور ملتان کو مطیع کیا، لیکن آگے چل کر وہ مسلمانوں اور افغانوں کی حمایت سے متہم ہو کر موردِ عتاب ہوا اور اسے پہلے طائر بہادر، پھر منکوخان کے ہاں پناہ لینا پڑی۔ مؤخّر الذّکر نے قدیم تعلقات کے پیشِ نظر اسے سندھ اور خراسان تک موجودہ افغانستان کا حاکم مقرر کر دیا (۶۴۵ھ/ ۱۲۴۸ء)۔ ۶۴۷ھ میں طالقان، اسفزار، خاف، گرزیوان، تولک، فراہ اور سیستان کے حاکموں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ ۶۴۸ھ میں اس نے افغانستان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا، جس کا اطلاق ان دنوں قندہار اور غرنی سے دریاے سندھ تک کے علاقے پر ہوتا تھا اور اس پر فخر الدّولہ والدّین ملک شاہنشاہ اپنے دارالحکومت مستونگ سے حکمران تھا۔ ملک شمس الدّین نے اس کی شرائطِ مصالحت مسترد کر کے ۶۵۲ھ میں مستونگ کا محاصرہ کر لیا۔ سخت لڑائیوں کے بعد ملک شاہنشاہ اپنے بیٹے بہرام شاہ اور نوّے دوسرے اقربا سمیت مارا گیا۔ اس کا داماد میران شاہ بچ کر سیستان کی طرف نکل گیا، لیکن ۶۵۸ھ/ ۱۲۵۹ء میں واپس آیا تو وہ بھی شمس الدّین کے خلاف ایک لڑائی میں ہلاک ہو گیا۔

افغانوں کے ایک اَور مرکز قلعۂ تیری کے امیر المار افغان نے طایر بہادر اور اس کے برادرِ نسبتی نوئین کو دو بار شکست دی تھی۔ شمس الدّین نے حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور قلعہ امیر حسام الدّین جامل کے سپرد کر دیا (صفر ۶۵۳ھ/ [مارچ] ۱۲۵۵ء)۔ اِسی سال اس نے قلعۂ کھیرا میں شعیب افغان، پھر قلعۂ دُوکی میں اس کے چچیرے بھائی سندان کو سخت لڑائیوں کے بعد مار ڈالا۔ ۶۵۵ھ میں افغانی امرا کا دوسرا مرکز قلعۂ ساجی بھی فتح ہو گیا۔ ۶۶۶ھ تک شمس الدّین پورے افغانستان کو مطیع کر چکا تھا۔ اسی زمانے میں ہرات چنگیزی شاہزادوں کی خانہ جنگی کا مرکز بن گیا اور شمس الدّین خیسار میں پناہ گزین ہو گیا۔ اباقا خان نے فتح یاب ہو کر قدیم جاگیروں کا فرمان اس کے نام جاری کر دیا اور اسے ہرات میں بلا لیا (۶۷۲ھ/ ۱۲۷۴ء)، لیکن چنگیزی شہزادے خراسان پر کسی مقتدر خراسانی کو حاکم نہیں دیکھنا چاہتے تھے اس لیے اسے ۶۷۶ھ میں تبریز بلا کر زہر دے دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ملک رکن الدین (الملقّب بہ شمس الدّین کہین) ہرات میں اس کا جانشین ہوا۔ اس نے چنگیزی شہزادوں سے بدستور مراسم قائم رکھے اور ۶۷۸ھ تک غور و خیسار اور ۶۸۰ھ میں قندہار کے قلعے فتح کیے۔ اس کا بیٹا ملک فخر الدّین ایک علم پرور اور ادیب بادشاہ تھا، جس کی حکومت کو امیر غازان خان نے ہرات سے دریاے سندھ تک تسلیم کر لیا۔ اس کی وفات (۷۰۶ھ/ ۱۳۰۷ء) [لین پول کے مطابق ۷۰۸ھ/ ۱۳۰۸ء] کے بعد امیر اولجایتو نے ہرات، سیستان، غرجستان وغیرہ کی حکومت اس کے بھائی ملک غیاث الدّین محمد (۷۰۶-۷۲۹ھ) کے سپرد کی۔ پھر اس کے حسبِ ذیل بیٹوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی: ملک شمس الدّین دوم (۷۲۹-۷۳۰ھ)؛ ملک حافظ (۷۳۰-۷۳۲ھ)؛ ملک معزالدّین (۷۳۲-۷۷۱ھ)؛ [لین پول، ۷۷۲ھ/ ۱۳۷۰ء]۔ ملک معزالدّین کی وفات (۷۷۱ھ) کے بعد اس کا بیٹا ملک غیاث الدّین تخت نشین ہوا۔ ۷۸۳ھ/ ۱۳۸۱ء میں امیر تیمور نے ہرات فتح کر کے اسے، بیٹے پیر محمد اور بھائی محمد سمیت ماوراء النہر کی طرف ملک بدر کر دیا اور ۷۸۷ھ/ ۱۳۸۵ء میں انھیں قتل کرا دیا۔ اس طرح آلِ کرت کا سلسلہ ختم ہو گیا [لین پول کے مطابق ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۹ء میں]۔

آلِ کرت کے معاصرین میں سے ملوکِ سیستان [رکنِ بآن] کے علاوہ ہوتک امرا قابلِ ذکر ہیں، جو ترنک کے کنارے قلات غلزئی میں حکومت کرتے تھے۔ ان میں سے بابا ہوتک ولد تُولر (۶۶۱-۷۴۰ھ) اور اس کے بیٹے شیخ ملک یار (۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸ء) نے تاتاریوں کے خلاف کئی لڑائیاں کیں۔ اسی خاندان نے بارھویں صدی ہجری میں قندہار کی ہوتکی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

تیموریان ہرات (۷۷۱-۹۲۰ھ): تیمور [رکنِ بآن] نے ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء میں دریاے آمو کو پار کیا، اندخود، سرخس اور فوشنج کو سَر کرنے کے بعد ہرات کو مسخّر کرنے کا ارادہ کیا اور آلِ کرت کے آخری حاکم غیاث الدّین پیر علی کا قصّہ پاک کر دیا۔ اس کا دوسرا حملہ ۷۸۵ھ/ ۱۳۸۳ء میں سبزوار اور فراہ سے شروع ہوا اور زرہ (زرنج) اور سیستان کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ اسی یلغار میں بُست اور قندہار بھی ویران ہو گئے۔ اس طرح سارا ملک تیموری سلطنت کا جز بن گیا۔ ۸۰۰ھ/ ۱۳۹۷ء میں تیمور نے مشرق کا رُخ کیا، اپنے پوتے پیر محمد خان کو کابل، غزنہ اور قندہار کا والی بنایا اور اپنے بیٹے شاہ رُخ کو جاگیر کے طور پر ولایتِ خراسان کی بادشاہت دی، جس کا صدر مقام ہرات تھا۔ پیر محمد خان نے سلیمان کوہ کے افغانوں پر چڑھائی کی، پھر ہندوستان میں پیش قدمی کر دی۔ خود تیمور نے یہ اطلاع پا کر کہ ملتان میں پیر محمد خان کی مزاحمت کی گئی ہے اندراب سے کوہستان ہندوکش پر لشکر کشی کی، پھر لغمان سے دوسری طرف پلٹ کر اس نے سیاہ پوش اور کتور [کیتر] کافروں پر حملہ کیا۔ اس مہم کے بعد اس نے باغی افغانوں پر چڑھائی کی اور دریاے سندھ عبور کیا۔ اس پیش قدمی کے وقت نیز واپسی پر وہ بنّوں سے گزرا تھا؛ لہٰذا غالباً اس نے درۂ ٹوچی کی راہ اختیار کی ہوگی، جو غلزئیوں اور وزیریوں کے علاقے سے گزرتی ہے۔ اس کی فوج میں افغانوں کی موجودگی کے متعلّق کوئی اطلاع نہیں ملتی، حالانکہ تاجیک اس کے لشکر میں شامل تھے۔

جب تیمور فوت ہوا (۸۰۷ھ/ ۱۴۰۵ء) تو پیر محمد [بن غیاث الدّین جہانگیر بن تیمور] کابل میں حکومت کر رہا تھا، لیکن یہ خلیل [بن میران شاہ بن تیمور] تھا جس نے تختِ سلطنت پر قبضہ کر لیا (جانشینانِ تیمور کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے مادّۂ تیمور، بنو)۔ نتیجۃً جو جنگ ہوئی اس کا خاتمہ پیر محمد کے قتل پر ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد

خلیل کو معزول کر دیا گیا اور شاہ رُخ حکمرانِ اعلیٰ بن گیا۔ اس کا عہدِ حکومت، جو چالیس سال تک رہا، امن و امان کا دَور تھا۔ اس عہد میں ملک سال ہاے ماسبق کی تباہی و بربادی سے سنبھلنے کے قابل ہو گیا۔ [شاہ رخ نے تمام شورشوں کا قلع قمع کیا، اندخود، شبرغان، طخارستان، ختلان، بلخ، بدخشان اور سیستان کے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کیے اور کئی شان دار عمارتیں، خانقاہیں اور مدرسے بنوائے۔ ۲۵ ذوالحجہ ۸۵۰ھ/ ۲۳ مارچ ۱۴۴۷ء کو اس نے وفات پائی۔ بعدازں اس کی وسیع سلطنت میں تیموری شہزادوں کے درمیان کئی جھگڑے رونما ہوے اور] یکے بعد دیگرے الغ بیگ [بن شاہ رُخ (۸۵۰ - ۸۵۳ھ) — زیج الغ بیگ اور اولوس اربعہ کا مؤلّف]، عبداللطیف [بن الغ بیگ] (۸۵۳ - ۸۵۴ھ) اور بابر میرزا [بن بایسنقر بن شاہ رخ (۸۵۴-۸۶۱ھ)] وغیرہ تخت نشین ہوے، لیکن ان سب کا عہدِ حکومت مختصر تھا۔ ۸۶۱ھ/ ۱۴۵۶ء میں [سلطان] ابوسعید [گورگان بن سلطان محمد بن میران شاہ بن تیمور] تخت نشین ہوا، لیکن خراسان و افغانستان کی حکمرانی کے لیے حسین [بن منصور بن بایقرا بن عمر شیخ بن تیمور] نے جھگڑا کیا۔ اسے ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء میں شکست ہوئی؛ مگر ابوسعید دو سال بعد فوت ہو گیا۔ اس کا جانشین سلطان احمد خراسان پر ایک دن کے لیے بھی قابض نہ ہوا بلکہ حسین بایقرا جھگڑے کے بغیر اپنے پاے تخت ہرات سے خراسان، سیستان، غور اور زمین داور پر حکمرانی کرتا رہا (۸۷۲-۹۱۱ھ)۔ شاہ رُخ اور حسین بایقرا کے طویل عہدِ حکومت میں شعر و سخن اور علم و فن کے مرکز کے طور پر ہرات اپنی شہرت کے کمال پر پہنچ گیا۔ [اس کا وزیر میر علی شیر نوائی (م ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰ء) جہان بانی اور علم و ادب میں لاثانی تھا۔ اس عہد کے مشاہیر میں حسین واعظ کاشفی، میر خواند، خواند امیر، عبدالرزاق سمرقندی، مولانا جامی اور بہزاد نقاش قابلِ ذکر ہیں۔ اس زمانے میں ہرات کا سیاسی اور علمی اثر و نفوذ استانبول اور جنوبی ہندوستان تک پہنچ گیا اور یہ شہر ایشیا میں علم و ادب، فلسفہ اور صنعت و حرفت کا مرکز بن گیا۔] حسین بایقرا کے عہدِ حکومت کے آخری سنین میں اس کا اقتدار شمال کی جانب سے شیبانی خان اور اس کے ازبکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرے میں پڑ گیا۔ [اس کی وفات (۱۱ ذوالحجہ ۹۱۱ھ/ ۵ مئی ۱۵۰۶ء) کے بعد ہرات کی مرکزی حکومت، جو اس کے شہزادوں بدیع الزمان اور مظفر حسین کے ہاتھوں میں آئی تھی، شیبک خان نامی ایک چنگیزی لٹیرے کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئی] اور افغانستان کے اقطاع الگ الگ حکومتوں میں منقسم ہونے لگے۔

[کُنّر اور یوسف زئی حکمران (۸۰۰-۹۰۰ھ): تیمور کی یلغار کے وقت کُنّر کے درّوں میں ایک مقامی خاندان ''سلطان'' حکومت کرتا تھا۔ اس زمانے میں سلطان پکھل بن کھجامن لغمان سے کنڑ، باجوڑ، سوات اور کشمیر تک کے علاقے پر حکم ران تھا (نواح ۸۰۰ھ)۔ جب وہ فوت ہُوا تو بیٹوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے بھائی سلطان بہرام نے حکومت پر قبضہ کر لیا (نواح ۸۱۰ھ)۔ اس کی حدود کابل سے کشمیر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد زمامِ سلطنت سلطان تومنا کے ہاتھ میں آئی (نواح ۸۵۰ھ)۔ اس خاندان کی حکومت پہاڑی سلسلوں میں محدود رہی۔

آلِ تیمور کے عہد میں کئی افغان قبائل قندہار، گومل وغیرہ سے ہجرت کر کے کابل کے درّوں میں آباد ہو گئے۔ ۸۷۰ھ/ ۱۴۶۵ء میں الغ بیگ بن ابوسعید، حاکم کابل، نے ملک سلطان شاہ یوسف زئی سمیت ان قبائل کے سرکردہ لوگوں کو اکھٹا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن سلطان شاہ کا بھتیجا احمد بچ نکلا۔ بعدازاں حصارک میں یوسف زئی اور مہمند زئی قبیلوں میں لڑائی چھڑ گئی اور نتیجۃً مہمند زئیوں نے ننگرہار کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یوسف زئیوں نے باجوڑ، بنیر اور سوات کا رخ کیا اور اشنغر [ہشت نگر، مرکز چارسدہ] کی پوری سرزمین اور پشاور کے شمالی دوآبے پر قبضہ کر کے اوگی سے اوہنڈ تک کے علاقے کے مالک بن گئے۔ ان کے حکمرانوں میں سے ملک ملی (شیخ آدم) بن یوسف بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ وہ عالم اور متّقی ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ مقنّن بھی تھا، چنانچہ اس نے اجتماعی قوانینِ قومی اور تقسیمِ اراضی پر ایک کتاب دفتر شیخ ملی لکھی (۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء)، جس پر مدتوں عمل درآمد ہوتا رہا۔ اس کے بعد حکومت کجو خان رانی زئی کے قبضے میں آ گئی (۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴ء)، جس نے شیخ پتور میں غوریہ خیل اور لنگر کوٹ میں دلازاکوں کو شکست دی۔ کجو خان کے بعد دو اَور فرمانرواؤں — شاہ منصور ولد ملک سلیمان اور سلطان اویس — کا نام ملتا ہے (۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء - ۹۲۵ھ/ ۱۵۱۹ء)۔ بابر نے شاہ منصور کی بیٹی سے شادی کی تھی].

تیموریانِ ہند، نیز ارغونیوں، ازبکوں اور صفویوں کا نفوذ (۹۱۰-۱۱۵۱ھ): ہرات میں تیموریوں کا آخری دَور تھا کہ ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ میرزا بن ابوسعید گورگان [رک بآں] فرغانہ میں تخت نشین ہوا (۸۹۹ھ/ ۱۴۹۳ء)، لیکن اپنے اعزا کی ریشہ دوانیوں کے باعث اسے وہاں سے نکلنا پڑا۔ انھیں دنوں جوجی بن چنگیز کی نسل سے ایک شخص شیبانی خان بن ابراہیم (۹۰۵ھ/ ۱۴۹۹ - ۱۵۰۰ء تا ۹۱۶ھ/ ۱۵۱۰-۱۵۱۱ء) سمرقند پر قابض ہو گیا تھا۔ ۹۰۹ھ/ ۱۵۰۳ء میں اس سے بابر کی جنگ ہوئی، لیکن جب اس نے حریف کو قوی دیکھا تو افغانستان کا رخ کر لیا، جہاں اس زمانے میں خاندانِ ارغون (ایلخانی) [رک بآں] برسرِ عروج آ گیا تھا۔ اس کے بانی ذوالنون بیگ کو، جو غور اور سیستان کا والی تھا، ہزارہ اور نیکوداری قبائل کو شکست دینے کے بعد زابلستان اور گرم سیر کے صوبے بھی مل گئے، چنانچہ وہ قندہار کو دارالحکومت بنا کر خود مختار بن بیٹھا اور اس نے اپنے بیٹے شاہ بیگ کی مدد سے سلطنت کو جنوب کی طرف درّۂ بولان اور سیوستان تک وسعت دے دی۔ ۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸ء میں اس نے غور، زمین داور اور قندہار کی آبادیوں سے لشکر بھرتی کر کے، جو غالباً تاجیکوں اور افغانوں پر مشتمل تھا، ہرات پر بھی چڑھائی کی۔ اس کے بیٹے مقیم نے کابل پر حملہ کر کے [امیر عبدالرزاق بن الغ بیگ کو لغمان کی طرف بھگا دیا (۹۰۸ھ/ ۱۵۰۲ء)] لیکن کابل پر اس کا قبضہ بہت مختصر وقت کے لیے تھا۔ [۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء میں بابر کی آمد کی اطلاع پا کر وہ قندہار چلا گیا اور یوں بابر کابل

پر قابض ہوگیا۔ ادھر ذوالنون بیگ پر شیبانی خان نے حملہ کیا۔] ذوالنون بیگ ازبکوں کے خلاف پہلی ہی لڑائی میں مارا گیا اور ۹۱۳ھ/ ۱۵۰۷ء میں شیبانی نے ہرات پر قبضہ کرلیا.

شاہ بیگ اور مقیم اب بابر اور شیبانی کے بیچ میں تھے۔ بابر ایک حد تک بجا طور پر سلطنتِ تیموریہ کا وارث ہونے کا مدعی تھا۔ اس نے قندہار پر چڑھائی کی۔ ارغونی امیروں نے شیبانی سے اتحاد کرلیا، لیکن بابر نے انھیں شکست دے کر قندہار لے لیا اور [اپنے بھائی] ناصر میرزا کو وہاں کا والی مقرر کر دیا، جس پر شیبانی فوراً حملہ آور ہوا۔ بابر اس وقت ہرات جا رہا تھا تاکہ سلطان حسین سے مل کر ازبکوں کے مقابلے میں دفاعی تدبیریں اختیار کرے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسے سلطان حسین کے فوت ہوجانے کی خبر ملی، تاہم وہ مرغاب پر اس کے بیٹوں کی معرکہ آرائی میں شریک رہا۔ وہاں سے وہ ہرات گیا اور موسمِ سرما میں کوہستان کی راہ سے کابل لَوٹا۔ اس سفر میں اسے اور اس کی فوج کو سخت مصائب برداشت کرنا پڑے۔ وہ ۹۱۲ھ/آغاز ۱۵۰۷ء میں عین اس وقت کابل پہنچا جب اس کے اپنے خویش واقارب ایک خطرناک سازش کررہے تھے۔ بابر نے کابل پہنچتے ہی سازش کا قلع قمع کیا۔ اس کے بعد گرمی کے موسم میں وہ قندہار کی مہم پر گیا اور جمادی الاولیٰ ۹۱۳ھ/ستمبر ۱۵۰۷ء میں کابل لوٹ آیا۔ وہ ہندوستان پر مہم کی تیاری کر رہا تھا، بلکہ کوچ کر چکا تھا، کہ اسے اطلاع ملی، شیبانی نے قندہار فتح کرکے وہاں ارغونیوں کا اقتدار بحال کر دیا ہے۔ یہ خبر اس وقت ملی جب بابر جگدلک اور ننگرہار کے افغان قبائل کے خلاف برسرِ پیکار تھا، جو تھوڑی ہی مدت پہلے وادی کابل پر قابض ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں بابر کابل کو بھی مشکل سے اپنے قبضے میں رکھ سکا، جہاں بغاوت اور فوج کی سرکشی سے اس کے اقتدار کو زبردست خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔ اب شیبانی خراسان کا مالک اور قندہار کا بالادست حکم ران بن چکا تھا؛ لیکن اس کی طاقت رُو بہ زوال تھی۔ اس کے عساکر نے کوہستانِ غور کی ایک مہم میں شدید نقصانات اٹھائے۔ مزید براں ایک اَور جنگ جو بادشاہ، یعنی ایران کی سلطنتِ صفویہ کا بانی شاہ اسمٰعیل، مغرب کی طرف سے دباؤ ڈال رہا تھا۔ ۹۱۶ھ/ ۱۵۱۰ء میں اسمٰعیل نے خراسان پر چڑھائی کی۔ شیبانی نے مرو کے قریب صفویوں سے شکست کھائی اور مارا گیا۔ ہرات شاہ اسمٰعیل کے قبضے میں چلا گیا، جہاں شیعی عقائد انتہائی جبر وتشدد سے رائج کیے گئے۔ اب بابر نے شاہ اسمٰعیل سے اتحاد کرلیا اور کچھ عرصے کے لیے وسط ایشیا میں اپنی موروثی مملکت پر بھی قابض ہوگیا۔ کابل کی مملکت اس نے اپنے بھائی ناصر میرزا کے لیے چھوڑ دی، لیکن شاہ اسمٰعیل سے اتحاد قائم کرنا عوام النّاس کو سخت ناپسند تھا۔ ازبک دوبارہ مجتمع ہوے۔ بابر نے ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء میں بخارا کے قریب غُجدُوان کے مقام پر شکست کھائی اور بڑی مشکل سے جان بچا کر کابل کی طرف پسپا ہوا، جہاں سخت بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں اسے اپنی مغل فوج، نیز افغان قبائل کی شورشیں فرو کرنا پڑیں۔ یوسف زئی قبائل نقل مکان کرکے پشاور کی وادی میں آگئے تھے اور انھوں نے اپنے پیش رو دلازاکوں کو باجوڑ اور سوات کے پہاڑوں سے باہر نکال دیا تھا۔ بابر نے بڑی سختی سے ان کی سرکوبی کی اور قتلِ عظیم کے بعد باجوڑ پر قبضہ کرلیا۔ اسے ہزارہ قبائل کی بغاوتوں کو بھی کچلنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے قندہار کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، جہاں ابھی تک شاہ بیگ ارغون متمکن تھا اور اس نے شاہ اسمٰعیل کے ساتھ سمجھوتا کرنے کی لاحاصل کوششیں کی تھیں۔ اسے ہرات میں قید کرلیا گیا تھا؛ جہاں سے وہ بھاگ نکلا۔ اس وقت سے وہ سندھ میں اپنی بادشاہت قائم کرنے کے لیے تگ ودو کر رہا تھا۔ ۹۱۷ھ/ ۱۵۱۱ء میں بعض بلوچ قبائل کی مدد سے اس نے سندھ پر چڑھائی کی۔ بابر قندہار کو سَر کرنے میں دو بار ناکام رہا، تاآنکہ ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء میں وہ کامیاب ہوگیا۔ اب شاہ بیگ نے شال (کوئٹہ) کو اپنا گرمائی اور سیبی کو سرمائی صدر مقام بنالیا اور سندھ کے لیے اپنی کدوکاوش جاری رکھی، قندہار کا پورا صوبہ بابر کے قبضے میں آگیا تھا۔ اب بابر اپنے آپ کو اتنا طاقت ور محسوس کرنے لگا تھا کہ طالع آزمائی کی وہ مہمّیں اختیار کرے جن کا سلسلہ ہندوستان کے لودھی افغانوں کی سلطنت کا تختہ الٹنے پر ختم ہوا۔ [اس وقت سے بابر نے اپنا مستقر ہندوستان میں قائم کرلیا، جہاں سے افغانستان، کابل، بدخشان اور قندہار تک حکومت ہوتی تھی۔] بابر ہمیشہ کابل کو ہندوستان کے میدانوں پر ترجیح دیتا تھا [چنانچہ اس کی وفات (یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۵۳۰ء) کے بعد اس کی میّت حسبِ وصیّت کابل کے حوالی میں دفن کی گئی].

اس وقت افغانستان، ہندوستان اور ایران کی دو بڑی سلطنتوں کے زیرِ اثر ایک نسبۃً منظّم اور پُرامن دور میں داخل ہوچکا تھا۔ وہ ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اس طرح بٹ گیا تھا کہ ہرات اور سیستان کی ولایتیں ایران کے پاس رہیں، اگرچہ ان پر ازبکوں کے حملے کچھ عرصے تک پریشانی کا موجب بنتے رہے؛ کابل سلطنتِ مغلیہ کا جزبنا رہا اور قندہار پر کبھی مغل اور کبھی ایرانی قابض ہوجاتے تھے۔ مغل بادشاہوں کا اقتدار بتدریج ہندوکش کے جنوب تک محدود ہوکر رہ گیا۔ کوہستان کے شمال میں [بابر کے چچیرے بھائی] سلیمان میرزا نے، جسے بابر نے بدخشان کا والی بنایا تھا، ایک نیم آزاد سے شاہی خاندان کی بنیاد قائم کرلی اور ملک کے باقی ماندہ اقطاع شیبانیوں کے زیرِنگیں رہے.

بابر کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بھائی کامران، ہندال اور عسکری مختلف ولایتوں کے والی تھے۔ کابل اور قندہار کی ولایتوں کو پنجاب کے ساتھ ملا کر کامران کے ماتحت کر دیا گیا۔ ادھر شاہ اسمٰعیل [م ۹۳۰ھ/ ۱۵۲۴ء] کے جانشین طہماسپ نے اپنے بھائی سام میرزا کو ہرات کا والی مقرّر کر دیا۔ صفوی بادشاہ قندہار کو مملکت خراسان کا (جو اب ان کے قبضے میں تھی) باج گزار علاقہ خیال کرتے تھے، اس لیے وہ قندہار پر مغلوں کے قبضے کو غاصبانہ سمجھتے تھے۔ ۹۴۱ھ/ ۱۵۳۵ء میں سام میرزا نے اچانک قندہار پر حملہ کر دیا۔ اہلِ قندہار نے اس کی مزاحمت کامیابی سے کی اور آٹھ ماہ بعد کامران نے [لاہور سے آکر سام میرزا کو شکست دی اور قندہار خواجۂ کلاں کے سپرد کرکے واپس چلا گیا]۔ سام میرزا

کی غیر حاضری میں ازبکوں نے عبیداللہ کے زیرِ سرکردگی خراسان پر چڑھائی کی اور ہرات کا بدقسمت شہر پھر مسخّر اور تاراج ہوا۔ طہماسپ نے یہ شہر از سرِ نو فتح کیا، سام میرزا کو معزول کر دیا، قندھار پر چڑھائی کی اور اسے بھی سَر کر لیا؛ [تاہم ۹۴۳ھ/ ۱۵۳۶ء میں] کامران نے پھر قندھار پر قبضہ کر لیا۔ اندریں اثنا [فرید خاں، المعروف بہ] شیر شاہ [سوری] کے زیرِ قیادت افغانوں نے ہمایوں کے خلاف بغاوت کر دی، جس کے نتیجے میں ہمایوں سے ہندوستان کا تخت چھن گیا۔ [رجب ۹۴۷ھ/نومبر ۱۵۴۰ء میں وُہ سندھ پہنچا اور وہاں سے] قندھار کے جنوبی صحرا میں سے ہوتا ہوا سیستان اور ایران گیا (۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ء)، جہاں شاہ طہماسپ نے اس کے ساتھ مہمان نوازی کا برتاؤ کیا۔ [اس دوران میں کامران بدخشان سے قندھار تک اور کابل سے وادی سندھ تک پورے علاقے پر حکم رانی کرنے لگا تھا اور اس کا دارالحکومت کابل تھا۔ ۹۵۱ھ/ ۱۵۴۴ء میں ہمایوں دربارِ صفوی سے امداد حاصل کر کے ہرات کی راہ دریائے ہلمند کے کنارے آ پہنچا اور شاہم علی اور میر خلیج کو، جو بُست میں کامران کی طرف سے حکومت کرتے تھے، محصور کر لیا۔ پھر چھے ماہ کے محاصرے کے بعد ۹۵۲ھ/ ۱۵۴۵ء میں عسکری مرزا سے قندھار بھی چھین لیا اور طہماسپ سے معاہدے کے مطابق یہ شہر ایرانی شہزادے مراد صفوی کے سپرد کر دیا۔ اس کم عمر شہزادے کی وفات کے بعد ہمایوں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا اور اسے بیرم خان کے سپرد کر کے کابل پر حملہ آور ہوا، جسے اس نے رمضان ۹۵۳ھ/ ۱۵۴۶ء میں سَر کر لیا۔] بعد کے چند سال بھائیوں کے درمیان لڑائی میں بسر ہوے۔ کبھی ایک فریق جیت جاتا اور کبھی دوسرا۔ کامران نے دو مرتبہ کابل پر قبضہ کیا، لیکن بہت تھوڑے عرصے کے لیے۔ بعد ازاں اس نے کچھ وقت افغانوں کے قبیلوں مہمند اور خلیل میں گزارا اور انھیں وادی کابل کو تاراج کرنے پر ابھارا۔ بالآخر ۹۶۱ھ/ ۱۵۵۳ء میں اس نے ہمایوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی گئی۔ اب ہمایوں قندھار اور کابل کا مالک بن گیا اور اپنے آپ کو اتنا طاقت ور سمجھنے لگا کہ ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کرے؛ چنانچہ اس نے سُور بادشاہوں پر فتح حاصل کی [اور یکم رمضان ۹۶۲ھ/ ۲۰ جولائی ۱۵۵۵ء کو پھر تختِ دہلی پر متمکن ہو گیا۔ ۱۴ ربیع الاوّل ۹۶۳ھ/ ۲۶-۲۷ جنوری ۱۵۵۶ء کو ایک حادثے کا شکار ہو کر اس نے دہلی میں وفات پائی اور اس کا فرزند جلال الدّین اکبر تیرہ سال کی عمر میں بروز جمعہ بتاریخ ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ/ ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء بمقام کلانَور (پنجاب) بادشاہ بنا]۔ نوجوان شہزادہ ابھی ہندوستان کی از سرِ نو تسخیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف تھا کہ طہماسپ نے موقع کو غنیمت جان کر قندھار پر قبضہ کر لیا (۹۶۵ھ/ ۱۵۵۸ء)۔ یہ شہر ایرانیوں کے قبضے میں رہا، تا آنکہ ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۴ء میں شہزادہ مظفر حسین نے اسے اکبر کے حوالے کر دیا اور شاہ بیگ کابلی قندھار کا حاکم مقرّر ہوا۔ عہدِ اکبری میں جو اہم واقعات افغانستان میں رونما ہوے وہ حسبِ ذیل ہیں: اکبر کی تخت نشینی کی خبر سنتے ہی سلیمان میرزا نے محمد حکیم میرزا بن ہمایوں کو کابل میں محصور کر لیا، مگر اکبر کی فوجیں کابل پہنچیں تو سلیمان بدخشان کو لوٹ گیا (۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء)۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں ابوالمعالی ترمذی دربارِ اکبری سے فرار ہو کر کابل پہنچا اور شہزادہ محمد حکیم کی والدہ اور چند اَور امرا کو قتل کر دیا۔ شہزادے نے سلیمان میرزا سے مدد طلب کی، جس نے پلِ غوربند پر ابوالمعالی کو قتل کر کے کابل پر قبضہ کر لیا (۷ رمضان ۹۷۱ھ/ [۱۹ اپریل ۱۵۶۴ء])، پھر کابل کی حکومت شہزادے کے سپرد کر کے واپس بدخشان چلا گیا۔ دربارِ اکبری سے مدد ملنے پر محمد حکیم کو کابل سے دریاے سندھ اور قندھار سے سلسلۂ ہندوکش تک کی مستقل حکم رانی نصیب ہوئی اور سلیمان میرزا کا اثر زائل ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصے بعد محمد حکیم نے لاہور پر حملہ کر دیا، لیکن اکبر نے اسے پشاور کی طرف پسپا کر دیا (۹۷۴ھ/ ۱۵۶۶ء)۔ بعد ازاں سلیمان میرزا کو اپنے نواسے شاہ رخ میرزا کے ہاتھوں ہندوستان کی طرف بھاگنا پڑا (۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء)۔ ۹۸۷ھ/ ۱۵۷۹ء میں اس نے محمد حکیم کی مدد سے بدخشان پر حملہ کیا، جس پر شاہ رخ نے صلح کر لی اور طالقان سے ہندوکش تک کا علاقہ سلیمان کو دے کر خود بدخشان پر اکتفا کیا (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء)۔ محرم ۹۸۹ھ/ [فروری] ۱۵۸۱ء میں اکبر نے پھر ایک بار محمد حکیم کو شکست دے کر پسپا کیا اور اس کا تعاقب کرتا ہوا کابل جا پہنچا؛ لیکن صفر ۹۸۹ھ میں وہ کابل و زابلستان کا علاقہ پھر محمد حکیم کے سپرد کر کے ہندوستان چلا آیا۔ اُدھر سلیمان میرزا اور شاہ رُخ کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ خان ازبک، حاکمِ بلخ، نے دونوں کو کابل کی طرف بھگا دیا۔ جب شہزادہ محمد حکیم نے وفات پائی (۱۳ شعبان ۹۹۳ھ/ ۹ اگست ۱۵۸۵ء) تو اکبر نے مان سنگھ کو تازہ دم فوجیں دے کر کابل کی حفاظت کے لیے بھیجا اور زین خان کوکہ کو وہاں کا حاکم بنا دیا؛ اس طرح کابل کا علاقہ اکبر کی سلطنت کا مستقل جز بن گیا (۹۹۵ھ/ ۱۵۸۶-۱۵۸۷ء)۔ اس کے بعد اکبر کی فوجیں سوات اور باجوڑ کے علاقوں میں جنگ جو پشتون قبائل سے نبرد آزما ہوئیں۔ ۹۹۷ھ میں اکبر نے بھی ایک ماہ تک کابل میں قیام کیا اور قاسم خان کابلی کو وہاں کی حکومت سپرد کی۔ ان جنگوں میں روشانی جلال الدّین بن بایزید کے مقابلے میں شاہی افواج کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور اکبر کے نورتنوں میں سے ایک یعنی بیربل بھی مارا گیا (۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء)۔ اس طرح غزنہ کی حکومت روشانیوں کے ہاتھ آ گئی۔

۳ جمادی الاُخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو اکبر نے وفات پائی اور اس کا بیٹا نورالدین جہانگیر تخت نشین ہوا۔ ہرات کے صفوی حکمران حسین خان شاملو نے قندھار پر حملہ کیا، شاہ بیگ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایرانی فوجیں بے نیلِ مرام واپس ہو گئیں۔ اب جہانگیر نے قندھار، سندھ اور ملتان کی حکومت غازی خان کے سپرد کی۔ ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء میں اس نے سفرِ کابل کے دوران میں شاہ بیگ کو افغانستان کا حاکم مقرر کیا، لیکن جب ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء میں احمد داد روشانی نے کابل پر حملہ کیا تو قلیچ خان کو کابل کی حکومت پر بھیج دیا گیا۔ ۱۰۳۱ھ [/ ۱۶۲۱ء] میں شاہ عباس [صفوی] نے قندھار دوبارہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد جہانگیر کو اس پر فوج کشی کرنے

کی مہلت نصیب نہ ہوئی.

۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ/ ۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر کی وفات ہوئی اور شاہ جہان کو ہندوستان کا تخت ملا۔ تیراہ، پشاور، کابل، غزنہ اور بنگش کے علاقوں میں لڑائیاں شاہ جہان کی تخت نشینی تک جاری تھیں۔ اس جنگ کو غنیمت جان کر بلخ کے حاکم نذر محمد خان نے شمالی افغانستان کا علاقہ سَر کر کے کابل کا محاصرہ کر لیا؛ تین ماہ تک معرکہ جاری رہا، تا آنکہ شاہی افواج نے کابل پہنچ کر اسے پسپا کر دیا (۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۸ء)۔ اسی سال افغانی قبائل نے متّحد ہو کر شورش بپا کر دی اور پشاور کا محاصرہ کر لیا، لیکن سعید خان، حاکمِ کابل، نے انھیں مار بھگایا۔ عہدِ اکبری کے آخری دور میں پشین (بلوچستان) کا ایک رئیس حسن خان ترین تھا، جس کے بیٹے شیر خان ترین نے صفوی اور مغلیہ حکومتوں کے درمیان ایک مستقل حکومت قائم کر لی تھی۔ اس نے ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۱ء میں سیوستان فتح کرنے کی ٹھانی، لیکن قندہار کے صفوی حاکم علی مردان خان سے شکست کھائی۔ ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء میں شاہ جہان نے قندہار پر چڑھائی کے لیے لشکر بھیجا اور علی مردان خان نے شہر شاہ جہان کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد گرِشک بھی لے لیا گیا اور زمین داور پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ [۱۰۴۹ھ میں شاہ جہان نے کابل کا سفر کیا، جہاں یوسف زئیوں نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ اسے فرو کرنے کے بعد ہندوکش سے قندہار تک کا علاقہ سلطنت دہلی کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ ۱۰۵۶ھ میں شاہ جہان نے افغانستان کے شمالی علاقوں پر بھی حملہ کیا اور بدخشان سے بلخ تک کی سرزمین زیر کر کے اپنی سرحد دریاے آمو تک پہنچا دی۔] ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء میں ایران کے جوان سال بادشاہ عباس ثانی نے، جو اس وقت سولہ سال کا تھا، قندہار پر لشکر کشی کر کے اسے فتح کر لیا۔ بعد ازاں یہ شہر پھر کبھی سلطنت مغلیہ کا جز نہیں بنا۔ شاہ جہان کی افواج نے اسے دوبارہ فتح کرنے کی [بار بار] کوشش کی۔ باہم حریف شہزادے اورنگ زیب اور داراشکوہ اس شہر کے خلاف مہمّیں لے کر گئے [۱۰۵۹ھ، ۱۰۶۱ھ، ۱۰۶۲ھ]، لیکن دونوں ناکام رہے۔ [یوں شاہ جہان کے ہاتھ میں صرف کابل و غزنہ کا علاقہ رہ گیا۔ شمالی ولایات (میمنہ، اندخود، بلخ، طخارستان اور ہندوکش) پر ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء سے تورانی حکمران قابض ہو چکے تھے۔ قندہار، سیستان اور ہرات صفویوں کے زیرِ تسلّط آ چکے تھے.

۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا۔ اس کا عہد افغانستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ پُرشورش زمانہ ہے۔ ۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۶-۱۶۶۷ء میں اورنگ زیب کو یوسف زئیوں کی سرکوبی کرنا پڑی، جنھوں نے پشاور کے شمال میں ملّا چالاک اور سلطان محمود جدون وغیرہ کے زیرِ قیادت پکھلی پر حملہ کیا تھا۔ ۱۰۷۹ھ/ ۱۶۶۸ء میں ایمل خان مہمند نے مشہور جنگ جو شاعر خوش حال خان خٹک کی معیّت میں خیبر سے نبرد آزمائی کا آغاز کیا۔ ۱۰۸۱ھ/ ۱۶۷۰-۱۶۷۱ء تک افغانوں کے خلاف کئی لڑائیاں لڑی گئیں.

۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۶ء میں عالم گیر نے وفات پائی اور شہزادہ معظّم نے کابل سے آ کر عَلَمِ شاہی نصب کر دیا۔ دہلی کی تیموری حکومت کے آخری دَور میں کابل و پشاور کی حکمرانی ناصر خان کے سپرد تھی اور غزنہ کی باقر خان کے۔ قندہار پر ہوتکی بادشاہوں کا قبضہ تھا، جن کی حکومت پشین، مستونگ اور ڈیرہ جات تک تھی۔ بالآخر ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ افشار کے ہاتھوں آلِ بابر کی دوسو چالیس سال کی حکومت افغانستان سے اٹھ گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اڑھائی صدیاں افغانوں سے جنگ اور باہمی خون ریزی میں ضائع ہوئیں اور تیموریۂ ہند کی تہذیب کا اثر افغانستان پر کچھ زیادہ نہیں ہوا.

اس دَور میں افغانستان پر تین عظیم حکومتوں، یعنی مغلوں (کابل، غزنہ، قندہار)، صفویوں (ہرات و قندہار) اور تورانیوں (بلخ و بدخشان)، کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اس سہ طرفہ دباؤ سے پشتونوں میں دفاع اور داخلی خود مختاری کا جذبہ تیز ہو گیا، پشتو ادب میں پختگی پیدا ہوئی اور یہ زبان اپنے شباب کو پہنچی.

افغانستان میں تیموریوں نے ملکی و عسکری نظام وہی رکھا جو لودھیوں اور سوریوں نے ہندوستان میں جاری کیا تھا۔ بقولِ سمتھ (Vincent Smith) دُولا فُوز شیر شاہی نظام ہی تھا۔ افغانستان چار حصّوں میں منقسم تھا: (۱) صوبۂ کابل، عہدِ بابری سے نادر شاہ کی فتح تک برابر دہلی کے تحت رہا؛ (۲) صوبۂ قندہار، کبھی دہلی سے اور کبھی دربارِ صفوی سے وابستہ ہوتا رہا؛ (۳) بدخشان، تیموریۂ دہلی اور ان کے ہم جدّوں کے درمیان باعثِ نزاع رہا؛ (۴) بلخ، جو کبھی تیموریۂ دہلی کے تحت آیا اور کبھی شاہانِ توران کے۔ عہدِ شاہ جہانی میں عبدالحمید نے آمدنی کی یہ تفصیل دی ہے:- (۱) کابل = سولہ کروڑ دام؛ (۲) قندہار = چھے کروڑ دام؛ بلخ = آٹھ کروڑ دام؛ (۴) بدخشان = چار کروڑ دام؛ (۵ دام = ۲ آنے)۔ ابوالفضل کی تصریح کے مطابق ہر صوبہ چند سرکاروں، شہروں، قلعوں اور تھانوں میں منقسم تھا۔ ملکی اور انتظامی امور کا حاکمِ اعلیٰ صوبے دار کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت فوجی مددگار اور فوج دار ہوتے تھے۔ سرکاری قلعوں اور شاہراہوں کی اہم چوکیوں کی نگہداشت کوتوالوں اور تھانے داروں کے ذمّے تھی۔ بعض اوقات صوبہ کسی امیر یا شہزادے کو بطورِ جاگیر (تیول یا اقطاع) بھی عطا کر دیا جاتا تھا۔ اس صورت میں اسے تیول دار کہتے تھے۔ ہر صوبے اور شہر میں محاسبے اور مالی امور کی نگرانی دیوان کرتے تھے۔ امورِ عدلیہ اور شرعی مقدمات قاضیوں کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ فوجی عدالتیں قاضیِ عسکر کے سپرد تھیں۔ لشکر کی تنخواہ اور ضروریات کا بندوبست بخشی کا کام تھا۔ واقعہ نویس جاسوسی اور خبر رسانی کرتے تھے.

افغانستان میں تیموریۂ دہلی کے حسبِ ذیل آثار قابلِ ذکر ہیں: (۱) طاقِ چہل زینہ، کوہ سرپوزۂ قندہار پر، ۹۳۰-۹۵۳ھ؛ (۲) چار باغ، قندہار؛ (۳) کابل میں باغِ شہر آرا، چار باغ، باغِ جلوخانہ، اور تہ باغ وغیرہ؛ ان میں طاقِ چہل زینہ شہزادگان کامران، ہندال و عسکری نے تعمیر کرایا تھا اور باغات بابر نے۔ ان کے علاوہ (۴) چہار چھتہ، کابل (علی مردان خان)؛ (۵) مسجدِ شور بازار (اورنگ زیب)؛ (۶) باغِ صفا، بہسود جلال آباد (بابر)؛ (۷) قلعۂ شہباز (اکبر،

۹۹۸ھ)؛ (۸) باغِ استالف، مسجد سنگ مرمر، قبرِ بابر، باغِ نملہ (شاہ جہان، ۱۰۵۶ھ)؛ (۹) بالا حصار (جہانگیر، ۱۰۱۵ھ) (۱۰) قلعۂ پروان شمال موجودہ جبل السراج (ہمایوں، ۹۵۵ھ)۔ کابل، قندہار، بلخ اور بدخشان میں ٹکسالیں بھی تھیں، جہاں طلائی، نقرئی اور مسی سکّے ڈھالے جاتے تھے۔

اس زمانے میں اسلامی حکومتوں کی حدود خلیج بنگالہ سے جبل الطارق تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں وسیع ممالک ان کے تحت آ چکے تھے۔ بڑی بڑی غیر مسلم یورپی طاقتوں، مثلاً انگلستان، روس، ہالینڈ، فرانس اور ہسپانیہ سے ہندوستان، ایران اور خلافتِ عثمانیہ کے سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی تجارت بیرونی ممالک سے خشکی کے راستے یا تو پشاور، کابل اور بخارا کی راہ سے ہوتی تھی یا قندہار اور مشہد کی راہ سے۔ صنعت، تجارت اور علوم وفنون کو ان عظیم شہنشاہیوں نے بڑی ترقی دی۔ مال و دولت سے لدے ہوئے قافلے برابر کابل، قندہار اور ہرات سے گزرتے رہتے تھے۔ افغانوں کے قبائل تعداد اور رسوخ کے لحاظ سے مستقل ترقی کرتے رہے اور غالباً یہی وہ زمانہ ہے جس میں ابدالی اور غلزئی اپنے پہاڑوں سے نکل کر قندہار، زمین داور، ترنگ اور ارغنداب کی زیادہ زرخیز وادیوں میں پھیلے۔ جب تاجیک قوم پر زوال آیا، جنھیں مغلوں کے حملوں کی سختیاں برداشت کرنا پڑی تھیں اور کوہستان غور میں ان کے پہاڑی قلعوں پر نیم مغل نسل (قب ہزارہ) کی آبادی قابض ہوگئی تو افغان قوم کے لوگوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ وہ اپنے مشرقی کوہستانوں پر حملہ آوروں کی ترک تاز سے بہت کم متأثّر ہوے تھے، کیونکہ حملہ آوروں کو زیادہ حرص یہی ہوتی تھی کہ درّوں میں سے گزر کر ہندوستان کو لُوٹیں۔ ادھر افغانی قبائل کی بڑھتی ہوئی آبادی کو پھیلنے کی جو ضرورت مشرق کی طرف ہندوستان کے میدانی علاقوں میں لے جاتی تھی وہی ضرورت ان کے گلّہ بان اور دہقان قبائل کو مغرب کی طرف پھیلنے کی محرّک ہوئی۔ کوہستانی قبائل نے عملی طور پر تمام حکومتوں کے مقابلے میں اپنی آزادی برقرار رکھی۔ ان آزاد قبائل میں توخی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

توخیوں کا دور (۹۶۰ - ۱۲۰۰ھ): غلزئیوں کی ایک شاخ توخی نے، جو ترنگ اور ارغنداب کی وادیوں میں بسی ہوئی تھی، تیموریانِ دہلی اور صفویانِ ایران کے درمیانی علاقے میں اپنی خودمختاری برقرار رکھی۔ اسی خاندان میں سے شاہ محمد قلاتی ۹۶۲ھ/ ۱۵۵۴ء میں ہمایوں کی طرف سے قندہار کا حاکم تھا، جس کی نسل سے ایک فرد ملخی ہوا۔ اسے اورنگ زیب نے سلطان ملخی کا لقب دے کر تمام غلزئیوں کا مَلِک تسلیم کیا (۱۰۹۲ھ/ ۱۶۵۱ء)۔ اس کے عہد میں صفویوں، ہزارویوں اور غلزئیوں کے درمیان خون ریز لڑائیاں ہوئیں۔ ملخی نے ابدالیوں کے رئیس سلطان خداداد سے ایک عہد نامہ کیا، جس کی رو سے وادی گرماب حدِ فاصل قرار پائی۔ اس کی ہلاکت (۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۸ء) کے بعد مدّت تک اس کے بیٹے حاجی عادل (نواح ۱۱۰۰ھ) بعد میں عادل کے فرزند بائی خان (نواح ۱۱۱۵ھ) نے قلات اور اس کے ملحقات پر حکومت کی، پھر کچھ عرصہ ملخی کے بھتیجے شاہ عالم ولد علی خان (نواح ۱۱۵۰ھ) بعد ازاں اس کے فرزند خوش حال خان نے۔ مؤخّر الذّکر کے بیٹے اشرف خان کو احمد شاہ ابدالی نے قلات سے غزنی تک کی حکومت سپرد کی تھی (نواح ۱۱۶۰ھ)۔ تیمور شاہ ابدالی کے عہد میں اشرف خان کے بیٹے اموخان کو غلزئیوں کی حکومت مل گئی (نواح ۱۲۰۰ھ)۔ اس خاندان کے لوگ امیر عبدالرحمٰن خان کے عہد تک برسرِ اقتدار رہے۔

عہدِ ابدالیان (۴۰۰-۱۱۴۴ھ): ابدالی خاندان کا شجرۂ نسب اَبتَل یا پَتَل (= اَوْدل = اَبدل = ہَیطَل = یفتل) تک پہنچتا ہے۔ سفید فام آریاؤں کے اس قبیلے نے باختر اور طخارستان میں اپنا اقتدار قائم کیا تھا۔ تاریخ اسلام میں ابدال یا اودل کے نام سے جو شخص معروف ہوا (نواح ۴۰۰ھ) وہ ترین بن شرخبون بن سڑپن کا بیٹا تھا (سڑپن کا ذکر مقالے کے ابتدائی حصے میں آ چکا ہے)۔ اس کی نسل سے ملک سلیمان زیرک بن عیسیٰ (نواح ۷۵۰ھ) نے افغانی قبائل کو کوہ سلیمان سے قندہار تک پھیلا دیا۔ پھر اس کا بیٹا ملک بارک (۷۶۰ھ) اور دوسرا بیٹا ملک پُوپل جانشین ہوا (۷۸۳ھ)۔ اس نے اپنا اقتدار شال وژوب (بلوچستان) تک وسیع کرلیا۔ اس کے پوتے ملک بامی ولد ملک حبیب (۸۵۰ھ) کے حصّے میں قندہاری قبائل کی سرداری آئی، جسے سلطان سکندر لودھی (۸۵۵-۹۰۰ھ) نے تسلیم کیا۔ اس کے بعد ملک بہلول ولد کامی ولد بامی (۸۹۰ھ) اور ملک صالح ولد معروف ولد بہلول (۹۵۰ھ) بھی لائق سردار گزرے ہیں۔ صالح کے بعد اس کا بھائی ملک سدو ایک قومی جرگے کے سامنے قندہار کی مسندِ ریاست پر بیٹھا۔ یہی شخص سدوزئی قبیلے کا جدِ اعلیٰ ہے۔ محمد زئی قبیلے کا جدِ اعلیٰ محمد رئیس بارک زئی، ملک سدو کا ہم عصر اور تابع تھا۔ سدو کی حکومت کو شاہ عباس صفوی نے بھی رسمی طور پر تسلیم کرلیا تھا (نواح ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۱ء)۔ پچھتر سال تک با اختیار حاکم رہنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے خضر خان کو جانشین مقرّر کیا۔ ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء میں شاہ جہان نے خضر خان اور اُس کے بھائیوں مودود (مغدود) خان، زعفران خان، کامران خان اور بہادر خان کی مدد سے قندہار پر قبضہ کیا تھا اور اسی بنا پر انھیں قندہار کا سردار تسلیم کیا تھا۔ ملک مغدود اور ملک کامران ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء میں دہلی گئے اور موردِ عنایاتِ شاہی ہوے۔ ان میں اوّل الذّکر ۱۰۵۳ھ/ ۱۶۴۳ء میں ملک یحییٰ، حاکمِ کابل، سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ ۱۰۷۰ھ کے قریب خضر خان کے بیٹے سلطان خداداد (المعروف بہ خَوڈ کی) اور شیر خان قندہار کے سردار ہوے۔ خداداد اور سلطان ملخی غلزئی نے معاہدہ کرکے اپنی اپنی حکومتوں کی سرحدیں پل سنگین اور گرماب جلدک مقرر کیں اور کوہ سلیمان کی ترائیوں تک ژوب اور بوری کے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ ۱۱۰۵ھ/ ۱۶۹۳ء میں شیر خان نے قندہار کے حاکم کے خلاف جنگ کرکے بند کوژگ میں صفوی افواج کا صفایا کر دیا۔ شیر خان کے بعد اس کا بیٹا سرمست خان اور اس کے بعد دولت خان ولد سرمست خان کو قندہار کی سرداری ملی۔ سلطان خداداد کا بیٹا حیات سلطان بھی سردار دولت خان کے سپرد کرکے اپنے بھائی لشکر خان کو لے کر چھے ہزار ابدالیوں کے ساتھ ملتان چلا گیا۔ دولت خان ایک مردِ آہن تھا، جس نے شاہ جہان

اور عالم گیر کے متعدد حملوں کا مقابلہ بڑی کام یابی سے کیا۔ اسے پچاس برس تک قندہار میں کامل اقتدار حاصل رہا، حتّٰی کہ صفوی حکومت کے بیگلر بیگی زمان خان کا اثر صرف قلعے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ۱۱۰۶ھ/ ۱۶۹۴ء میں شاہ حسین صفوی نے گرگین خان گرجستانی نام ایک ظالم نصرانی کو شاہ نواز خان کا لقب دے کر قندہار کا بیگلر بیگی مقرّر کیا۔ وہ ایک رات اپنے خون خوار سوراروں سمیت دولت خان کے مرکزِ حکومت شہر صفا میں داخل ہوا اور اسے ہلاک کر دیا (نواح ۱۱۱۵ھ/ ۱۷۰۳ء)۔ دولت خان کے بعد اس کا بیٹا رستم خان مسندِ ریاست پر بیٹھا۔ اگرچہ اس کا بھائی زمان خان بطورِ یرغمال حکومت صفوی کے قبضے میں تھا، تاہم اس نے بلوچوں کی مدد سے جنوبی قندہار میں صفوی لشکر کو تباہ کر دیا۔ چار سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب ابدالی قبائل بے سرے رہ گئے۔ ان میں انتشار پھیل گیا۔ اس طرح قندہاری قبائل کی امارت حاجی میرویس خان کے ہاتھ آئی، جو ہوتکی خاندان کا مؤسّس ہے۔ ابدالی زعما ہرات چلے گئے اور وہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کر لی (نواح ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء)۔

۲۶ رمضان ۱۱۲۹ھ کو حیات سلطان کے بیٹے عبداللہ خان نے ہرات پر قبضہ کر کے اس کے تمام ملحقات اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ ۱۱۳۲ھ/ ۱۷۱۹ء میں اس کا بیٹا اسداللہ خان شاہ محمود ہوتکی کا مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا تو حیات سلطان نے ہرات کی حکومت دولت خان کے بیٹے زمان خان کے سپرد کر دی۔ زمان خان کی سرکردگی میں ابدالیوں نے صفویوں کے حملے کا مقابلہ کامیابی سے کیا۔ اس کی وفات (۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۲ء) کے بعد محمد خان ولد عبداللہ خان نے ہرات کی حکومت سنبھالی اور مشہد تک پیش قدمی کر کے چار مہینے اس کا محاصرہ جاری رکھا۔ کچھ عرصے بعد ابدالیوں نے اس کی جگہ زمان خان کے بیٹے ذوالفقار خان کو امیر بنا لیا (۱۱۳۶ھ)، لیکن ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء میں قومی جرگے نے ذوالفقار خان کے تحت صرف باخرز اور بادغیس کی حکمرانی رہنے دی؛ فراہ کی حکم داری عبداللہ خان کے ایک بیٹے رحمٰن خان اور ہرات کی مرکزی حکومت اس کے دوسرے بیٹے اللہ یار خان کے سپرد ہوئی۔ اللہ یار خان اور ذوالفقار خان نے نادرشاہ افشار سے سخت لڑائیاں لڑیں۔ ۱۱۴۱ھ/ ۱۷۲۸ء میں انھوں نے نادرشاہ کی پیش قدمی روک دی اور وہ دو ماہ کی لڑائی کے بعد ہرات پر ان کی حکمرانی تسلیم کر کے واپس ہو گیا۔ ۱۱۴۳ھ میں نادرشاہ نے ہرات فتح کرنے کا دوبارہ عزم کیا۔ اب کے شاہ حسین ہوتک نے بھی ذوالفقار خان کی مدد کی اور نادرشاہ ناکام رہا۔ صفر ۱۱۴۴ھ میں ہرات کی مدافعت اللہ یار خان کے سپرد ہوئی اور اس نے مردانہ وار جنگ جاری رکھی، لیکن بالآخر ایک سال کے محاصرے کے بعد وہ ہرات چھوڑ کر ملتان پہنچ گیا اور شہر پر نادرشاہ کا قبضہ ہو گیا (رمضان ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء [کذا، فروری ۱۷۳۲ء])۔ ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء میں ذوالفقار خان کے بھائی احمد خان نے قندہار سے آ کر دوبارہ وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔

ہوتکیوں کا دَور (۱۱۱۹ - ۱۱۵۰ھ): دولتِ ہوتکی کے بانی میر وَیس خان کا جدِّ اعلیٰ ہوتک بن بارُو بن تُولر بن غلجی تھا۔ یہی غلجی (=غرزی (کوہ زادہ)=خلجی= غَلزَی) غلزئی قبائل کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ میرویس سلطان ملخی کا نواسا تھا اور اس کی بیوی کامران خان ابدالی کی پوتی تھی۔ وہ خود ایک خوش گفتار، خوش کردار اور عقل مند انسان تھا، چنانچہ اسے اپنے ذاتی محاسن اور خاندانی روابط کے باعث افغانوں کے تینوں بڑے قبیلوں، یعنی ہوتکیوں، غلزئیوں اور ابدالیوں کی حمایت حاصل ہو گئی، تا آنکہ اس نے قندہار میں اپنی مستقل حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جب صفویوں کی طرف سے گرگین خان قندہار کا حاکم ہو کر آیا تو میرویس بار بار اصفہان جا کر حسین صفوی سے دادخواہ ہوا۔ جب وہاں سے لفظی ہمدردی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا تو بیت اللہ میں جا کر عرب علما سے گرگین کو قتل کر دینے کے جواز میں فتوی حاصل کیا۔ پھر وہ قندہار لوٹا اور ایک بہت بڑے جرگے میں اعلانِ استقلال کی توثیق کرائی۔ اس کے بعد اس نے تمام اہلِ قندہار کی مدد سے گرگین خان اور صفویوں کے پورے لشکر کو تہِ تیغ کر کے شہر (قندہار) پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعے کے ایک عینی شاہد، مؤلّف پٹّہ خزانہ (پشتو)، کا بیان ہے کہ گرگین کا قتل ۲۹ ذوالعقدہ ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء [کذا، ۳ فروری ۱۷۰۸ء] کو ہوا۔

صفویوں نے اپنی طاقت سے مرعوب کر کے میرویس کو اطاعت اختیار کرنے پر کئی بار مجبور کیا، لیکن اس نے غلامی کا طوق گردن میں ڈالنے سے انکار کر دیا اور ان کا ہر حملہ پسپا کر دیا۔ بالآخر ۱۱۲۳ھ/ ۱۷۱۲ء [کذا، ۱۷۱۱ء] میں گرگین کے بھتیجے کیخسرو کے زیرِ کمان ایک بڑا لشکر بھیجا گیا، لیکن اس میں سے صرف پانسو آدمی جان بچا کر نکل سکے اور کیخسرو اپنی فوج سمیت مارا گیا (۲۸ رمضان)۔ اس کے بعد میرویس نے اپنے بھائی کو تحائف دے کر فرّخ سیَر، شاہ دہلی، کے پاس بطورِ سفیر بھیجا، جس کے جواب میں دربارِ دہلی نے اسے قندہار کی حکمرانی کی سند، خطابِ ''حاجی امیر خانی''، خلعت و شمشیر اور ہاتھی ارسال کیے۔ میرویس کے قبضے میں قندہار کا پورا علاقہ مغرب میں فراہ و سیستان تک اور مشرق میں پشین و غزنہ تک تھا۔ اس کی وفات (۱۱۲۷ھ/ ۱۷۱۵ء) کے بعد اس کے کم ہمّت بھائی عبدالعزیز نے ایران کی اطاعت قبول کر لی، جس پر ۱۱۲۹ھ/ ۱۷۱۶ میں میرویس کے بیٹے محمود نے اسے قتل کر دیا اور خود مسندِ حکومت سنبھال لی۔ ۱۱۳۴ھ/ ۱۷۲۱ء میں اس نے ایران کے پایۂ تخت اصفہان پر لشکر کشی کی اور آٹھ ماہ کے محاصرے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا (۱۱ محرّم ۱۱۵۳ھ/ [۲۲ اکتوبر] ۱۷۲۲ء)؛ یوں صفویّوں کے آخری بادشاہ حسین کا اقتدار ختم ہوا۔ فاتحِ اصفہان کی وفات (۱۲ شعبان ۱۱۳۷ھ/ [۲۵ اپریل] ۱۷۲۵ء) کے بعد اصفہان میں تختِ سلطنت پر شاہ اشرف ابن عبدالعزیز متمکّن ہوا۔ اس کے عہد میں احمد پاشا والیِ بغداد نے کئی بار ایران پر حملے کیے، لیکن ہر بار اسے پسپا کر دیا گیا۔ بالآخر صلح ہو گئی، افغانوں اور عثمانیوں کے درمیان سفارتی تعلّقات استوار ہو گئے۔ اسی طرح اشرف نے روسی فوجوں کی بھی مقاومت کی، جن کا اجتماع ایران کی شمالی سرحدوں پر ہوا تھا۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اس کی فوجیں نادرشاہ کے مقابلے میں تتر بتر ہو گئیں اور اسے افغانستان کی طرف فرار کے سوا چارہ نہ رہا۔ اواخر ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۲۹ء [کذا، ۱۷۳۰ء] میں ابراہیم بن

عبداللہ خان بلوچ نے اسے قتل کر دیا۔

۱۱۳۵ھ میں شاہ محمود نے اصفہان فتح کرنے کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شاہ حسین کو قندہار کا حاکم بنا دیا تھا۔ اس کے عہد میں حدودِ سلطنت فراہ، ہرات، سبزوار، غزنہ اور گومل سے آگے شال، پشین اور ڈیرہ جات تک پھیل گئیں، حتّٰی کہ اس کی فوجیں ملتان کی حدود میں بھی داخل ہوگئیں۔ اس کی حکومت ۱۱۴۹ھ/ ۱۷۳۶ء تک رہی اور اسی سال نادرشاہ افغانستان کو فتح کرنے کے لیے ہرات میں ابدالیوں کا تختہ الٹانے کے بعد قندہار کے درپے ہوا۔ شاہ حسین نے تقریباً ایک سال تک ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن بالآخر اسے ۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء میں قندہار نادر کے حوالے کرنا پڑا، جس نے شہر کو تاراج کیا اور ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء میں شاہ حسین کو زہر دلوا کر مروا ڈالا۔

تحریکِ آزادی کے اعتبار سے ہوتکیوں کا مختصر سا عہد بڑا اہمّ ہے۔ ایک طرف تو اس زمانے میں داخلی طور پر ایک آزاد حکومت قائم ہوئی اور افغان قوم نے اپنی دلاوری کا سکّہ بٹھایا، دوسری طرف علمی ماحول پیدا ہوا، بالخصوص پشتو ادب کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔

نادرشاہ افشار (۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء - ۱۱۶۰ھ/ ۱۷۴۷ء): نادرشاہ نے ایران میں ہوتکیوں، ہرات میں ابدالیوں اور قندہار میں غلزئیوں کی بساطِ حکومت الٹ دی، لیکن اس کے بعد اس نے افغان قبائل کے بارے میں بالعموم اور ابدالیوں کے ساتھ بالخصوص مصالحت کی حکمتِ عملی اختیار کی اور ان کی بڑی بڑی جمعیّتیں اپنی فوج میں بھرتی کر لیں۔ بہت سے غلزئیوں نے سلطنتِ ہند کے صوبۂ کابل میں پناہ لی تھی۔ نادرشاہ نے یہ کہہ کر کہ اس کے احتجاجات کا کوئی جواب دربارِ دہلی سے نہیں دیا گیا کابل پر چڑھائی کر دی، جو فوراً مسخر ہوگیا (۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۸ء)۔ کابل میں شہنشاہِ دہلی محمد شاہ کے مضروبہ سکّوں کی آخری معلومہ تاریخ ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نادرشاہ نے اپنے سکّے بنوانے کے لیے کابل کی ٹکسال استعمال نہیں کی، بلکہ فتحِ قندہار کے سال (۱۱۵۰ھ/ ۱۷۳۷ء) میں اپنا سکّہ قندہار میں ضرب کرایا؛ دوسرے سکّے، جو نادرآباد (جسے نادرشاہ نے محاصرۂ قندہار کے دوران میں قندہار سے باہر بنایا تھا) کے ضرب شدہ ہیں، بلاشبہہ محاصرے کے زمانے کے ہیں۔

اب افغانستان نادرشاہ کے قبضے میں تھا اور اس طرح ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر فوج کشی کے لیے اسے ضروری مرکز مل گیا۔ محمد شاہ پر اسے جو فتح حاصل ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنتِ مغلیّہ کے وہ سارے علاقے جو دریاے سندھ کے مغرب میں تھے اور جن میں پشاور اور ڈیرہ جات کے اضلاع بھی شامل ہیں، اس کے حوالے کر دیے گئے، کابل پر اس کا اقتدار مان لیا گیا اور سندھ کے کلہوڑا یا عبّاسی حکمران اس کے باج گزار قرار پائے۔ دہلی سے واپس آ کر اس نے دریاے سندھ کو اٹک کے مقام پر عبور کیا اور یوسف زئیوں پر، جنھوں نے شورش برپا کر رکھی تھی، حملہ کیا۔ پھر وہ کابل چلا گیا۔ بعد ازاں وادی کرم اور علاقۂ بنگش کے راستے ڈیرہ جات سے گزرتا ہوا سندھ جا پہنچا۔ وہاں سے درّۂ بولان کے راستے قندہار، پھر ہرات چلا گیا۔ عمر کے باقی ماندہ ایّام میں وہ اپنے افغانی عساکر پر زیادہ اور ایرانی فوج پر کم اعتماد کرتا تھا۔ اہلِ ایران سنّی عقائد کے باعث اس سے برگشتہ تھے۔ ابدالیوں پر اس کی خاص نظرِ عنایت تھی اور ان کا نوجوان سردار احمد خان عساکرِ نادری میں بہت اونچے منصب پر پہنچ گیا تھا۔ روایت ہے، نادرشاہ نے خود ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس کے بعد احمد بادشاہ ہوجائے گا۔ جب نادرشاہ ایرانیوں اور قزلباشوں کے ہاتھوں مارا گیا [یکشنبہ ۱۱ جمادی الاُخرٰی ۱۱۶۰ھ/ جون ۱۷۴۷ء] تو احمد شاہ نے، جو ابدالیوں کی ایک کثیر جمعیت کے ساتھ قریب ہی فروکش تھا، ایک خزانہ بردار فوجی دستے کو گرفتار کر لیا اور قندہار جا پہنچا، [جہاں ایک بڑے قومی جرگے نے اسے افغانستان کی بادشاہی کے لیے منتخب کر لیا (شوال ۱۱۶۰ھ/ اکتوبر ۱۷۴۷ء)]۔

افغانوں کی قومی مملکت

(الف) سدوزئی خاندان [۱۱۶۰ - ۱۲۵۰ھ]: احمد شاہ کے بادشاہ بن جانے پر سلطنتِ نادری کے تمام مشرقی اضلاع دریاے سندھ تک اس کے قبضے میں آ گئے۔ جلد ہی ہرات بھی افغانی مملکت میں شامل ہوگیا۔ ایرانی بادشاہت کے عام انتشار کے وقت احمد شاہ نے نادرشاہ کے پوتے شاہ رُخ کے محافظ کا کام انجام دیا، جسے اس کے دشمنوں نے اندھا کر دیا تھا اور اس کے لیے خراسان میں ایک ریاست قائم رکھی۔ یہ صوبہ فی الواقع احمد شاہ اور اس کے بیٹے تیمور شاہ کے مقبوضات کا ایک حصّہ تھا اور کبھی کبھی مشہد میں ان دونوں کے نام کے سکّے بھی مضروب ہوے؛ لیکن رسمًا شاہ رُخ وہاں کا حکمران رہا، تا آن کہ تیمور شاہ کی وفات کے بعد آغا محمد قاچار نے اسے گرفتار کر کے مروا ڈالا؛ تاہم ہرات سلطنت درّانیہ کا جزوِ لاینفک سمجھا جاتا تھا اور خراسان کی قدیم مملکت ایران و افغانستان کے درمیان بدستور منقسم رہی۔

احمد شاہ نے قندہار کو اپنا دارالحکومت بنایا اور اسے احمد شاہی کا نام دیا۔ یہ نام اس کے اور جانشینوں کے سکّوں پر کندہ ہے۔ اس نے ''دُرِّ دُرّان'' کا لقب اختیار کیا اور اس کی قوم، یعنی ابدالی، اس وقت سے دُرّانی [رتّ بآن] کہلانے لگی۔ اس کا خاندان بہت پہلے سے افغانوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی اپنی سرگرمی اور موقع شناسی نے اسے اس قابل بنا دیا کہ اپنی حیثیّت کو برقرار رکھے۔ قبائل کے ساتھ وہ نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کرتا تھا۔ خزانۂ شاہی کے لیے محاصل عائد کرنے کے بجاے اس کا زیادہ انحصار خارجی مہمّات پر تھا۔ دُرّانی اس پر نازاں تھے اور بہ طیبِ خاطر اس کی پیروی کرتے تھے، لیکن وہ ایسی نسل کے لوگ نہ تھے جن پر آسانی سے حکومت کی جا سکے۔ یہی سبب تھا کہ اس کا بیٹا تیمور شاہ اپنا دارالحکومت قندہار سے تبدیل کر کے کابل لے گیا، جہاں آبادی کی اکثریت تاجیک تھی۔ ہندوستانی فتوحات میں احمد شاہ صرف نادرشاہ کا ہم پایہ ہی ثابت نہیں ہوا بلکہ اس پر سبقت لے گیا۔ اس نے اپنے مقبوضات کو دریاے سندھ

سے بھی آگے بہت دور تک وسعت دی، اور ان میں کشمیر، لاہور اور ملتان کی ولایات، یعنی پنجاب کے بیشتر حصّے، کا اضافہ کرلیا اور بہاول پور کے حکمران داؤد پوتروں سے بھی اپنی بالادستی تسلیم کرالی۔

احمد شاہ نے متعدّد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی پر ایک سے زیادہ مرتبہ قبضہ کیا۔ اس نے ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو جو شکست دی وہ ہندوستان کی تاریخ میں انقلاب انگیز واقعہ ہے، لیکن اس نے پنجاب سے آگے ہندوستان کے کسی صوبے کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ سکھوں کے خلاف اس نے مسلسل معرکہ آرائی کی، جو بالآخر [اس کے جانشینوں کے عہد میں] صوبۂ پنجاب کے ہاتھ سے نکل جانے کا موجب ہوئی۔ قلات کے خان بَرَہُوئی [بروہی] نصیر خان نے بھی، جو نادر شاہ کا باج گزار تھا، ۱۱۷۲ھ/ ۱۷۵۸ء میں آزادی و خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ احمد شاہ نے قلات کا محاصرہ کیا، لیکن کامیابی نہ ہوئی اور واپس ہندوستان روانہ ہونے کے باعث اس نے خانِ قلات کی برائے نام اطاعت پر اکتفا کرلیا؛ تاہم نصیر خان نے خراسانی مہمّات میں احمد شاہ کی مدد کی اور اس نے ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸ء میں [ایران کے] کریم خان زَند پر جو فتح حاصل کی اس میں نصیر خان کا بڑا حصّہ تھا۔ اس موقع پر نابینا افشاری شہزادے نے کریم خان کا ساتھ دیا اور اسے مشہد میں پناہ دی۔ احمد شاہ نے شہر کی ناکہ بندی کر کے اسے سَر کرلیا۔

احمد شاہ کے متعلّق مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ احمد شاہ درّانی۔ اس نے قندہار کے قریب پہاڑی علاقے میں مرغاب کے مقام پر [بتاریخ ۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۷۷۲ء] وفات پائی اور اپنے جانشین کے لیے ایک بہت وسیع، لیکن غیر محفوظ، سلطنت چھوڑی۔

[احمد شاہ ایک عالم، پشتو کا صاحبِ دیوان شاعر، دین دار اور بہادر شخص تھا۔ رعایا کے ساتھ مہربانی اور عدل سے پیش آتا اور اپنی مملکت سے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ اخوّتِ اسلامی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس نے افغانستان کی اتنی شان دار خدمات انجام دیں کہ وہاں کے لوگ اسے ''بابا'' کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ مملکتِ افغانستان میں ملکی، فوجی، مالی اور مدنی محکمے قائم کر کے وزیر مقرّر کیے۔ قندہار کا موجودہ شہر، تاشقرغان اور بعض دوسرے شہر آباد کیے۔ ۱۱۶۶/ ۱۷۵۲ء میں کابل کا جنگی قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کی افواج تقریباً ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھیں اور سالانہ آمدنی تین کروڑ دس لاکھ روپے تھی]۔

تیمور شاہ اپنے باپ کے عہد میں سلطنت کے اہمّ عہدوں، مثلاً ولایاتِ لاہور و ملتان کی نظامت پر فائز رہا تھا۔ یہ امر اس کے نام کے سکّوں کے ایک جداگانہ سلسلے سے ظاہر ہوتا ہے۔ احمد شاہ کی وفات کے وقت وہ ہرات میں تھا اور اپنے بھائی سلیمان کو، جسے بعض امرا نے اس کا حریف بنا کر کھڑا کر دیا تھا، گرفتار اور قتل کرنے کے بعد ہی قندہار پر قبضہ حاصل کر سکا۔ وہ اپنے دارالسّلطنت کو جلد ہی کابل لے گیا اور امن و امان سے بیس سال حکومت کی؛ مگر اس عرصے میں سلطنت کی قوّت اور استحکام میں بتدریج کمی آتی گئی اگرچہ بہ ظاہر اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ بیرونی صوبوں میں مرکزی حکومت کا اقتدار مخدوش حالت میں تھا۔ سکّھوں نے زور پکڑا اور ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۱ء میں انھوں نے ملتان فتح کرلیا، لیکن تیمور شاہ نے اسی سال یہ شہر واپس لے لیا۔ سندھ میں باج گزار کلہوڑا سرداروں کا تختہ الٹ گیا اور ان کی جگہ تالپُر (جنھیں عام طور پر تالپُر یا تال پور کہا جاتا ہے) قبیلے کے بلوچ امیر برسرِ اقتدار آ گئے اور تیمور شاہ کے سپہ سالاروں کے خلاف ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۲ء سے ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۶ء تک کام یابی سے لڑتے رہے۔ انھوں نے تیمور شاہ کی برائے نام سیادت قبول کر کے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ بخارا کی مَنگِت قوم کا امیر معصوم صوبۂ ترکستان، خصوصاً مرو، پر دست درازی کر رہا تھا۔ اس کے خلاف تیمور شاہ نے لشکر کشی کی اور معصوم نے بھی برائے نام اطاعت قبول کرلی، لیکن اپنے مفتوحہ علاقوں پر بدستور قابض رہا۔ کشمیر میں بھی بغاوت پھوٹی، جسے دبا دیا گیا۔ اندرونِ ملک میں درّانیوں کے قبیلۂ بارک زئی کی طاقت بتدریج بڑھتی گئی۔ تیمور شاہ نے [۷ شوال] ۱۲۰۷ھ/ [۱۸ مئی] ۱۷۹۳ء کو وفات پائی۔

تیمور شاہ کا جانشین اس کا بیٹا زمان شاہ ہوا، جس نے اپنے بعض بھائیوں کو کابل کے بالا حصار میں قید کر دیا۔ اس کے ایک بھائی ہمایوں نے قندہار سے نکل کر مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی اور بلوچستان کی طرف بھاگ گیا۔ ایک طرف تو زمان شاہ اس خانہ جنگی میں الجھا ہوا تھا اور دوسری طرف شمال میں بخارا کے (منگتی) بادشاہ، جنوب میں سندھ کے میر، مغرب میں ایران کے قاچار اور مشرق میں پنجاب کے سکھ خطرات کا سامان بن رہے تھے۔ ۱۲۰۸ھ/ ۱۷۹۳ء میں زمان شاہ نے پنجاب کا رخ کیا، لیکن ابھی پشاور ہی پہنچا تھا کہ ہمایوں نے میرانِ سندھ کی مدد سے قندہار سر کرلیا؛ چنانچہ زمان شاہ نے قندہار پر چڑھائی کی، ہمایوں کو گرفتار کر کے اندھا کرا دیا، پھر درّۂ بولان کی راہ سے سندھ کے تالپُر میروں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، جنھوں نے تین لاکھ طلائی سکّے دے کر صلح کرلی۔ اس اثنا میں زمان شاہ کے دوسرے بھائی محمود نے ہرات سے لشکر کشی کر دی۔ زمان شاہ نے محمود کو شکست دی اور اس کی والدہ کی سفارش پر اسے ہرات کا حکمران رہنے دیا۔ اس کے بعد اس نے بخارا کے ازبکوں سے بلخ چھینا۔ ۱۲۱۰ھ/ ۱۷۹۵ء میں اس نے اٹک پار کیا۔ حسن ابدال میں سکھوں کو شکست دے کر آگے بڑھا اور لاہور فتح کرلیا۔ اس دوران میں محمود نے پھر شورش برپا کر دی، چنانچہ زمان شاہ مجبوراً واپس ہوا اور محمود کو شکست دے کر اپنے بیٹے قیصر مرزا کو اس نے حاکم بنا دیا (۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء)۔

[زمان شاہ عالی ہمّت اور جلیل القدر بادشاہ تھا۔ زیادہ تدبّر اور اہتمام سے کام لیتا تو اس وقت تک افغانستان میں حکومت کی استواری کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی متزلزل حکمرانی کو تقویت پہنچانے کا سامان موجود تھا۔ اس وسیع سرزمین کو، جہاں مسلمان بارھویں صدی کے اواخر میں سب سے بڑی قوت بن چکے تھے، اُن اجنبیوں کے تسلّط سے بچانا بہت آسان تھا جو تاجروں کی حیثیت میں یہاں آئے تھے، مگر انھوں نے سلطنت کی داغ بیل ڈال دی تھی اور ملکی حاکموں کی تباہی

خیز رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ دائرۂ اقتدار بڑھاتے جا رہے تھے۔ دکن میں حیدر علی خان اور اس سے بدرجہا بڑھ کر ٹیپو سلطان نے اس اجنبی قوت کو ختم کر دینے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ٹیپو سلطان نے جہاں بعض ملکی فرمان رواؤں کے علاوہ سلطنتِ عثمانیہ (جو منصب خلافت کی بھی حامل تھی) اور حکومتِ فرانس سے امداد و تعاون کی اپیل کی تھی وہاں زمان شاہ سے بھی نہایت اچھے روابط پیدا کر لیے تھے۔ اگر زمان شاہ شمالی ہند میں فوج لے کر آ جاتا اور انگریزوں کے لیے ہمہ گیر ہراس پیدا کر دیتا تو ٹیپو سلطان کے لیے دکن کی فضا سازگار ہو جاتی اور وہ قدم آگے بڑھا کر بیشتر ملکی حاکموں کو ساتھ ملا لیتا۔ یوں انگریزی اقتدار کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل جاتا۔ زمان شاہ سے ٹیپو سلطان کے روابط کی مستند دستاویزیں خود انگریزوں نے محفوظ کر دی ہیں (مثلاً ایم وڈ (M. Wood)، ایم، پی کی کتاب *A Review of the Origin, Progress and Result of the last Decisive War in Mysore*، ضمیمۂ الف مکاتیب ۲۱-۳۰)۔ زمان شاہ اس منصوبے پر کاربندی کے لیے تیار تھا اور غالباً اسی لیے ہندوستان آیا تھا، مگر لاہور پہنچا تو پیچھے شاہ محمود نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ زمان شاہ کو تیزی سے لوٹنا پڑا، محمود سے جنگ میں شکست کھائی، گرفتار ہوا اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی گئی (۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء)۔ انگریزوں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر نظام اور مرہٹوں کی امداد سے ٹیپو سلطان پر چڑھائی کر دی۔ سلطان شہید ہو گیا اور اس کی ''سلطنت خداداد'' باہم بانٹ لی گئی (مئی ۱۷۹۹ء)]۔

ادھر کابل میں محمود کی تخت نشینی کے اعلان کے ساتھ ہی پشاور میں [اس کے بھائی] شجاع الملک نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ غلزئیوں نے محمود کے خلاف بغاوت کر کے شجاع الملک کی مدد کی، جس نے ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء میں کابل لے لیا، محمود کو زندان میں ڈالا اور اپنے سگے بھائی زمان شاہ کو قید سے نکالا۔ کچھ عرصے کے لیے محمود کے بیٹے کامران نے فتح خان کی مدد سے قندہار پر قبضہ قائم رکھا، مگر فتح خان نے اپنے لیے شرطیں طے کر کے پہلے تو شجاع الملک کی اطاعت قبول کر لی، پھر اپنی حالت سے غیر مطمئن ہو کر جلد ہی زمان شاہ کے بیٹے قیصر شاہ کو نیا مدّعی حکومت بنا کر کھڑا کر دیا۔ بعد کے چند سال پیہم سازشوں میں گزرے۔ فتح خان کبھی ایک مدّعیِ تخت سے مل جاتا تھا اور کبھی دوسرے کا ممدّ و مددگار بن جاتا تھا۔ کبھی وہ محمود اور کامران کی حمایت کا دم بھرتا تھا اور کبھی اپنے آپ کو قیصر کا حامی ظاہر کرتا تھا۔ ادھر شجاع الملک نے اپنی طاقت سندھ اور کشمیر کی مہمّوں میں ضائع کر دی۔ بالآخر فتح خان نے، جو اب محمود کا حامی تھا، نمْلہ کے مقام پر شجاع الملک کو شکست دی، جو ہندوستان بھاگ آیا، [پہلے رنجیت سنگھ کے پاس رہا، ''کوہ نور'' دے کر جان چھڑائی، بھیس بدل کر بھاگا اور لدھیانے پہنچ گیا۔ جہاں انگریزوں نے اس کے لیے قیام کا انتظام کر دیا۔ ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء]۔

اب محمود کی حکمرانی کا دوسرا دَور شروع ہوا، لیکن وہ بالکل فتح خان کا دست نگر تھا، جس کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا ایک بھائی دوست محمد خان اعلیٰ منصب پر فائز ہوا، دوسرا بھائی محمد اعظم خان کشمیر کا اور تیسرا بھائی کہن دل قندہار کا والی مقرّر ہوا۔ ہرات کا صوبہ ایک اَور شہزادے کے زیرِ اقتدار خود مختار ہو گیا تھا، اسے فتح خان اور دوست محمد خان نے ۱۲۳۲ھ/ ۱۸۱۶ء میں از سرِ نو فتح کیا۔ [محمود کے بیٹے کامران کو فتح خان کا اقتدار پسند نہ تھا۔ اس نے موقع پا کر پہلے اسے اندھا کیا، پھر قتل کرا دیا۔] فتح خان کو افغان قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے؛ چنانچہ اس کے بھائی دوست محمد کو بھاری لشکر جمع کرنے اور ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۸ء [کذا، ۱۸۱۹ء] میں کابل کے قریب شاہ محمود کو شکست دینے میں کوئی دقّت پیش نہیں آئی۔ کابل محمود کے ہاتھ سے نکل گیا، جسے وہ دوبارہ حاصل نہ کر سکا۔ ہرات پر وہ اپنی وفات (۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء) تک قابض رہا۔ اس کا جانشین کامران ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء تک وہاں حکومت کرتا رہا، تا آنکہ اسے قتل کر دیا گیا۔

(ڈیمز M. Longworth Dames [وعبدالحی حبیبی، بہ تلخیص از سید امجد الطاف])

(ب) بارک زئی (یا محمد زئی) خاندان [از ۱۲۱۶ھ]: محمد زئی قبیلہ قندہار کے بارک زئی درّانیوں کی ایک چھوٹی سی شاخ ہے۔ یہ محمد نامی ایک شخص سے منسوب ہے، جو ابدالی قبائل کے سردار ملک سدّو کا ہم عصر تھا اور ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء کے قریب اپنے چھوٹے سے قبیلے کے درمیان قندہار کے جنوب مشرق میں ارغسان کے مقام پر بود و باش رکھتا تھا۔ اس کے اَخلاف قندہار کے بارک زئی قبائل میں سردار کے لقب سے ملقّب تھے اور حاجی جمال الدّین خان بن حاجی یوسف بن یارو ابن محمد کی وجہ سے ممتاز ہوئے، جو احمد شاہ ابدالی کے ماتحت کام کرتا تھا اور ۱۱۸۴ھ/ ۱۷۷۰-۱۷۷۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے بیٹے پایندہ خان نے بغاوتوں کو فرو کرنے میں تیمور شاہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں، لیکن زمان شاہ نے محمود کے ساتھ سازش کی افواہیں سن کر پایندہ کو ۱۲۱۴ھ/ ۱۸۰۰ء میں بمقام قندہار قتل کرا دیا۔ اس کے متعدّد بیٹے تھے، جن میں سب سے بڑا فتح خان تھا۔ جب محمود نے کابل پر قبضہ کیا (۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء) تو فتح خان شاہ دوست کے لقب سے منصبِ وزارت پر فائز ہوا۔ محمد زئیوں کی طاقت میں اضافہ ہو جانے کے باعث ان کی امنگیں حکمران خاندان سدّو زئی سے متصادم ہو گئیں۔ اس تصادم نے افغانستان کو جنگ و جدل اور خون ریزی کا شکار بنا دیا، تا آنکہ آخر کار ۱۲۳۴ھ/ ۱۸۱۸-۱۸۱۹ء میں فتح خان کے قتل کے بعد اس کے بھائی دوست محمد خان نے شاہ محمود کو کابل سے نکال دیا۔ اس کی حکمرانی کے ابتدائی برسوں میں سلطنت کے بیرونی صوبے تیزی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سکّھوں نے ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء میں ملتان، ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء میں کشمیر اور ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ۱۲۳۶ھ/ ۱۸۲۱ء میں ڈیرہ غازی خان فتح کر لیا۔ [پشاور امیر دوست محمد کے بھائی سلطان محمد نے رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ امیر دوست محمد نے لشکر کشی کی، مگر سلطان محمد کی غدّاری سے اس کا لشکر پراگندہ ہو گیا۔ امیر جلال آباد کو لوٹ گیا اور رنجیت سنگھ نے غدّاری کے صلے میں سلطان محمد کو ہشت نگر سے کوہاٹ اور ٹل تک کا علاقہ بطورِ جاگیر دے دیا (۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء)۔] ادھر امیرانِ سندھ نے شکارپور فتح کر کے [سندھ

میں]افغانی اقتدار کی آخری علامت مٹادی۔ ہندوکش کے شمال میں بلخ کی ولایت بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔ اس طرح دوست محمد ایک مختصر، مگر مضبوط، افغان مملکت کا حاکم رہ گیا، کیونکہ دُور افتادہ صوبوں کے ضائع ہوجانے سے، جو سدّوزئیوں کے ضُعف کا باعث بنے تھے، اس کی طاقت مجتمع ہوگئی۔ وہ منصف مزاج مشہور تھا اور افغانوں میں ہردل عزیز تھا۔ اس کی ترقی میں اس کے بھائیوں کی ناگزیر رقابتوں سے بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ جب اس نے کابل کو اپنا دارالحکومت بنایا تو اس کا بھائی کہن دل قندہار پر قابض تھا۔ ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء میں قندہار واپس لینے کے لیے شجاع الملک نے جو پیش قدمی کی اسے کہن دل نے ناکام بنادیا۔ وزیر یار محمد خان کے ہاتھوں کامران کے قتل (۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء) کے بعد ایرانی پھر ہرات پر قابض ہوگئے۔ اس شہر کو دوست محمد نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء میں دوبارہ حاصل کیا۔

[امیر دوست محمد نے پشاور میں اپنے بھائی کو شکست دینے اور رنجیت سنگھ سے مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں، ایرانیوں اور روسیوں سے مدد مانگی۔ انگریزوں نے الیگزانڈر برنس (Sir Alexander Burns) کے زیرِ قیادت ایک مشن کابل بھیجا۔ انھیں ایّام میں روس کا نمائندہ ویکووچ (Vikovich) بھی کابل پہنچ گیا اور دربارِ کابل کو پنجاب میں انگریزوں کے خلاف پیش قدمی پر اکسانے لگا۔ امیر دوست محمد نے برنس سے کہا کہ اگر دولتِ انگلشیہ دو ہزار بندوقیں اسے دے دے اور پشاور نیز دریاے سندھ کے مغرب کے تمام علاقے اس کے لیے واگزار کردے تو وہ انگریزوں کا دوست بن جائے گا، لیکن انگریزوں نے ہندوستان کی حفاظت اور روس کے احتمالی حملوں کی پیش بندی کے لیے شاہ شجاع سے اس مضمون کا معاہدہ کرلیا کہ انگریز اس کے لیے کابل فتح کریں گے اور وہ ان کا سفیر کابل میں رکھے گا، دُول خارجہ سے انگریزوں کے مشورے کے بغیر تعلّقات پیدا نہیں کرے گا اور کشمیر، نیز دریاے سندھ کے دونوں کناروں کے علاقے سے درّۂ خیبر تک اور ڈیرہ جات سے دست بردار ہوجائے گا۔ انگریزی فوج نے کین (Sir John Keane) کی سرکردگی میں شجاع کو ساتھ لے کر ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸-۱۸۳۹ء میں درّۂ بولان کے راستے قندہار پر چڑھائی کی اور اسے فتح کرکے شاہ شجاع کو تختِ شاہی پر متمکّن کردیا (۲۳ صفر ۱۲۵۵ھ/ ۸ مئی ۱۸۳۹ء)۔ یہیں شاہ شجاع نے برطانوی نمائندے میکناٹن سے وعدہ کیا کہ وہ افغانستان میں مستقلاً انگریزی فوج رکھے گا۔ یکم جمادی الاُخریٰ ۱۲۵۵ھ/ ۱۲ اگست ۱۸۳۹ء کو کابل بھی فتح ہوگیا اور شاہ شجاع افغانستان کا بادشاہ بن گیا۔ امیر دوست محمد اپنے بیٹوں سمیت بخارا کی طرف بھاگ گیا، جہاں کے امیر نے اسے زندان میں ڈال دیا۔]

شاہ شجاع کا عہد بڑا پُرآشوب ثابت ہوا۔ [افغانوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا اور ان پر حملے کرنے لگے۔ ایک سال بعد امیر دوست محمد اپنے بیٹے افضل خان کے ہم راہ بخارا سے بھاگ کر مجاہدین سے آملا، لیکن ایبک کے مقام پر شکست کھائی اور تاشقرغان چلا گیا (شعبان ۱۲۵۶ھ/ ستمبر ۱۸۴۰ء)۔ چند روز بعد اپنی مساعی سے مایوس ہوکر اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردیا اور اسے کلکتے بھیج دیا گیا۔ لیکن اس سے مجاہدین کی سرگرمیوں میں کمی نہ آئی اور انھوں نے امیر دوست محمد کے بیٹے محمد اکبر خان کے زیرِ قیادت انگریزوں کے لیے مشکلات پیدا کردیں۔ میکناٹن کابل میں اکبر خان کے ہاتھوں مارا گیا، الیگزانڈر برنس ۲ نومبر ۱۸۴۱ء کو قتل ہوا، برطانوی افواج ۱۸۴۱ء میں کابل سے روانہ ہوگئیں اور انھیں درۂ خرد کابل میں تقریباً ختم کردیا گیا؛ خود شاہ شجاع کو بھی افغانی مجاہدین نے ٹھکانے لگادیا (۲۱ صفر ۱۲۵۸ھ/ ۳ اپریل ۱۸۴۲ء)۔ انگریز جلال آباد اور قندہار پر قابض رہے۔ انھوں نے ۱۸۴۲ء کے موسمِ خزاں میں دوبارہ کابل پر قبضہ جمالیا، جہاں شاہ شجاع کے قتل کے بعد اس کے بیٹے فتح جنگ کو پوپل زئیوں نے بادشاہ تسلیم کرلیا تھا، لیکن بارک زئی اس کے مخالف تھے۔ افغانستان کی اس جنگ میں انگریزی افواج کے تیس ہزار آدمی مارے گئے اور اکیس کروڑ روپیہ صرف ہوا، لیکن وہ اپنی حفاظت سے عاجز رہے؛ چنانچہ انھوں نے امیر دوست محمد سے مصالحت کرلی اور افغانستان کی سرزمین خالی کر گئے (شوال ۱۲۵۸ھ/ نومبر ۱۸۴۲ء)۔ فتح جنگ بھی ان کے ہمراہ چلا گیا اور یوں امیر دوست محمد ملّتِ افغان اور اپنے بیٹے اکبر خان کی ہمّت کے صدقے ایک بار پھر کابل کے تخت پر بیٹھا۔ امیر نے اپنی حکمرانی کے دوسرے دَور میں اُن افغان زعما پر جنھوں نے آزادی کی راہ میں سب کچھ قربان کردیا تھا نہ تو اعتماد کیا اور نہ امورِ مملکت میں انھیں دخل دینے دیا۔ اس کے برعکس اس نے تمام مناصب اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی تحویل میں دے دیے، لیکن ان کی باہمی رقابتیں خاندان کے اتّحاد و استحکام میں وقتاً فوقتاً رخنہ اندازی کرتی رہیں۔ خود اکبر خان، جو منصبِ وزارت پر فائز ہوگیا تھا، اپنی وفات (۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶-۱۸۴۷ء) تک باپ سے کشیدہ خاطر رہا۔ سکھوں اور انگریزوں کی دوسری جنگ (۱۸۴۹ء) کا دور مستثنیٰ کرتے ہوئے دوست محمد نے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی فوج اور دوسرے طبقے انگریزوں کے خلاف اٹھے، مگر اس موقع پر دوست محمد کے لیے ان کی کوئی مدد ممکن نہ تھی۔ وہ اپنے ملک کے استحکام میں لگا رہا۔ اس نے ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء سے ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء تک کے عرصے میں بلخ، خُلم، قُندُز اور بدخشان کو ازسرِنو فتح کیا۔ ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء میں وہ ہرات سے ایرانیوں کو نکال دینے میں کامیاب ہوا۔ اس فتح کے چند روز بعد وہ وہیں [بعارضۂ دمہ] فوت ہوگیا [۲۱ ذوالحجہ ۱۲۷۸ھ/ ۱۹ جون ۱۸۶۲ء]۔ وہ اپنی نمایاں کوتاہیوں کے باوجود عمومی حیثیت سے ایک اچھا حکمران تھا۔ [وہ افغانستان کے موجودہ حکمران خاندان کی امارات کا بانی اور امیر کبیر کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کی سلطنت کی سالانہ آمدنی ۵۱۹، ۲۳، ۲۴ روپے پہنچ گئی تھی۔]

دوست محمد کا پانچواں بیٹا شیر علی، جسے اس نے اپنا جانشین نام زد کردیا تھا، تخت پر بیٹھتے ہی اپنے بڑے بھائیوں محمد افضل اور محمد اعظم، نیز اپنے بھتیجے (عبدالرحمٰن بن محمد افضل) سے خانہ جنگی میں مبتلا ہوگیا (ان جنگوں کے لیے دیکھیے مادّۂ عبدالرحمٰن

خان)۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں شیر علی نے (عبدالرحمٰن سے) شکست کھائی۔ اس کے ہاتھ سے پہلے کابل، پھر قندہار نکل گیا۔ افضل خان اور اعظم خان نے یکے بعد دیگرے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء تک حکومت کی، لیکن وہ ہرات پر قابض نہ ہو سکے، جہاں سے شیر علی کے بیٹے محمد یعقوب نے پیش قدمی کر کے اگلے سال قندہار اور کابل کو اپنے باپ کے لیے ازسرِنو فتح کر لیا۔ [امیر اعظم خان اور عبدالرحمٰن خان بھاگ کر ایران پہنچے، جہاں اعظم خان فوت ہو گیا اور عبدالرحمٰن کو ترکستان کے روسی حاکم نے اپنے ہاں بلا لیا۔] اب شیر علی پورے افغانستان کا مالک تھا اور ہندوستان کی برطانوی حکومت نے اس کی امارت تسلیم کر لی۔ اس نے ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں انبالے کے مقام پر ہندوستان کے وائسرائے لارڈ میو (Mayo) سے ملاقات کی، لیکن امیر اس سے چنداں مطمئن نہ ہوا، کیونکہ اسے وائسرائے سے دوسری طاقتوں کے مقابلے میں امداد کا پکّا وعدہ حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ انھیں ایّام میں اس نے اپنے دلیر بیٹے محمد یعقوب کو زندان میں ڈال دیا اور جب اس کے لیے وائسرائے نے شفاعت کی تو سخت برہم ہوا۔ وہ سیستان کی سرحد کے بارے میں انگریز افسروں کی ثالثی پر رضامند ہو گیا، لیکن جب ثالثی کے نتیجے کے طور پر زرخیز ترین اراضی کا ایک خاصا بڑا حصّہ ایران کو دے دیا گیا تو انگریزوں کے خلاف شیر علی کی برہمی میں اَور بھی اضافہ ہو گیا اور اس نے روس سے تعلقات قائم کرنے کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ یہ واقعات ۱۸۷۸ء-۱۸۸۰ء کی جنگِ افغانستان کا موجب بنے۔ برطانوی فوج نے کابل فتح کر لیا اور شیر علی مزار شریف کی طرف بھاگ گیا، جہاں وہ [۲۹ صفر ۱۲۹۶ھ/ ۲۲ فروری ۱۸۷۸ء کو] فوت ہو گیا (نیز دیکھیے مادّۂ شیر علی)۔

باپ کے فرار ہو جانے کے بعد محمد یعقوب کو [آٹھ سال بعد] قید سے نکالا اور اس کے امیر بننے کا اعلان کیا گیا (ربیع الاوّل ۱۲۹۶ھ/فروری-مارچ ۱۸۷۹ء)۔ گندمک کے مقام پر [کابل کی طرف] پیش قدمی کرتی ہوئی برطانوی افواج سے امیر کا سامنا ہوا۔ یہاں ایک معاہدہ طے کیا گیا۔ (۴ جمادی الاُخریٰ/ ۲۶ مئی)، جس کی رُو سے وہ درّۂ بولان اور وادی کُرم کے قریب کے کچھ علاقے برطانوی ہند کے حوالے کر کے کابل میں انگریزی سفارت رکھنے کا فیصلہ ہو گیا۔ چند ماہ بعد کابل میں بغاوت برپا ہو گئی اور انگریزی سفارت کے ارکان، جن کا قائد کیوگنری (Sir Louis Cavagnari) تھا، تہ تیغ کر دیے گئے۔ اس حادثے کی وجہ سے جنگ دوبارہ چھڑ گئی۔ رابرٹس (Roberts) نے دوسری مرتبہ کابل فتح کیا، لیکن وہاں اس کی فوج کو قبائلی لشکر نے، جس کی قیادت محمد جان اور ملّا مشک عالم کر رہے تھے، گھیر لیا۔ قبائلی لشکر کی شکست کے بعد یعقوب خان کو معزول کر کے ہندوستان بھیج دیا گیا اور حکومت عبدالرحمٰن کو پیش کر دی گئی۔ قندہار میں ایک الگ ریاست قائم کی گئی۔ اس جگہ جو انگریزی فوج مقیم تھی اس کا کچھ حصہ سٹیورٹ (Stewart) کی کمان میں کابل کو روانہ ہوا۔ یہ دراصل ملک کے تخلیے کی ابتدا تھی؛ لیکن جب یہ فوج غلزئیوں کے علاقے سے گزری تو احمد خیل کے مقام پر اس قبیلے کے ایک بھاری لشکر نے اس پر حملہ کر دیا، جسے بڑی شدید جنگ کے بعد شکست دی گئی۔

ابھی عبدالرحمٰن کے بادشاہ بننے کا اعلان ہوا ہی تھا کہ شیر علی کا دوسرا بیٹا، محمد ایّوب ہرات میں لشکر جمع کر کے قندہار کی طرف بڑھا، میوند کے مقام پر انگریزی افواج کو شکست فاش دی [۱۷ شعبان ۱۲۹۷ھ/ ۲۵ جولائی ۱۸۸۰ء] اور قندہار کا محاصرہ کر لیا۔ [عبدالرحمٰن کابل میں امن قائم کرنے کے بعد عازمِ قندہار ہوا۔ جنرل رابرٹس دس ہزار فوج کے ساتھ اس کی حمایت پر تھا؛ چنانچہ سردار محمد ایوب کو ایران کی طرف بھگا دیا گیا اور قندہار بھی امیر عبدالرحمٰن کے حوالے کر دیا گیا۔] اس کے بعد ساری برطانوی فوج افغانستان خالی کر کے واپس چلی آئی اور پورا ملک، بشمول قندہار، عبدالرحمٰن کے سپرد کر دیا گیا (۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء)۔ اس نے داخلی مشکلات اور خارجی مسائل کے باوجود اپنے ملک کی آزادی اور وحدت برقرار رکھی [رک بہ مادّۂ عبدالرحمٰن]۔ [اس سلسلے میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے اسے بڑی تقویت پہنچائی۔ ۱۸۸۰ء میں اسے پانچ لاکھ روپے، کئی سو توپیں اور کئی ہزار بندوقیں دی گئیں۔ اس کے علاوہ اسے اٹھارہ ہزار پونڈ سالانہ کی مالی امداد بھی ملنے لگی۔ اس نے ''خطِ ڈیورنڈ'' کو باہمی سرحد بنانے پر موافقت کر لی (۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء)۔ اس کے دورِ حکومت میں تمام داخلی شورشوں کو انتہائی جبر و استبداد سے کچل کر رکھ دیا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ہندوکش سے شمال کی ولایات پر قبضہ کیا اور کافرستان فتح کر کے اس کا نام نورستان رکھا (۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء)۔ ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء میں روس اور افغانستان کی سرحدات کا تعیّن ہوا اور پنج دہ کا علاقہ افغانستان سے الگ ہو گیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنی وفات (۱۵ جمادی الاُخریٰ ۱۳۱۹ھ/ یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء) پر ایک غیر متنازع فیہ حکومت اپنے بیٹے امیر حبیب اللہ کے لیے چھوڑی۔ [افغانستان کے لوگوں کے لیے امیر ایک مستبد حکمران تھا، لیکن انگریزوں کے ساتھ اس کی روش بہت نرم اور دوستانہ تھی، چنانچہ اس نے سوات، چترال، وزیرستان، خیبر، چاغی، چمن، پشین، پاراچنار اور کرم کے علاقے ایک معاہدہ طے کر کے برطانوی حکومت کے لیے چھوڑ دیے]۔

امیر حبیب اللہ کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصے بعد روسی-برطانوی معاہدہ طے ہو گیا اور اس بات کا احتمال جاتا رہا کہ ان میں سے کوئی طاقت افغانستان کے کسی حصّے کا الحاق کر لے گی یا اس کے معاملات میں مداخلت کرے گی۔ ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں امیر حبیب اللہ نے اس معاہدے کی توثیق کر دی جو اس کے والد نے ہندوستان کی برطانوی حکومت سے کر رکھا تھا اور جس کی رُو سے امیر نے اٹھارہ لاکھ روپیہ (ایک لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ) کے عوض معاملاتِ خارجہ برطانوی حکومت کی تحویل میں دے دیے۔ امیر حبیب اللہ کے عہد میں ملک کے اندر امن و امان فی الجملہ قائم رہا اور تعلیم میں بھی کچھ ترقی ہوئی۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں افغانستان نے غیر جانب داری کی حکمت عملی اختیار کی۔ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ/ ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو امیر نے لغمان کے قلعۂ گوش میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا کہ اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ [اس کے بھائی نصر اللہ خان نے جلال آباد میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا،

لیکن امیر کے تیسرے بیٹے امان اللہ خان نے، جسے فوج کی امداد حاصل تھی، مسند امارت حاصل کرلی اور نصر اللہ خان نے قید میں انتقال کیا۔]

امان اللہ خان نے [یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو] تخت نشین ہوتے ہی [افغانستان کے استقلال کا اعلان کر کے برطانوی حکومت سے جنگ شروع کر دی۔ انگریزی افواج نے درّۂ خیبر کے شمالی دہانے کے پاس ڈکّہ کے مقام پر اور چمن کے سامنے سپین بولاک کے افغانی قلعے پر قبضہ کرلیا اور کابل پر طیّارے کے ذریعے سے بم باری کی؛ لیکن افغانستان کے عوام نے قندہار میں سردار عبدالقدوس، صدرِ اعظم، جنوبی سرحدات پر سپہ سالار محمد نادر خان اور سمت مشرقی میں اپنے قومی سرداروں کی راہبری میں اعلانِ جنگ کر دیا۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں سوویٹ روس نے افغانستان کا استقلال تسلیم کرلیا۔ بالآخر حکومتِ افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان صلح کی گفت وشنید شروع ہوئی اور معاہدۂ راولپنڈی (۲ ذوالقعدہ ۱۳۳۷ھ/ ۸ اگست ۱۹۱۹ء) کی رُو سے برطانوی حکومت نے افغانستان کی آزادی باضابطہ تسلیم کرلی۔ شاہ امان اللہ خان نے سفیروں کے ذریعے ساری دنیا سے روابط قائم کر لیے اور مملکت عصری ترقیات کی طرف قدم بڑھانے لگی۔] ۱۹۲۱ء میں روس کی سوویٹ حکومت اور برطانیہ سے نئے معاہدے کیے گئے، گو کشیدگی شمالی سرحدوں پر ۱۹۲۲ء تک اور جنوبی ومشرقی سرحدوں پر ۱۹۲۴ء تک جاری رہی۔ ۱۹۲۲ء میں لوئی جرگے نے ایک دستور اساسی مرتب و نافذ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں انتظامی دستور العمل مرتب ہوا۔ [عساکر کی تنظیم و اصلاح جدید ترین اصول پر ہوئی اور دنیا بھر کے ممالک سے تجارتی تعلقات کا قیام عمل میں آیا۔ داخلی اصلاحات کا اجرا ہوا، مثلاً غلامی کی تنسیخ، مطابع کا قیام، اخبارات کا اجرا، بلدیات کا قیام، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، تار برقی اور ٹیلی فون کی توسیع، نہروں اور کانوں کی کھدائی، کابل میں مجلسِ شوریٰ اور صوبوں میں مجالسِ مشورہ کا قیام، سیاسی احزاب کی آزادی، جہالت اور تعصّب کے خلاف جدوجہد، اعلیٰ تعلیم کے انتظامات، حمل ونقل کے جدید وسائل کی درآمد اور ان کا اجرا۔ ۱۹۲۴ء میں عورتوں کے لیے بھی اعلیٰ تعلیم کی تدابیر اختیار کی گئیں، جس پر انگریزوں کے اشارے سے ایک مفرور افغانی سردار عبدالکریم کے زیرِ سرکردگی خوست میں بغاوت ہوگئی۔ کابل کے عساکر نے باغیوں کو گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا اور عبدالکریم ہندوستان کی طرف بھاگ آیا۔ یہ پہلی رجعت پسندانہ تحریک تھی جو انگریزوں کی انگیخت پر امان اللہ کے خلاف پیدا ہوئی]۔ ۱۹۲۴ء میں دوسرے لوئی جرگے نے تعلیمِ نسواں سے متعلّق قوانین منسوخ کر دیے نیز جبری بھرتی کے قوانین میں ترمیم کر دی۔ [جب امن قائم ہوگیا تو امان اللہ خان نے ۱۹۲۶ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور ۱۹۲۸ء میں یورپی ملکوں کی سیاحت کی، ان سے سیاسی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی معاہدات طے کیے اور کاغذ سازی، شکر سازی، پشمینہ بافی اور نسّاجی (کپڑا بننے) کے کارخانے خرید کر ملک میں لایا۔] اس دورے سے واپس آکر بادشاہ نے نئے دستورِ اساسی کے نفاذ اور معاشری و تعلیمی اصلاحات کی ترتیب کے لیے تیسرا لوئی جرگہ طلب کیا۔ [چونکہ امان اللہ کا ماسکو جانا دولتِ انگلشیہ کے سیاسی مقاصد کے موافق نہ تھا اور اسے ہندوستان کے لیے خطرے کی علامت سمجھا گیا، اس لیے انگریزی حکومت نے ہندوستان کے سرحدی قبائل میں شورش برپا کر دی۔ اس کے علاوہ اسی حکومت کی شہ پر] ایک تاجیک ڈاکو بچۂ سقّا نے کوہ دامن سے پیش قدمی کر کے کابل پر قبضہ کرلیا (جنوری ۱۹۲۹ء)۔ امان اللہ خان قندہار کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے اس نے کابل کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے جو کوشش کی اسے حبیب اللہ [بچۂ سقّا] کے حامیوں نے ناکام بنا دیا (اپریل۔مئی ۱۹۲۹ء)۔ اندریں اثنا ہرات پر ایک اَور تاجیک عبدالرحیم کا قبضہ ہوگیا۔ امان اللہ چمن کے راستے افغانستان سے رخصت ہوگیا اور اٹلی جا کر سکونت اختیار کرلی۔

[ملک میں ابتری پیدا ہوگئی تو سپہ سالار محمد نادر خان (بن محمد یوسف خان بن یحییٰ خان بن سلطان محمد خان برادر دوست محمد خان) فرانس میں بیمار پڑا تھا۔ جنگ استقلال میں کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا تھا، لیکن وہ ملکی پالیسی سے شدید اختلافات کی بنا پر، نیز علاج کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ انتہائی کمزوری کی حالت میں واپس آیا۔ قوم کو امن و اتحاد کی دعوت دی اور اعلان کیا کہ حکومت کا آخری فیصلہ قومی نمائندوں پر چھوڑا جائے۔ بچۂ سقّا سے بھی یہی کہا کہ اپنا معاملہ قوم کے حوالے کر دے۔ کئی مہینے کی ناکامیوں اور پریشانیوں کے بعد سپہ سالار نے وزیریوں اور محسودوں کا ایک لشکر فراہم کیا، جس نے سپہ سالار کے بھائیوں شاہ ولی خان اور شاہ محمود خان کی سرکردگی میں کابل پر قبضہ کرلیا، جہاں قومی نمائندوں نے ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ/ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو محمد نادر خان کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔]

حبیب اللہ نے ہتھیار ڈال دیے اور اسے موت کی سزا دی گئی۔ ملک میں امن و امان قائم کرنے میں مزید دو سال لگے۔ امان اللہ خان کے حامیوں میں اضطراب اور بے چینی کی آگ سلگتی رہی، جن میں سب سے زیادہ سرگرم لوغر کا چرخی خاندان تھا۔ اس خاندان کے سرکردہ رکن کو سزائے موت دینے کے باعث ایک خونین عداوت کی صورت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء میں ابراہیم لقی نے روس کی انگیخت پر قطغن میں شورش برپا کی، جسے وزیر حربیہ نے فرو کر دیا۔ ۱۹۳۰ء میں گردیز میں دری خیل اور ۱۹۳۱ء میں غزنہ میں سلیمان خیل قبائلی اٹھ کھڑے ہوے۔ انھیں بھی عسکری طاقت سے دبا دیا گیا۔ نادر شاہ نے وہ مکتب اور مدرسے از سرِ نو کھولے جو سقّوی شورش اور بدامنی کے دوران میں بند ہوگئے تھے؛ ان کے علاوہ دارالفنون کے نام سے ایک درس گاہ جاری کی۔ اس نے عساکر کو منظم کیا، [ہر شعبے میں اصلاحات کیں اور دورِ ابتری کی بربادیوں سے ملک کو نجات دلا کر ترقی کے راستے پر لگانے کی انتہائی کوشش کی۔ طلبہ میں شوقِ علم بڑھانے اور قوم کو تعلیم کی اہمیت پر متوجہ کرنے کے لیے نادر شاہ خود سندیں اور انعامات تقسیم کیا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک تقریب پر، جو قصر دلکشا میں منعقد ہوئی تھی، عبدالخالق نام ایک طالب علم نے، جو چرخی خاندان کا پروردہ تھا، اس وقت نادر شاہ کو گولی ماردی جب وہ طلبہ کی پہلی قطار کے ایک ایک فرد سے مصافحہ کر رہا تھا (۲۰ رجب ۱۳۵۲ھ/ ۸ نومبر ۱۹۳۳ء)۔

نادر شاہ کا ایک بھائی (ہاشم خان، صدر اعظم) ایک نئی سڑک کے افتتاح کے لیے کابل سے باہر تھا۔ دوسرا بھائی (شاہ ولی خان) یورپ میں سفیر تھا۔ صرف تیسرا بھائی شاہ محمود خان وزیر حربیہ کابل میں موجود تھا۔ اس نے نادر شاہ کے بیٹے ظاہر شاہ کو، جس کی عمر انیس سال تھی بادشاہ بنانے کا اعلان کر دیا] عملاً ہاشم خان، صدر اعظم، ہی ۱۹۴۶ء تک امورِ سلطنت کا مختار بنا رہا۔ آئندہ برسوں میں چند قبائلی بغاوتیں [۱۹۳۵ء میں علی زئی قبائل، ۱۹۳۷ء میں جدران اور مہمند قبائل اور ۱۹۴۳ء میں صافی ومہمند قبائل] پورے اہتمام سے فرو کی گئیں اور عسکری، تعلیمی اور اقتصادی ترقیات کی مؤثر تدبیروں پر عمل درآمد ہونے لگا۔ ۱۹۳۴ء میں افغانستان جمعیۃ الاقوام (League of Nations) کا رکن بن گیا۔ ۱۹۳۶ء میں سوویت روس سے تجارتی معاہدہ طے ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں اس نے ترکی، عراق اور ایران کے ساتھ میثاقِ سعد آباد پر دستخط ثبت کیے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں بھی افغانستان کامل غیر جانب داری پر قائم رہا۔ رہے سہے سرحدی تنازعات ۱۹۴۷ء میں طے کر لیے گئے، یعنی شمال کے قضیّے کا روس سے معاہدہ طے کر کے اور دریاے ہلمند کے پانی کے متعلّق ایران سے نزاع کا تصفیہ امریکی ثالثی کے ذریعے ہو گیا۔ اسی سال پاکستان کی نئی مملکت قائم ہوئی، اس وقت سے سابق شمالی و مغربی سرحدی صوبے اور آزاد قبائل کا مسئلہ، جس نے سو سال تک افغانستان اور برطانوی ہند کے باہمی تعلقات کو ابتر بنائے رکھا تھا، ان دو مسلمان مملکتوں کے باہمی تعلقات میں بھی خلل انداز ہوتا رہا۔ [نام نہاد مسئلۂ پختونستان کی بنا پر ۱۹۶۲ء میں کچھ عرصے کے لیے سفارتی تعلقات بھی منقطع ہو گئے، تاہم وزارت عظمیٰ سے سردار داؤد خان کی سبک دوشی کے بعد سے دونوں ملکوں کے تعلقات بہت خوش گوار ہو رہے ہیں].

(ڈیمز M. Longworth Dames و گبّ H. A. R. Gibb)

[وعبدالحی حبیبی، بہ تلخیص از سیّد امجد الطاف]

آئین: افغانستان کا رسمی نام آج کل دولت پادشاہیۂ افغانستان ہے۔ حکومت کی شکل دستوری بادشاہت ہے۔ قانون سازی کا اختیارِ اعلیٰ پارلیمنٹ (شورائے ملّت) کے ہاتھ میں ہے، جس میں بادشاہ، کابینہ وزرا اور مجلس ملّی شامل ہیں۔ سینیٹ پچاس ارکان پر مشتمل ہے، جنھیں بادشاہ عمر بھر کے لیے نام زد کر دیتا ہے اور مجلسِ ملّی کے لیے ۱۷۱ ارکان چنے جاتے ہیں۔ اس کا اجلاس سال میں دو مرتبہ (مئی اور اکتوبر میں) ہوتا ہے، لیکن بہ شرط ضرورت کسی اور وقت بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک مجلسِ اعلیٰ بھی ہے، جو لوئی جرگہ کہلاتی ہے۔ اس کا اجلاس غیر معیّنہ اوقات میں ہوتا رہتا ہے، خصوصاً عام حکمتِ عملی کے بارے میں جب کبھی بادشاہ کو مشورے کی ضرورت ہو۔ ۱۹۶۳ء میں ایک نئے آئین کی تشکیل کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا تھا۔ اس کی سفارشات بھی لوئی جرگے کے سامنے پیش کی گئیں [اب ایک جدید آئین اس کی روشنی میں مرتب ہوا ہے].

نظم ونسق حکومت: [اس آئین کے نافذ ہونے سے پہلے] افغانستان میں چودہ وزارتیں تھیں، یعنی (۱) وزارتِ دفاع؛ (۲) وزارتِ امورِ خارجہ؛ (۳) وزارتِ امورِ داخلہ؛ (۴) وزارتِ تعلیم؛ (۵) وزارتِ اقتصادیات؛ (۶) وزارتِ عدل؛ (۷) وزارتِ تعمیراتِ عامّہ؛ (۸) وزارتِ مال؛ (۹) وزارتِ صحت؛ (۱۰) وزارتِ معادِن وصنعت و حرفت؛ (۱۱) وزارتِ مراسلات؛ (۱۲) وزارتِ زراعت؛ (۱۳) وزارتِ منصوبہ بندی اور (۱۴) وزارتِ صحافت واطلاعات۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک وزیر ہے اور ان کے علاوہ قبائلی معاملات کا ایک الگ محکمہ ہے، جو ایک صدر کے ماتحت ہے۔ وزرا اور یہ صدر سب کابینہ کے رکن ہیں۔ پورا ملک سات بڑے صوبوں: کابل، مزار شریف، قندہار، ہرات، قطغن، ننگرہار (سابق صوبۂ مشرقی) اور پاکتیا (سابق صوبۂ جنوبی) اور گیارہ چھوٹے صوبوں: بدخشان، فراہ، غزنہ، پروان، گرشک، میمنہ، شبرغان، غورات، طالقان، بامیان اور ارزگان میں منقسم ہے۔ ہر صوبے کا ایک گورنر ہے، جو بڑے صوبوں میں نائبِ حکومت اور چھوٹے صوبوں میں حاکمِ اعلیٰ کہلاتا ہے۔

قومی پرچم: قومی جھنڈے میں سیاہ، سرخ اور سبز رنگ کی عمودی پٹیاں ہیں، جن کے درمیان ایک سفید طغرا بنا ہوا ہے۔

رقبہ اور آبادی: کل رقبہ دو لاکھ پچاس ہزار مربع میل اور جدید ترین افغانی اندازے کے مطابق کل آبادی [ایک کروڑ چھیالیس لاکھ چوراسی ہزار] ہے، یعنی آبادی کی گنجانی ایران کی آبادی کی گنجانی سے دُگنی اور ریاست ہاے متحدۂ امریکہ کی گنجان آبادی کے مساوی ہو جاتی ہے۔ [آبادی کی بہت بڑی اکثریت (ننانوے فی صد) مسلمان ہے۔ تھوڑی سی تعداد سکھوں، ہندوؤں اور یہودیوں کی بھی ہے۔] افغانستان کے بیشتر باشندے مذہباً سنّی ہیں، لیکن ایک قلیل تعداد (تقریباً دس لاکھ) شیعوں کی بھی موجود ہے۔

تعلیم: ابتدائی مکاتب جگہ جگہ موجود ہیں۔ ثانوی مدارس صرف بڑے شہروں میں ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ کابل یونیورسٹی میں، جو ۱۹۳۳ء میں قائم کی گئی تھی، حسبِ ذیل نو شعبے (faculties) ہیں: طب، سائنس، زراعت، انجینیرنگ، قانون وسیاست، ادب، اقتصادیات، دینیات اور علم الادویہ۔

نظم ونسق عدالت: قانونِ عدالت زیادہ تر شریعت اسلامیہ پر مبنی ہے۔ ہر ضلع میں محاکمِ ابتدائیہ اور ہر صوبائی مرکزِ حکومت میں محاکمِ مرافعہ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایک عدالتِ عالیہ (محکمۂ عالی تمیز) وزارتِ عدل سے وابستہ ہے اور ایک سپریم کورٹ (ریاست تمیز اعیان) ہے۔ [آئین کی ترمیم کے ساتھ ساتھ نظم ونسق عدالت میں بھی تبدیلیاں کی گئی ہیں].

پیداوار: اگرچہ افغانستان کا زیادہ تر علاقہ پہاڑی اور بنجر ہے، تاہم بیچ بیچ میں وادیاں اور سرسبز زرخیز میدان آجاتے ہیں، جہاں نہروں اور کنووں سے آب پاشی کے ذریعے اتنا اناج پیدا ہو جاتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے لیے کافی ہو۔ ایسا قابلِ زراعت علاقہ کوئی ساڑھے تین کروڑ ایکڑ ہے، جس میں تقریباً دو کروڑ ایکڑ عملاً زیرِ کاشت ہے۔ یہاں کئی قسم کے پھل بھی بہت اچھے اور افراط سے پیدا ہوتے ہیں، تازہ اور خشک پھل بڑی مقدار میں باہر بھیجے جاتے ہیں۔ دنبوں کی کثرت ہے اور ان

کی کھالوں اوراون کی برآمد ملک کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ایرانی نسل کی قرہ قلی بھیڑیں بھی پالی جاتی ہیں اوران کی کھالیں بھی بیرونی ممالک میں بھیجی جاتی ہیں۔ روئی بھی خاصی مقدار میں پیدا ہوتی ہے (۱۹۶۰-۱۹۶۱ء میں تقریباً چوّن ہزار ٹن)۔ ارنڈ، مجیٹھ اور ہینگ کے پیڑ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

معدنیات: افغانستان کی کانوں سے ابھی پوری طرح کام نہیں لیا گیا، لیکن یہاں تانبے کی افراط ہے۔ سیسا اور لوہا بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ کوئلے کی کانیں بھی دریافت ہوئی ہیں اور ابھی حال میں ہرات اور شمالی علاقے میں پٹرول بھی دستیاب ہوا ہے۔ سونا قندھار میں اور کئی شمالی دریاؤں کی ریت میں پایا جاتا ہے۔ پنج شیر کی وادی میں چاندی کی کانیں ہیں اور بدخشان میں دنیا کا بہترین لاجورد (Iapis Iazuli) ملتا ہے۔ پنج شیر میں ابرق کی کان دریافت ہوئی ہے اور میمنہ کے علاقے میں گندھک کے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔

صنعت وحرفت: زمانۂ حال میں صنعت وحرفت میں نمایاں ترقی ہوئی ہے اور ملک میں متعدّد کارخانے قائم ہو چکے ہیں، جن میں سے کابل میں دیاسلائی، بٹن، چمڑے کی چیزوں، سنگ مرمر کے ظروف، فرنیچر، شیشے، سائیکلوں اور پلاسٹک کے کارخانے ہیں۔ ایک اَور کارخانہ موٹروں کے فالتو پرزوں کی ساخت کے لیے بھی قائم ہو گیا ہے۔ اون کا ایک کارخانہ قندھار میں ہے اور ایک کابل میں؛ روئی دھننے کے کارخانے قندھار اور لشکر گاہ میں ہیں؛ سوتی کپڑوں کا ایک کارخانہ جبل سراج میں اور ایک پل خمری میں ہے۔ جرمنوں نے گل بہار میں ایک جدید وضع کا کپڑے کا کارخانہ قائم کیا ہے۔ فوج کے لیے اسلحہ اور بارود سازی کا ایک الگ کارخانہ ہے۔ بغلان میں چقندر سے شکر بنانے کا اور قندھار میں پھلوں کو ڈبوں میں محفوظ کرنے (canning) کا کارخانہ ہے۔ دریاے کابل پر سرَبوئی میں ایک برقابی کارخانہ بن چکا ہے اور ایک اَور نغلو میں ۱۹۶۷ء تک تیار ہو جائے گا۔ جبل سراج اور پل خمری میں سیمنٹ کے بڑے بڑے کارخانے بن گئے ہیں۔

مواصلات: افغانستان اپنے ہمسایہ ملکوں سے سڑکوں کے ذریعے مربوط ہے، جن میں سے کئی ایک سرحد کے مختلف درّوں میں سے گزر کر اسے پاکستان سے ملاتی ہیں۔ ان درّوں میں سب سے اہم درّۂ خیبر ہے۔ قندھار سے چمن تک کی سڑک پختہ بن گئی ہے [اور وہاں ایک ریلوے لائن بنانے کا معاہدہ بھی پاکستان سے ہو چکا ہے]۔ امریکی سرمایہ دار تورخم سے کابل تک کی دوسو میل لمبی سڑک کو پختہ بنا رہے ہیں اور اسی طرح کابل سے قندھار جانے والی سڑک پختہ بن گئی ہے۔ ہرات سے ایران جانے والی سڑک کو پختہ بنانے کا منصوبہ زیرِ غور ہے۔ روسیوں نے اپنی سرحد پر کشک سے قندھار تک کی سڑک کو پختہ بنانے کا معاہدہ کر لیا ہے اور ہندوکش میں سے سلنگ (salang) کی زمین دوز سڑک بھی بنا رہے ہیں، جس سے شمال کا پرانا راستہ ایک سو بیس میل کم ہو جائے گا۔ صوبائی مرکز سب کے سب کابل کے ساتھ موٹر کی سڑکوں کے ذریعے وابستہ ہیں، لیکن سامانِ تجارت ابھی تک زیادہ تر اونٹوں یا ٹٹوؤں وغیرہ کے ذریعے لایا لے جایا جاتا ہے۔ افغانستان میں ہنوز ریلیں نہیں بنیں، لیکن اس سلسلے میں ۱۹۶۳ء میں پاکستان سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے طورخم اور چمن سے ریلوے لائنیں افغانستان کے اندر تک بنائی جا سکیں گی۔

سکّہ: افغانستان کا روپیہ (افغانی) چاندی کا سکّہ ہے، جس میں دس گرام چاندی ہوتی ہے (۹۰۰ء خالص) اور یہ سو پیسوں (پول) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

([ادارہ، ماخوذ از *The Statesman's Year-Book*، ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء])

مآخذ: (۱) البلاذری: فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۰۱ء؛ (۲) ابن خُرداذبہ: المسالک و الممالک، لائڈن ۱۳۰۶ھ؛ (۳) قدامہ بن جعفر: کتاب الخراج، لائڈن ۱۸۹۲ء؛ (۴) ابن الأثیر: الکامل، مصر ۱۲۹۰ھ؛ (۵) الاصطخری: المسالک والممالک، لائڈن ۱۳۰۶ھ؛ (۶) المقدسی: احسن التقاسیم، لائڈن ۱۸۷۷ء؛ (۷) ابن حجر العسقلانی: الأصابة فی تمییز الصحابة، مصر ۱۳۲۳ھ؛ (۸) الیعقوبی: کتاب البلدان، لائڈن ۱۸۹۲ء؛ (۹) ابن خلّکان: وفیات الاعیان، بولاق ۱۲۹۹ھ؛ (۱۰) المسعودی: مروج الذھب، پیرس ۱۸۶۱ء بعد؛ (۱۱) ابن مسکویہ: تجارب الامم، لائڈن ۱۹۰۹ھ؛ (۱۲) الذہبی: دول الاسلام، حیدرآباد دکن ۱۳۳۳ھ؛ (۱۳) حدود العالم، تہران ۱۹۳۲ء (حواشی از منورسکی (Minorsky)، لنڈن ۱۹۳۷ء)؛ (۱۴) ابن الندیم: الفہرست، قاہرہ ۱۳۴۸ھ؛ (۱۵) سیّد جمال الدین افغانی: تتمة البیان، قاہرہ ۱۹۰۱ء؛ (۱۶) جرجی زیدان: تاریخ التمدن الاسلامی، قاہرہ ۱۹۰۲ء؛ (۱۷) وہی مصنّف: مشاھیر الشرق، قاہرہ ۱۹۱۰ء؛ (۱۸) حسن ابراہیم: تاریخ الاسلام السیاسی والدینی والثقافی والاجتماعی، ۳ جلد، مصر ۱۹۴۸ء؛ (۱۹) صدرالدین علی: اخبار الدولة السلجوقیة، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۲۰) محمد حسن: مرآة الاشباہ، مطبوعۂ اودھ؛ (۲۱) شمس الدین سامی: قاموس الاعلام، استانبول ۱۳۰۸ھ؛ (۲۲) خلیل ادہم: دول اسلامیہ، استانبول ۱۹۲۷ء؛ (۲۳) بیہقی: تاریخ مسعودی، ۲ جلد، تہران ۱۹۴۷ء؛ (۲۴) ابونصر العتبی: تاریخ یمینی، مصر ۱۲۹۰ھ؛ (۲۵) تاریخ سیستان، طبع بہار، تہران ۱۹۳۴ء؛ (۲۶) تاریخ طبری [فارسی]، ترجمۂ بلعمی، لکھنؤ ۱۹۱۶ء؛ (۲۷) جوینی: تاریخ جہانگشای، تہران ۱۳۱۵ھ ش؛ (۲۸) حافظ ابرو: ذیل جامع التواریخ رشیدی، تہران ۱۹۳۷ء؛ (۲۹) تزک تیموری، بمبئی ۱۳۲۶ھ؛ (۳۰) تزک بابر، ترجمۂ عبدالرحیم خانخانان، طبع ہند ۱۳۰۸ھ؛ (۳۱) بابر نامہ، تعلیقات از بیورج، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۳۲) غیاث الدین احمد خواندامیر: قانون ہمایونی، طبع بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۹۴۰ء؛ (۳۳) بایزید بیات: تذکرۂ ہمایوں و اکبر، کلکتہ ۱۹۴۱ء؛ (۳۴) ابوالفضل: آئین اکبری، لکھنؤ ۱۳۰۲ھ؛ (۳۵) وہی مصنّف: اکبر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۶ء؛ (۳۶) تزک جہانگیری، طبع میرزا ہادی، لکھنؤ ۱۳۲۷ھ؛ (۳۷) معتمد خان بخشی: اقبال نامۂ جہانگیری، کلکتہ ۱۸۸۵ء؛ (۳۸) عبدالقادر بداؤنی: منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۹ء؛ (۳۹) محمد صالح لاہوری: عمل صالح، کلکتہ ۱۹۳۹ء؛ (۴۰) عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی، کلکتہ ۱۹۲۵ء؛ (۴۱) نظام الدین احمد ہروی: طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۴۲) منشی محمد کاظم: عالمگیر نامہ، کلکتہ ۱۸۶۸ء؛ (۴۳) خافی خان: منتخب اللباب، طبع بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۸۹۶ء؛ (۴۴) رقعات عالمگیر، طبع دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۴۵ء؛ (۴۵) نواب صمصام الدولہ: مآثر الامراء، کلکتہ ۱۳۰۹ھ؛ (۴۶) سیّد غلام علی بلگرامی: سبحة المرجان فی آثار ہندوستان، ۱۳۰۳ھ؛ (۴۷) مرتضٰی حسین بلگرامی: حدیقة الاقالیم، لکھنؤ ۱۲۹۶ھ؛ (۴۸) مفتی غلام سرور لاہوری: خزینة الاصفیاء، لکھنؤ ۱۹۴۴ء؛ (۴۹) غلام علی آزاد: خزانۂ عامرہ، مطبوعۂ ہند؛ (۵۰) امیر علی شیر نوائی:

مجالس النفائس، تہران ۱۹۴۴ء؛ (۵۱) آتشکدۂ آذر، بمبئی ۱۳۰۹ھ؛ (۵۲) یحییٰ بن احمد سہرندی: تاریخ مبارک شاہی، طبع بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۹۳۱ھ؛ (۵۳) خواندامیر: حبیب السیر، بمبئی ۱۲۷۳ھ؛ (۵۴) منہاج سراج: طبقات ناصری، طبع حبیبی، کوئٹہ ۱۹۴۹ء؛ (۵۵) عبدالرزاق سمرقندی: مطلع سعدین، طبع ڈاکٹر محمد شفیع، لاہور ۱۳۶۰ھ؛ (۵۶) قابوس نامہ، تہران ۱۹۴۰ء؛ (۵۷) عروضی: چہار مقالہ، مع تعلیقاتِ قزوینی، لائڈن ۱۹۰۹ء؛ (۵۸) عوفی: لباب الالباب، لائڈن ۱۳۲۱–۱۳۲۴ھ؛ (۵۹) علی بن حامد کوفی سندی: چچ نامہ، نشریۂ عمر بن محمد داؤد پوتہ، دہلی ۱۹۳۹ء؛ (۶۰) تاریخ فرشتہ، لکھنؤ ۱۳۲۱ھ؛ (۶۱) میرخواند: روضۃ الصفاء، مطبوعۂ لکھنؤ؛ (۶۲) سیّد معصوم بکری: تاریخ سندھ، بمبئی ۱۹۳۸ء؛ (۶۳) حمداللہ مستوفی: تاریخ گزیدہ، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۶۴) عبدالحی گردیزی: زین الاخبار، تہران ۱۹۳۵ء؛ (۶۵) یحییٰ قزوینی: لب التواریخ، تہران ۱۹۳۵ء؛ (۶۶) مجمل التواریخ والقصص، طبع بہار، تہران ۱۹۳۸ء؛ (۶۷) نوراللہ لاوردی: زندگانی نادر شاہ، تہران ۱۹۳۹ء؛ (۶۸) رضاقلی ہدایت: روضۃ الصفا ناصری، ج ۸، تہران ۱۳۰۲ھ؛ (۶۹) تاریخ نظامی ایران....، تہران ۱۳۱۵ھ ش؛ (۷۰) میرزا محمد خلیل صفوی: مجمع التواریخ، تہران ۱۹۴۹ء؛ (۷۱) محمد طاہر قزوینی: عباس نامہ، تہران ۱۹۵۰ء؛ (۷۲) نجف قلی معزّی: تاریخ روابط سیاسی ایران، تہران ۱۹۴۷ء؛ (۷۳) عبداللہ رازی: تاریخ ایران، تہران ۱۹۳۶ء؛ (۷۴) عبّاس اقبال: تاریخ مفصّل ایران در عہد مغول، تہران ۱۹۳۲ء؛ (۷۵) وہی مصنّف: تاریخ عمومی، تہران ۱۹۲۵ء؛ (۷۶) حسین فروغی: تاریخ ایران، تہران ۱۳۱۸ھ؛ (۷۷) ابن محمد امین: مجمل التواریخ بعہد نادریہ، تہران ۱۹۴۰ء؛ (۷۸) سلطان محمد خالص قندہاری: تاریخ سلطانی، بمبئی ۱۲۹۸ھ؛ (۷۹) شیر محمد گندا پور: خورشید جہان، لاہور ۱۸۹۴ء؛ (۸۰) عبدالرؤف بینوا: میرویس خان، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۸۱) محمد زردار خان ناغر افغان: صولت افغانی، لکھنؤ ۱۸۷۶ء؛ (۸۲) رھنمای افغانستان، نشریۂ اکادمی افغان، کابل ۱۹۴۹ء؛ (۸۳) احمد علی کہزاد: تاریخ افغانستان، ج ۲، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۸۴) وہی مصنّف: در زوایای تاریخ افغانستان، کابل ۱۹۵۲ء؛ (۸۵) وہی مصنّف: مسکوکاتِ افغانستان در عصرِ اسلام، کابل ۱۹۳۹ء؛ (۸۶) سیّد قاسم رشتیا: افغانستان در قرنِ نوزدہم، کابل ۱۹۵۰ء؛ (۸۷) عبدالشکور: کتیبہ ہای میوزیم پشاور، پشاور ۱۹۴۸ء؛ (۸۸) ملک الکتاب شیرازی: زینت الزمان فی تاریخ ہندوستان، بمبئی ۱۳۱۰ھ؛ (۸۹) نواب محمد غوث خان افغان: مجمع السلاطین، بمبئی ۱۲۷۹ھ؛ (۹۰) حمید کشمیری: اکبر نامہ (منظوم)، کابل ۱۹۵۱ء؛ (۹۱) مفتاح التواریخ، طبع ولیم بیل، مطبوعۂ لکھنؤ؛ (۹۲) فخر مدبر: منتخبات آداب الحرب، لاہور ۱۹۳۸ء؛ (۹۳) دکتور شفق: تاریخِ ادبیاتِ ایران، تہران ۱۹۴۲ء؛ (۹۴) سیفی ہروی: تاریخ ہرات، کلکتہ ۱۹۴۳ء؛ (۹۵) مکتوباتِ محمود گاوان، مطبوعۂ حیدرآباد دکن؛ (۹۶) محمد عبدالسّلام خان عمرخیل: نسب نامہ افاغنہ، مطبوعۂ ہند ۱۹۱۴ء؛ (۹۷) یعقوب علی کابلی: بادشاہان متأخّر افغانستان، کابل ۱۹۵۳ء؛ (۹۸) محمد عبّاس رفعت: ترک افغانی، مطبوعۂ ہند ۱۲۹۹ھ؛ (۹۹) فرہنگ اوستا، مطبوعۂ بمبئی؛ (۱۰۰) علی قلی میرزا: تاریخ افغانستان، مطبوعۂ تہران؛ (۱۰۱) میر غلام محمد غبار: احمد شاہ بابا، کابل ۱۹۴۴ء؛ (۱۰۲) وہی مصنّف: افغانستان و نگاہی بتاریخ افغان، در مجلۂ کابل، ج ۱ و ۲، کابل ۱۹۳۱–۱۹۳۲ء؛ (۱۰۳) شاہ ولی اللہ دہلوی: مکتوباتِ سیاسی، نشریۂ خلیق نظامی، علی گڑھ ۱۹۵۰ء؛ (۱۰۴) مکتوباتِ شاہ فقیر اللہ علوی، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۰۵) حسامی: فتوح السلاطین، آگرہ ۱۹۳۸ء؛ (۱۰۶) عطا محمد: نوای معارک، کابل ۱۹۵۳ء؛ (۱۰۷) امیر عبدالرحمٰن: تاج التواریخ، بمبئی ۱۳۲۲ھ؛ (۱۰۸) محمد سعادت خان ترین افغان: خصائل السعادۃ، لکھنؤ ۱۸۵۵ء؛ (۱۰۹) شاہ شجاع سدوزئی: واقعاتِ شاہ شجاع، کابل ۱۹۵۳ء؛ (۱۱۰) محمد عبدالحکیم لودی: شوکتِ افغانی، آگرہ ۱۳۲۵ھ؛ (۱۱۱) تذکرۂ نصر آبادی، تہران ۱۳۱۵ھ ش؛ (۱۱۲) عبدالحکیم استاقی: سکینۃ الفضلاء، دہلی ۱۳۵۰ھ؛ (۱۱۳) وہی مصنّف: چراغِ انجمن، دہلی ۱۹۲۱ء؛ (۱۱۴) میر احمد شاہ بخاری: شکرستانِ افغانی، لاہور ۱۳۰۵ھ؛ (۱۱۵) علی اصغر حکمت: جامی، تہران ۱۹۴۰ء؛ (۱۱۶) امیر شیر علی لودھی: مرآۃ الخیال، مطبوعۂ ہند؛ (۱۱۷) گلشن ردہ، طبع راورٹی (Raverty)، ہرٹفورڈ ۱۸۶۰ء؛ (۱۱۸) کلیدِ افغانی، طبع ہیوز (Rev. Hughes)، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۱۹) مجلّۂ کاوہ، سال ۲، برلن ۱۳۰۳ھ ش؛ (۱۲۰) جریدۂ امان افغان، کابل ۱۹۱۹ء؛ (۱۲۱) سالنامہ ہای کابل: ۱۹۳۰–۱۹۵۳ء، نشریات اکادمی افغان، کابل؛ (۱۲۲) میرزا مہدی: درۂ نادرہ، بمبئی ۱۳۰۹ھ؛ (۱۲۳) وہی مصنّف: جہانکشای نادری، بمبئی ۱۳۰۹ھ؛ (۱۲۴) امرناتھ: ظفر نامۂ رنجیت، لاہور ۱۹۲۸ء؛ (۱۲۵) قاسم علی: محاربۂ کابل، آگرہ ۱۲۷۲ھ؛ (۱۲۶) میر احمد شاہ افغانی: بہارستانِ افغانی، لاہور ۱۳۰۵ھ؛ (۱۲۷) محمد حسین سنبھلی: تذکرۂ حسینی، لکھنؤ ۱۲۹۲ھ؛ (۱۲۸) سیّد صدیق حسن خان: شمعِ انجمن، بھوپال ۱۲۹۲ھ؛ (۱۲۹) منشی عبدالکریم: تاریخ احمدی، مطبع نولکشور ۱۲۶۶ھ؛ (۱۳۰) غلام حسین: سیَر المتاخّرین، مطبع نولکشور، لکھنؤ؛ (۱۳۱) سیّد ظہور الحسین موسوی: تاریخِ افاغنہ، مطبوعۂ ہند ۱۳۳۰ھ؛ (۱۳۲) امین احمد رازی: ہفت اقلیم، کلکتہ ۱۹۱۸ء؛ (۱۳۳) محمد حیات خان: حیات افغانی، لاہور ۱۸۶۷ء و انگریزی ترجمہ: *Afghanistan*، لاہور ۱۸۷۶ء؛ (۱۳۴) سیّد ابوظفر ندوی: تاریخِ مختصرِ ہند، اعظم گڑھ ۱۳۵۵ھ؛ (۱۳۵) سیّد الطاف علی: حیاتِ حافظ رحمت خان، بدایون ۱۹۳۳ء؛ (۱۳۶) رحمٰن علی خان: تذکرۂ علمای ہند، لکھنؤ ۱۲۹۲ھ؛ (۱۳۷) دوست محمد کامل: خوشحال خان خٹک، پشاور ۱۹۵۱ء؛ (۱۳۸) محمد حسین خان: افغان بادشاہ، لاہور ۱۳۴۶ھ؛ (۱۳۹) وہی مصنّف: انقلابِ افغانستان، مطبوعۂ جالندھر؛ (۱۴۰) برہان الدین کشکلی: نادر افغان، کابل ۱۳۱۰ھ؛ (۱۴۱) اللہ بخش یوسفی: تاریخِ آزاد پٹھان، لاہور ۱۹۵۹ء؛ (۱۴۲) وہی مصنّف: یوسف زئی افغان، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۱۴۳) جمال الدین افغانی: تاریخِ افغانستان، مترجمۂ محمود علی خان، منڈی بہاؤالدین ۱۳۴۲ھ؛ (۱۴۴) سلطان محمد خان: دبدبۂ امیری، مترجمۂ محمد حسن بلگرامی، حیدرآباد دکن ۱۹۰۱ء؛ (۱۴۵) سیّد شاہ بخاری: کابل میں چار بادشاہ، مطبوعۂ حمایت اسلام پریس، لاہور؛ (۱۴۶) عزیز ہندی: زوالِ غازی امان اللہ خان، امرتسر ۱۹۳۴ء؛ (۱۴۷) محمود الرحمٰن ندوی: دولت غزنویہ، لاہور ۱۹۳۱ء؛ (۱۴۸) حاجی محمد خان: ذکرِ شاہِ اسلام، مطبوعۂ مطبع نظامی، دہلی؛ (۱۴۹) عبیداللہ سندھی: کابل میں سات سال، لاہور ۱۹۵۵ء؛ (۱۵۰) محمد علی قصوری: مشاہداتِ کابل و یاغستان، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو پاکستان؛ (۱۵۱) تردیدِ شایعاتِ باطلۂ شاہِ مخلوع (مع فیصلہ لوی جرگہ، ۵)، ۱۳۰۹ھ، (۱۵۲) محمد ہوتک: پٹھ خزانہ، مع تعلیقاتِ حبیبی، کابل ۱۹۴۴ء؛ (۱۵۳) اخوند درویزہ: تذکرۃ الابرار والاشرار، پشاور ۱۳۰۹ھ؛ (۱۵۴) قاضی عطاء اللہ: تاریخ پشتون، پشاور ۱۹۴۷ء؛ (۱۵۵) افضل خان: تاریخ مرصّع، ہرٹفورڈ ۱۸۶۰ء؛ (۱۵۶) سلیمان ماکو: تذکرۃ الاولیاء، در پشتانۂ شعراء، کابل ۱۹۴۰ء؛ (۱۵۷) اخوند قاسم پاپن خیل: فوائد الشریعہ، مطبوعۂ لاہور؛ (۱۵۸)

عبدالحی حبیبی: تاریخچۂ شعر پشتو، قندہار ۱۹۳۵ء؛ (۱۵۹) وہی مصنّف: مقدمۂ دیوان عبدالقادر خان خٹک، قندہار ۱۹۳۷ء؛ (۱۶۰) وہی مصنّف: مقدمۂ کلیات خوشحال خان، قندہار ۱۹۳۷ء؛ (۱۶۱) وہی مصنّف: لوی احمد شاہ بابا، کابل ۱۹۳۹ء؛ (۱۶۲) وہی مصنّف: پشتانۂ شعراء، ج ۱، کابل ۱۹۴۰ء؛ (۱۶۳) وہی مصنّف: مشاہیرِ ابدالیان، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۱۶۴) وہی مصنّف: مؤرّخین گمنام افغان، کابل ۱۹۴۶ء؛ (۱۶۵) وہی مصنّف: مقالۂ ''تعدیل'' (دربارۂ نسب نامۂ اہلِ کرت)، درمجلۂ آریانہ، شمارہ ۶۸، کابل ۱۹۴۸ء؛ (۱۶۶) وہی مصنّف: تاریخِ ادبیاتِ پشتو، کابل ۱۹۵۰ء؛ (۱۶۷) وہی مصنّف: افغانستان در عصرِ تیموریانِ ہند (غیر مطبوعہ)؛ (۱۶۸) نادر نامہ (منظوم)، مخطوطۂ حبیبی؛ (۱۶۹) خلاصۃ الانساب ابدالی، مخطوطہ؛ (۱۷۰) نعمت اللہ ہروی: مخزنِ افغانی، مخطوطہ؛ (۱۷۱) اخوند درویزہ: مخزنِ اسلام، (پشتو)، مخطوطہ؛ (۱۷۲) ملّا مست زمند: سلوک الغزاۃ (پشتو)، مخطوطہ؛ (۱۷۳) شیخ امام الدین پشاوری: تاریخِ افغانی، مخطوطۂ کابل؛ (۱۷۴) عوفی: جوامع الحکایات، مخطوطۂ کابل؛ (۱۷۵) محمد نسوی: سیرۃ جلال الدین منکبرتی، مخطوطۂ کابل؛ (۱۷۶) فیض محمد ہزارہ: تحفۃ الحبیب، مخطوطۂ کابل؛ (۱۷۷) نواب محبت خان: ریاض المحبۃ، مخطوطہ؛ (۱۷۸) فیض اللہ بنیانی: تاریخ محمود شاہی، مخطوطۂ پشاور؛ (۱۷۹) حسن خواجہ بخاری: مذکر احباب، مخطوطۂ برلن؛ (۱۸۰) تاش محمد القندوزی: حجۃ الاورنگ شاہیہ، مخطوطۂ کابل؛ (۱۸۱) والہِ داغستانی: ریاض الشعراء، مخطوطۂ کابل؛ (۱۸۲) ہلمفورڈ، آئزک: جنگِ افغان و فارس (ترجمہ)، مطبوعۂ لنڈن؛ (۱۸۳) سرجان ملکم: تاریخ ایران، (ترجمہ)، بمبئی ۱۸۶۷ء؛ (۱۸۴) کریستنسین: ایران بعہد ساسانیان (ترجمہ)، دہلی ۱۹۴۱ء؛ (۱۸۵) بارٹولڈ: جغرافیای تاریخی ایران (ترجمہ)، تہران ۱۹۲۸ء؛ (۱۸۶) لین پول: طبقات سلاطینِ اسلام (ترجمہ)، تہران ۱۳۱۹ھ ش؛ (۱۸۷) پاول ہورن: تاریخِ مختصرِ ایران، تہران ۱۹۴۲ء؛ (۱۸۸) M. Akram: *Bibliographie analytique de l'Afghanistan*، پیرس ۱۹۴۷ء؛ (۱۸۹) M. Elphinstone: *Caubul*، لنڈن ۱۸۳۹-۱۸۴۲ء؛ (۱۹۰) وہی مصنّف: *Account of the Kingdom of Caboul*، لنڈن ۱۸۱۵ء؛ (۱۹۱) J. Bidulph: *Tribes of the Hindoo Koosh*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۱۹۲) J.P. Ferrier: *Caravan Journeys*، لنڈن ۱۸۵۷ء؛ (۱۹۳) وہی مصنّف: *History of the Afghans*، لنڈن ۱۸۵۸ء؛ (۱۹۴) A. Burnes: *Cabool*، لنڈن ۱۸۴۲ء؛ (۱۹۵) وہی مصنّف: *Bokhara*، ترجمۂ انگریزی از V. Bode، لنڈن ۱۸۴۵ء؛ (۱۹۶) H. W. Bellew: *Afghanistan and the Afghans*، لنڈن ۱۸۳۹ء؛ (۱۹۷) وہی مصنّف: *Political Mission to Afghanistan*، لنڈن ۱۸۶۲ء؛ (۱۹۸) وہی مصنّف: *From the Indus to the Tigris*، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۱۹۹) وہی مصنّف: *Races of Afghanistan*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۲۰۰) T. H. Holdich: *The Indian Borderland*، لنڈن ۱۹۰۱ء؛ (۲۰۱) وہی مصنّف: *Geographical results of the Afghan Campaign*، در F. J. Evan Smith (۲۰۲)؛ *Proc. of the Geogr. Soc.*، ۱۸۷۹ء؛ Goldsmid: *Eastern Persia*، ۱: ۲۲۳-۴۲۸؛ (۲۰۳) C. Masson: *Travels in Balochistan, Afghanistan,* etc.، لنڈن ۱۸۴۴ء؛ (۲۰۴) G.T. Vigne: *Ghazni, Kabul and Afghanistan*، لنڈن ۱۸۴۰ء؛ (۲۰۵) Mohan Lal: *Travels in Panjab, Afghanistan*، لنڈن ۱۸۴۶ء؛ (۲۰۶) وہی مصنّف: *Life of Dost Mahomed*، ۲ جلد، کلکتہ ۱۸۴۶ء؛ (۲۰۷) C. E. Yate: *Northern Afghanistan*؛ (۲۰۸) G. S. Thorburn: *Bannu*، لنڈن ۱۸۷۶ء؛ (۲۰۹) Oliver: *Across the Border, Pathan and Baloch*، لنڈن ۱۸۹۰ء؛ (۲۱۰) A. H. Mac-Mohan: *Southern Borderland of Afghanistan*، در *Geogr. Journal*، ۱۸۹۷ء؛ (۲۱۱) وہی مصنّف: *Survey and Exploration in Seistan*، درمجلۂ مذکور، ۱۹۰۶ء؛ (۲۱۲) P. Molesworth Sykes: *Fourth Journey in Persia*، درمجلۂ مذکور، ۱۹۰۲ء؛ (۲۱۳) وہی مصنّف: *A History of Afghanistan*، لنڈن ۱۹۴۰ء (مکمّل مآخذ)؛ (۲۱۴) A. and P. Gries-bach: *Field Notes, Geol. Survey of India*، ۲۹: ۱، ۱۴؛ (۲۱۵) F. A. G. Martin: *Afghanistan*، لنڈن ۱۹۰۶ء؛ (۲۱۶) A. Hamilton: *Under the absolute Amir*، لنڈن ۱۹۰۷ء؛ (۲۱۷) O. V. Nieder-mayer: *Afghanistan*، لائپزگ ۱۹۳۴ء؛ (۲۱۸) E. Trinkler: *Afgh-anistan, eine landeskundliche Studie*، گوتھا ۱۹۲۸ء؛ (۲۱۹) وہی مصنّف: *Quer durch Afghanistan nach Indien*، برلن ۱۹۲۵ء؛ (۲۲۰) R. Furon: *L'Afghanistan*، پیرس ۱۹۲۶ء؛ (۲۲۱) وہی مصنّف: *L'Iran, Perse et l'Afghanistan*، طبع ثانی، پیرس ۱۹۵۱ء؛ (۲۲۲) E. Dollot: *L'Afghanistan*، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۲۲۳) Ikbal Ali Shah: *Modern Afghanistan*، لنڈن ۱۹۳۸ء؛ (۲۲۴) V. Červinka: *Struc-ture économique et social commerce extérieur*، لوزان ۱۹۵۰ء؛ (۲۲۵) H. G. Raverty: *Races of Afghanistan*، کلکتہ ۱۸۸۰ء؛ (۲۲۶) وہی مصنّف: *Grammar*، طبع ثالث، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۲۲۷) B. S. Guba: *Racial Affinities of the People of India*، در *Census of India 1931*، ۱/۳: بعد، شملہ ۱۹۳۵ء؛ (۲۲۸) G.S. Robertson: *Kafirs of the Hindu-Kush*، لنڈن ۱۸۹۶ء؛ (۲۲۹) Herrlich: *Beiträge zur Rassen-und Stammeskunde der Hindukusch -Kafiren*، در *Deutsche im Hindukush*، برلن ۱۹۳۷ء؛ (۲۳۰) Markowski: *Die materielle Kultur des Kabulgebieties*، لائپزگ ۱۹۳۲ء؛ (۲۳۱) Andreev: *Po etnologiya Afghanistana*، تاشکنت ۱۹۳۲ء؛ (۲۳۲) G. Tarring: *On the distribution of Turkish Tribes in Afgh-anistan*، Lund-لائپزگ ۱۹۳۹ء؛ (۲۳۳) وہی مصنّف: *Uzbek Texts from Afghan Turkestan*، Lund ۱۹۳۸ء؛ (۲۳۴) Bacon: *Inquiry into the History of the Hazara Mongols*، در *J. W. S. Journal of Anthropology*، ۱۹۵۱ء، ص ۲۳۰ بعد؛ (۲۳۵) G. A. Gri-erson: *Linguistic Survey of India*، ج ۸/۲ و ج ۱۰؛ (۲۳۶) وہی مصنّف: *The Ōrmurī or Bargistā Language*، کلکتہ ۱۹۱۸ء؛ (۲۳۷) G. Morgenstierne: *Report on a Linguistic Mission to Afghanistan*، اوسلو ۱۹۲۶ء؛ (۲۳۸) وہی مصنّف: *Report on a Ling-*

uistic Mission to N. W. India، اوسلو ۱۹۳۲ء؛ (۲۳۹) وہی مصنّف: Persian Texts from Afghanistan، در AO، ج ۶؛ (۲۴۰) وہی مصنّف: Indo-Iranian Frontier Languages، ج ۱ و ۲، اوسلو ۱۹۲۹ء؛ (۲۴۱) وہی مصنّف: Supplementary Notes on Ormuri، در N(orsk) T(idskrift for) S(progwidenskap)، ج ۵؛ (۲۴۲) وہی مصنّف: The Language of the Ashkun Kafirs، در NTS، ج ۴؛ (۲۴۳) وہی مصنّف: The Language of the Prasun Kafirs، در NTS، ج ۱۵؛ (۲۴۴) وہی مصنّف: Notes on Shughni، در NTS، ج ۱؛ (۲۴۵) وہی مصنّف: D. L. Lorimer (۲۴۶): Notes on Gawar Bati، اوسلو ۱۹۵۰ء؛ Phonology of Bakhtiari, Badakhshani, etc.، لنڈن ۱۹۲۲ء؛ (۲۴۷) W. Gieger: Pamir-Dialekte، در Grundr. d. iran Philol.، ج ۱/۲ (مع آخذ)؛ R. Ganthiot (۲۴۸): Quelques observations sur le mind- jânni، در MSL، ۱۹۱۵ء؛ W. Lentz (۲۴۹): Materialien zur Kenntnis der Shugni-Gruppe، گوٹنگن ۱۹۳۳ء؛ (۲۵۰) H. Sköld: Materialien zu den iranischen Pamirsprachen، I. I. Zarubin (۲۵۱): Kharakteristike mund- Lund ۱۹۳۶ء؛ Klimčitsky (۲۵۲): Vakha- zhanskogo yazïka، لینن گراڈ ۱۹۲۷ء؛ Ramstedt (۲۵۳): Mogholica، در nskie tekstï، ماسکو-لینن گراڈ ۱۹۳۶ء؛ Leech (۲۵۴): Vocabulary of Moghal Aimaks، JSFO، ص ۲۳؛ W. M. McGovern، The Early Empires of Central Asia: Vocabularies of Some Languages, etc.، در C. B. Melleson (۲۵۶): History of Afghnistan، لاہور ۱۹۳۹ء؛ G. P. Tate (۲۵۷): The Kingdom of Afgh- anistan—a historical sketch، لنڈن ۱۸۸۰ء، ۱۸۷۸ء؛ W. K. Fraser-Tytler (۲۵۸): Afghanistan — a study of political developments، طبع ثانی، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ C. C. Davies (۲۵۹): The Problem of the North-West Frontier, 1890-1908، کیمبرج ۱۹۳۲ء؛ W. Huberton (۲۶۰): Anglo-Russian Relations concerning Afghanistan, 1837-1907، لنڈن ۱۹۳۷ء؛ Cambridge History of India (۲۶۱)، ج ۵، باب ۲۸ (ص ۴۳۲ و مآخذ: ص ۶۴۳ ببعد)؛ Durand (۲۶۲): Causes of His- tory of Afghan War، لنڈن ۱۸۷۴ء؛ J. W. Kaye (۲۶۳): the First Afghan War، لنڈن ۱۸۷۹ء؛ The Second Afghan War, 1878-1880, Abridged Official Account، لنڈن ۱۹۰۸ء؛ Heusman (۲۶۵): Afghan war of 1879-80، لنڈن ۱۸۸۱ء؛ (۲۶۶) The Third Afghan War, 1919, Official Account، کلکتہ ۱۹۲۶ء؛ White King (۲۶۷): History and Coinage of the Bara- kzais، در Numismatic Chronicle، ۱۸۹۶ء؛ A. Conolly (۲۶۸): Journey to the North of India Overland from England، ۲ جلد، لنڈن ۱۸۳۴ء؛ Barr (۲۶۹): Journal of a march from Delhi to.....Cabul with the mission of Sir C. M. Wade، ۱۸۴۴ء؛ Lady Sale (۲۷۰): Journal of the disasters in Afgha- nistan، لنڈن ۱۸۴۳ء؛ Hough (۲۷۱): Narrative of the march and opperations of the Army of the Indus....1838-39، لنڈن ۱۸۴۱ء؛ Griffin (۲۷۲): The Rajas of the Panjab....، ۱۸۷۳ء؛ Massey و Griffin (۲۷۳): Chiefs and families of note in the Panjab، ۳ جلد، لاہور ۱۹۰۹ء؛ Pottinger (۲۷۴): Travels in Belou- chistan and Scinde، لنڈن ۱۸۱۶ء؛ Philip K. Hitti (۲۷۵): The Caliphate، لنڈن ۱۹۳۷ء؛ Muir (۲۷۶): History of the Arabs، لنڈن ۱۹۲۴ء؛ Gibb (۲۷۷): Chinese Records of the Arabs in Central Asia، در BSOAS، ۲ (۱۹۲۳ء): ۶۱۳-۶۲۳؛ Marquart (۲۷۸): A Literary History of Irānṣehir، برلن ۱۹۰۱ء؛ Brown (۲۷۹): A History of Persia، کیمبرج ۱۹۰۲-۱۹۲۰ء؛ (۲۸۰) وہی مصنّف: Persian Literature in Modern Times، کیمبرج ۱۹۲۴ء؛ (۲۸۱) The Statesman's History of India، لنڈن ۱۸۵۴ء؛ (۲۸۲) Erskine: World Muslim Gazetteer، Year-Book، ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء؛ (۲۸۳) A Glossary of Tribes and Castes of the Punjab and the N.-W. Frontier Provinces، لاہور ۱۹۱۱-۱۹۱۹ء؛ H. A. Ross (۲۸۴): مرتبہ مؤتمر العالم الاسلامی، کراچی ۱۹۶۴ء؛ (۲۸۵) H. C. Willy: From the Black Mountain to Waziristan، لنڈن ۱۹۱۲ء (پٹھانوں کے سرحدی قبائل کے بارے میں)؛ W. Gieger (۲۸۶): Sprache der Afghãnen، در Grundriss der iran. Philologie، ۱/۲ (مع فہرست کتب مآخذ)؛ H. G. Raverty (۲۸۷): Dictionary، ۱۸۶۷ء؛ (۲۸۸) وہی مصنّف: Selections from the Poetry of the Afghans، لنڈن ۱۸۶۴ء؛ (۲۸۹) H. W. Bellew: Grammar، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۲۹۰) وہی مصنّف: Dictionary، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۲۹۱) J. Darmesteter: Chants populaires des Afghans، پیرس ۱۸۸۸-۱۸۹۰ء؛ (۲۹۲) J. G. Lorimer: Grammar and Voc. of Waziri Pashto، کلکتہ ۱۹۰۲ء؛ (۲۹۳) D. L. R. Lorimer: Syntax of Colloquial Pashtu، اوکسفرڈ ۱۹۱۵ء؛ Maylon (۲۹۴): Some Current Pushtu Folk Stories، کلکتہ ۱۹۰۲ء؛ (۲۹۵) Gilbertson: The Pakhto Idiom, A Dictionary، لنڈن ۱۹۳۲ء؛ (۲۹۶) Cox: Notes on Pushtu Gram- mar، لنڈن ۱۹۱۱ء؛ (۲۹۷) G. Morgenstierne: Etymological Voc. of Pashto، اوسلو ۱۹۲۷ء؛ (۲۹۸) وہی مصنّف: Archaisms and Inno- vations in Pashto Morphology، در NTS، ج ۱۲؛ (۲۹۹) وہی مصنّف: The Wanetsi Dialect، در مجلۂ مذکور، ج ۴؛ W. Lentz (۳۰۰): Sammlungen zur afghanischen Literatur-und Zeitges- chichte، در ZDMG، ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۷ ببعد؛ (۳۰۱) وہی مصنّف: Die Pašto Bewegung، در ZDMG، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۷ ببعد؛ (۳۰۲) H. Penzl: On

the Cases of the Afghan Noun, Word، ج۶؛(۳۰۳) وہی مصنّف: Afghan Descriptions of the Afghan Verb، در JAOS، ۱۹۵۱ء؛ (۳۰۴) وہی مصنّف: Die Substantiva nach. Afgh. Gramma-tikern، در ZDMG، ۱۹۵۲ء، مع فہرست کتب مآخذ؛(۳۰۵) Elliot و Dowson: History of India، ج۱-۵؛(۳۰۶) Mc Crindle: Ancient India, Ivasions of Alexander، لنڈن ۱۸۹۶ء؛(۳۰۷) وہی مصنّف: Ptolemy's Geography، بمبئی ۱۸۸۶ء؛(۳۰۸) Cunningham: Successors of Alexander، لنڈن ۱۸۸۴ء؛(۳۰۹) Gardner: Greek and Scythian Kings، در مقدمۂ فہرستِ کتبِ موزۂ بریطانیہ، ۱۸۸۶ء؛(۳۱۰) V. A. Smith: Early History of India، اوکسفرڈ ۱۹۰۴ء؛(۳۱۱) وہی مصنّف: Cat. of Coins in Indian Museums، اوکسفرڈ ۱۹۰۶ء؛(۳۱۲) Fleet: Chro-nology of Kushãns، در JRAS، ۱۹۰۳ء، ص ۳۲۵ و ۱۹۰۴ء، ص ۷۰۳ و ۱۹۰۵ء، ص ۲۲۳، ۳۵۷ و ۱۹۰۷ء، ص ۱۰۱۳؛(۳۱۳) Stein: Kalhana's Rajata-rangini، ویسٹ منسٹر ۱۹۰۰ء، ص ۳۳۶؛(۳۱۴) وہی مصنّف: Afghanistan in Avestic Geogr.، در Ind. Antiquary، بمبئی ج ۱۵؛(۳۱۵) وہی مصنّف: Zorastrian deities on Indo-Scythian coins، در مجلۂ مذکور، ج ۱۷؛(۳۱۶) وہی مصنّف: White Huns and kindred tribes، در مجلۂ مذکور، ج ۳۹؛(۳۱۷) Wilson: Ariana antiqua، لنڈن ۱۸۴۲ء؛(۳۱۸) E. Thomas: Chronicles of the Pathān Kings of Delhi، لنڈن ۱۸۷۱ء؛(۳۱۹) Shahāmat 'Ali: Sikhs and Afghans، لنڈن ۱۸۴۶ء؛ (۳۲۰) Howorth: Hist. of the Mongols، لنڈن ۱۸۸۸ء؛(۳۲۱) Hanway: Travels، لنڈن ۱۷۶۲ء؛(۳۲۲) Irvine: The Bangash Nawābs of Farukhābād، در JASB، ۱۸۷۸-۱۸۷۹ء؛(۳۲۳) Huchinson: The Tirah Campaign، لنڈن ۱۸۹۸ء.

(آ آ، لائڈن، طبع اوّل وثانی [وعبدالحی حبیبی وادارہ])

---

* **الافغانی، جمال الدین:** رک بہ جمال الدین افغانی.

---

* **الأفلاج:** (أفلاج الدَّوَاسِر)، جنوبی نجد کا ایک ضلع، جو طُوَیق کی عظیم ڈھلان (cuesta) کے آر پار واقع اور تخمیناً شمال میں وادی بِرک، مشرق میں البَیاض کے میدان، جنوب میں وادی المَقْرَن اور مغرب میں الدَّحی کے ریگ زار سے محدود ہے۔ اس ضلع کا آباد ترین نخلستان اور صدر مقام لَیْلٰی ہے (°۴۶، ′۴۴، ″۳۵ طول بلد مشرقی، °۲۲، ′۱۶، ″۴۵ عرض بلد شمالی).

الأفلاج میں کئی قابلِ دید تالاب ہیں، جن میں چشموں سے پانی آتا ہے اور جو عُیون السَّیح کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ نہروں کے ایک وسیع نظام کے باقی ماندہ آثار بھی ہیں، جو کسی وقت ایک زیادہ خوش حال خطّے کو سیراب کرتی تھیں۔ تالاب، جن میں سب سے بڑا تقریباً ایک کیلومیٹر لمبا ہے، جزیرہ نماے عرب کے اندر اپنی قسم کی مخصوص چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ اس ضلع کا نام، جو قدیم ایّام میں اَلْفَلَج بھی کہلاتا تھا، فلج (جمع: افلاج) سے ماخوذ ہے [قب ''ویسمّی لانفلاجه بالماء''— الہمدانی، ۱: ۱۵۹] اور یہ اصطلاح عمان میں اب بھی ایسی کاریز (= زیر زمین نالی) کے معنی میں استعمال ہوتی ہے جس میں سطح زمین پر سوراخ ہوں تاکہ اسے آسانی سے صاف کیا جاسکے، اگرچہ یہ عجیب بات ہے کہ الأفلاج میں اب اس قسم کی کاریز کو، جو ممکن ہے ایرانی الاصل ہو، ساقی (تلفّظ: ساجی، جمع: سواجی) کہا جاتا ہے۔ سَمْحان، بَرابِرْ اور الوَجّاج کی کاریزیں اور تین چھوٹی آبی گزرگاہیں، جو سب کی سب السَّیح کے نخلستان کو سیراب کرتی ہیں، تا حال رواں ہیں، اگرچہ ان کی دیکھ بھال اچھی طرح سے نہیں کی جاتی.

الأفلاج کے منتہاے شمال کا گاؤں اُسَیْلِلَہ ہے۔ لَیْلٰی موجودہ دارالامارہ غَصِیْبہ، سابق دارالامارۃ المُبَرَّز اور الجُفَیْدِرِیّہ کی بستیوں پر مشتمل ہے۔ زیادہ جنوب میں العَمار (اسے آل عمّار سے ملتبس نہ کیا جائے جو دَوَاسِر کا ایک حصّہ ہے)، السَّیح (جہاں سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر کاشت کی جاتی ہے)، الخَرْفَہ اور الرَّوضہ کے نخلستان ہیں۔ تالاب السَّیح کے جنوب مشرق میں واقع ہیں۔ ان کے جنوب میں سُوَیْدان، الرَّقَیْقِیّہ، الغَوْطہ اور مَروان کے چھوٹے چھوٹے نخلستان ہیں۔ منتہاے جنوب کے نخلستان البدیع وادی حشرج میں، جو الہَدّار سے نیچے کو اترتی ہے، اور الشُّطْبہ ہیں، جو وادی المَقْرن کے بالائی طاس میں واقع ہے۔ طُوَیق کے پہاڑی علاقے میں السّتارہ (الہمدانی میں: الصِّدارہ)، الحُراضَہ اور الغَیْل ہیں، جو سب قدیم مقامات ہیں۔ طُوَیق کی مغربی ڈھلان کے ساتھ شمال کی طرف الحَمَر (الأحْمَر) اور جنوب کی جانب الہَدّار ہیں.

ظہورِ اسلام کے وقت الأفلاج کا سرکردہ قبیلہ جَعْدہ [رک بآن] تھا، جس کا مورثِ اعلیٰ کعب کے دو بیٹوں قُشَیْر اور الحَشِیْر کا بھائی تھا اور کعب خود شمالی عرب کے عامر بن صَعْصَعہ کی نسل سے تھا۔ قبیلۂ جعدہ نے ۹ھ/ ۶۳۰-۶۳۱ء میں دین اسلام قبول کیا اور ایک وفد مدینے بھیجا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس علاقے میں قبیلۂ مذکور کی حیثیت کی تصدیق کردی (Caetani: *Annali*، ۲: ۱، ۲۹۷).

۱۲۶ھ/ ۷۴۴ء میں جعدہ اور ان کے خلفا بنو عامر نے یوم الفلج الاوّل (فلج کی پہلی جنگ) میں بنو حنیفہ کے ایک والی کو، جو ان پر مامور تھا، قتل کردیا۔ بنو حنیفہ نے یوم الفلج الثانی (فلج کی دوسری جنگ) میں بنو عامر کو شکست دی اور جنگ نِشاش ۱۲۶ھ [/ ۷۴۴ء] میں ان کی قوت توڑ کر رکھ دی (Caetani: *Chrono-graphia*، ۵: ۱۶۰۱).

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے تین سو سال بعد تک بھی جعدہ بدستور الأفلاج میں مقدم ترین قبیلہ تھے، اور ان کے بعد قُشَیْر اور الحَشِیْر کا مقام تھا۔ (الہمدانی، ۱: ۱۵۹)۔ جعدہ کا بڑا مرکز سُوق الفَلْج کا شہر تھا، اس کے پھاٹک لوہے کے تھے اور فصیل، جو تیس ہاتھ چوڑی تھی، جس رقبے کو احاطہ کیے ہوے تھی کہا جاتا ہے کہ اس میں شیریں پانی کے دو سو ساٹھ کنویں تھے۔ جعدہ کے علاقے میں قصر العَدِی بھی شامِل تھا، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ طَسْم اور جَدِیس کے

زمانے کا بنا ہوا ہے۔ شاید وہ کھنڈر، جو السِّیح کے جنوب میں اب قُصَیرات عاد کے نام سے معروف ہیں، اسی قصر کے ہیں۔ قُشَیْر شہر البُہَیْصَمِیَّہ پر قابض تھے، جس کی فصیل اتنی چوڑی تھی کہ اس کے اوپر چار گھوڑے پہلو بہ پہلو دوڑائے جاسکتے تھے۔ جن قصبوں میں الحُشَیْر آباد تھے ان میں الہَدّ ار بھی شامل تھا؛ لیکن اس قبیلے کے بہت سے افراد اس وقت تک یمن جا چکے تھے۔

۱۰۵۱ھ/۱۶۴۳ء میں ناصر خسرو نے الأفلاج کو داخلی جھگڑوں کے باعث عملاً تباہی کی حالت میں پایا، جن کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ لوگ نماز پڑھتے وقت بھی ڈھالوں اور تلواروں سے مسلّح رہتے تھے۔ اس درمیانی دور میں قبیلۂ جُمَیلہ نے، جسے عَنَزَہ کی ایک شاخ بتایا جاتا ہے، سرکردہ حیثیت اختیار کرلی۔ کُوَیت اور الخَرَیْن کے موجودہ حکمران خاندان آل صَبَاح اور آل خَلِیفَہ، اپنا نسب جُمَیلَہ سے ملاتے ہیں۔ کوئی دو سو سال ہوئے یہ لوگ جنوب کے دَوَاسِر [رک بآن] کا دباؤ پڑنے پر الہَدّار سے نقل مکان کرکے چلے آئے تھے۔ بالآخر دَوَاسِر نے جُمَیلہ کو پورے ضلع سے نکال باہر کیا اور خود ان کی جگہ لے لی۔

۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں الأفلاج کے باشندوں نے اپنے ان اقربا کے تتبع میں جو وادی الدَّوَاسِر میں رہتے تھے وہّابی مسلک اختیار کرلیا اور اسی دن سے وہ اس مسلک کے پکے حامی و مددگار چلے آرہے ہیں، اگرچہ اس ضلع نے عصرِ حاضر کی تاریخ میں بالکل معمولی کردار ادا کیا۔ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں عبدالعزیز آل سَعُود نے الفَرَع کے قبیلۂ ہَزازِنَہ کے باغی رہنماؤں کو لیلیٰ میں گھیر لیا اور قتل کرادیا۔ یہ ضلع اب ایک امیر کے ماتحت ہے، جو الرّیاض کی حکومت العربیہ السعودیہ کے سامنے جواب دہ ہے۔

دَوَاسِر کے علاوہ سُبَیْع، سُہُول، اور فُضُول قبیلوں کے تھوڑے سے لوگ بھی الأفلاج میں بود و باش رکھتے ہیں۔ الہدّار میں جُمَیلہ کے کچھ بچے کھچے گھرانے آباد ہیں۔ اَشراف السِّیح کی آبادی کا اہم حصّہ ہیں۔ شہروں میں اکثر حبشی خون بھی نظر آتا ہے اور بنو خَضِیر [رک بآن] کے بہت سے لوگ بھی یہاں آباد ہیں، جو بالعموم کاشت کار (کدّاد، جمع: کوادید) ہیں۔

الأفلاج کی کھجوریں مشہور ہیں۔ الہمدانی اور فلبی (Philby) دونوں نے صُفْرِی کھجور کا ذکر کیا ہے (الہمدانی نے اسے سیّد التمور [بہترین کھجور] لکھا ہے، اگرچہ عصرِ حاضر کے لوگ بِرِی کھجور کو سید التمور سمجھتے ہیں) اور ناصر خسرو نے الأفلاج کی کھجوروں کو بصرے کی کھجوروں سے بہتر قرار دیا ہے۔

مآخذ: (۱) الہمدانی: اشاریہ، بذیلِ مادّۂ الفلج؛ (۲) ناصر خسرو: سفر نامہ (طبع شیفر Schefer)، ص ۸۰-۸۱، ترجمہ، ص ۲۲۰-۲۲۲؛ (۳) لوریمر (J.G.Lorimer): *Gazetteer of the Persian Gulf, Oman and Central Arabia*، کلکتہ ۱۹۰۸-۱۹۱۵ء؛ (۴) فِلبی (H.st.-J. B. Philby): *The Heart of Arabia*؛ (۵) وہی مصنّف: *Two Notes from Central Arabia*، (مع نقشۂ الأفلاج)، ۱۹۴۹ء، ص ۸۶-۹۳؛ (۶) ابن بُلَیْہِد: صحیح الاخبار۔

(W. E. MULLIGAN و G. RENTZ)

افلاطون: Plato کا معرّب، مشہور یونانی فلسفی، جسے ارسطو کے ساتھ ✱ مؤخّر یونانی فلسفے کا امام مانا جاتا ہے۔ (الف) تصانیف و تعلیم؛ (ب) سوانح حیات؛ (ج) اقوال۔

(الف) مشرقی بحیرۂ روم کے جو علاقے سلطنت رومہ کے اجزا تھے اور ان میں یونانی تہذیب و علوم کا رواج تھا، وہاں افلاطون کی تصنیف کردہ کتابیں، نیز وہ کتابیں جو غلطی سے اس کے ساتھ منسوب ہوگئی تھیں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں۔ یہی خطے عربوں کے ہاتھوں تسخیر سے پیشتر کی صدیوں میں افلاطون سے عرب مصنّفین کے لیے تعارف کا بھلا برا ذریعہ تھے۔ بیشتر عرب مفکرین افلاطون کو حکمتِ یونان کا بڑا نمائندہ نہیں مانتے تھے، جیسا کہ مثلاً سینٹ اگسٹائن (St. Augustine) کی رائے تھی (*Civ. Dei.*، ۸: ۴، ۱۲)، بلکہ اسے ارسطو سے فروتر سمجھتے تھے؛ تاہم وہ مثلاً فرفوریوس (Porphyry)، آمونیوس (Ammonious) اور سمپلیکیوس (Simplicius) کی طرح ان دو نامور فلسفیوں کی یکسانی مقصد اور بنیادی ہم آہنگی سے آگاہ تھے۔

جس طرح [فلسفۂ] ارسطو کی بعض ایسی شرحیں جو نو افلاطونی دبستانوں کے باہر لکھی گئیں عربی ترجموں، اور جزءاً محض عربی ترجموں ہی میں محفوظ رہیں، مثلاً اسکندر الافرودیسی (Alexander of Aphrodisias) اور تھمسٹیوس (Themistius) وغیرہ کی بعض تصانیف، اسی طرح افلاطون کی وہ شرحیں بھی جو نوفلاطونیت کے رنگ سے مبرّا تھیں، عرب فلسفیوں کے ہاتھ لگ گئیں اور انھوں نے اس کا مطالعہ کیا۔ جالینوس (Galen) [رک بآن] کی کتاب πλατῶνι χψν διαλόγων σύνοψις آٹھ جلدوں میں تھی، اس کی یونانی اصل کھو گئی تھی (لیکن اس کے کچھ حصّے تک حُنَیْن ابن اسحٰق (ما تُرجمہ مِن کتب جالینوس (Bergstrsäser، عدد ۱۲۴) اور اس کے دبستان کی رسائی ہوگئی تھی)۔ اب اس کا پتا چل گیا ہے اور حال ہی میں اسے طبع کر دیا گیا ہے، یعنی پوری طیماوس (*Timaeus*) [کتاب الطبیعۃ] کا خلاصہ، جس میں بہت سی عبارتوں کی لفظ بلفظ نقل بھی موجود ہے؛ الجمہوریۃ (*Republic*) کا کچھ حصّہ شارح (یعنی جالینوس) کے الفاظ میں لکھا ہوا؛ نوامیس (*Laws*) کی تلخیص کا ایک ٹکڑا اور پارمنیڈیز کی تلخیص کا، جو اس نے کی تھی ایک حوالہ (P. Kraus و R. Walzer: *Plato Arabus*، ج ۱، ۱۹۵۱ء)۔ جالینوس کی طیماوس (*Timaeus*) کی طبّی شرح (حُنین، عدد ۱۲۲) کے کچھ ٹکڑے عرب کے طبّی مصنّفین سے حاصل کیے گئے ہیں (H. O. Schröder و P. Kahle: *Corpus Medicorum Graecorum Supplementum*، ج ۱، ۱۹۴۳ء)۔

افلاطون کے بہت سے اقتباسات اور اس کے تذکرے اسلامی دنیا میں جالینوس کی دیگر تصانیف کے ترجموں کی وساطت سے پہنچے۔ جیسا کہ ارسطو کے معاملے میں ہوا تھا، متأخّر فلاسفۂ یونان نے کوشش کی کہ افلاطون کے مکالمے منظم ترتیب سے جمع کیے جائیں۔ ایک اَور تصنیف کا علم، (جو نوفلاطونیت کے اثر سے

بالکل آزاد، لیکن افکارِ افلاطون کے سیاسی پہلوؤں سے پورے طور پر باخبر ہے) ہمیں محض اس طرح ہوا کہ الفارابی نے اس سے کام لیا اور جزئی طور پر نقل بھی کر دیا (F. Rosenthal وR. Walzer: *Plato Arabus*، ج ۲، ۱۹۴۳ء)۔ اُس یونانی رسالے کا مصنّف نامعلوم ہے، جس نے مکالموں کی اس ترتیب میں ان کی تاریخِ تصنیف کی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھنا چاہا تھا۔ اسی نوع کے ماخذ سے الجمہوریۃ (*Republic*) کی ایک شرح بھی الفارابی نے بڑے پیمانے پر استعمال کی؛ ابن رشد کی شرح کا بڑا حصّہ یہی ہے، جو عبرانی ترجمے میں موجود ہے اور سولھویں صدی کے ایک لاطینی ترجمے میں بھی ہے (اسے E. G. Rosenthal طبع کر رہا ہے)۔ افلاطون کی کتاب نوامیس (*Laws*) کی ایسی ہی ایک تلخیص الفارابی نے اس کتاب کی اپنی تلخیص میں استعمال کی ہے (F.Gabrieli: *Plato Arabus*، ج ۳، ۱۹۵۲ء)۔ الرّازی نے طیماوس (*Timaeus*) کی پلوٹارک (Plutarch) کی شرح پر حاشیہ تحریر کیا (S. Pines: *Atomenlehre*، ص ۹۰) اور یحییٰ بن عدی نے پلوٹارک کی کتاب نقل کر دی (الفہرست، ص ۲۴۶)۔

تاہم عرب حکما عموماً افلاطون کو اس کے نوفلاطونی شارحین ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے فلوطینس (Plotinus) (قب الشیخ الیونانی)، فرفوریوس (Porphyry) [رک بآن] اور بروقلس (Proclus) [رک بآن] وغیرہم۔ بروقلس نے طیماوس (*Timaeus*) کی جو شرح کی تھی اس کے ایک ٹکڑے (E. Pfaff: ۸۹E تا ۹۰C: *Corpus Medicorum Graecorum. Supplementum*، ۳: ۴۲، ۱۹۴۱ء) کا ترجمہ حُنین بن اسحٰق نے کیا تھا۔ اس کے مقدّمے (نیز قب ماترجمہ، عدد ۴۵) میں وہ لکھتا ہے: ''جالینوس بقراط کا معیاری ترجمان ہے اور جو شخص افلاطون کے مطالب کی شرح کرنے کا سب سے زیادہ حق دار ہے وہ فاضلِ شہیر بروقلس ہے''۔ بروقلس نے افلاطون کی جو ترجمانی کی ہے اس کی ایک سبق آموز مثال مِسکَویہ کی الفوز الاصغر کے اس باب میں پائی جاتی ہے جو روح کی ابدیّت سے متعلّق ہے (روزنتھال F. Rosenthal، ص ۳۹۹ ببعد)۔ یہ غالباً بروقلس کی کتاب *On the immortality of the soul according to Plato* پر مبنی ہے۔ یہ تین حصّوں میں ہے اور اس سے عرب واقف تھے (الفہرست: ص ۲۵۲)۔ اسی قسم کی ایک روایت کی پیروی الکِندی نے بھی کی ہے، جس کے ہاں افلاطونی عنصر بہت قوی ہے (قب الرسائل، طبع ابوریدہ، عدد ۱۰-۱۳) — نہ صرف علم النّفس میں بلکہ اس کے فلسفہ الواحد (One) کی تشریح میں بھی، جس میں وہ مسلّمہ نوفلاطونی مابعد الطبیعیات کا شدّت سے پیرو ہے اور اسی طرح اسی کے فلسفۂ اخلاقیات میں۔ وہ افلاطون جس کا حوالہ الفارابی (اس کے نظریۂ ''حکومتِ مثالیہ'' کو مستثنیٰ کر کے)، ابن سینا، ابن باجّہ اور ابن رشد صراحۃً یا معنًا دیتے ہیں ہمیشہ فلوطینس اور اس کے متّبعین کا افلاطون ہوتا ہے۔ یحییٰ بن عَدِی کے کتب خانے میں اولیمپیوڈورس (Olympiodorus) (چھٹی صدی عیسوی) کی السوفسطائی *Spohist* (جس کی یونانی اصل گم ہو چکی ہے) کی شرح حنین بن اسحٰق کے ترجمے کی شکل میں موجود تھی (الفہرست، ص ۲۵۶)۔ افلاطون کے فلسفۂ مابعد الطبیعیات، فلسفۂ کائنات اور علم النّفس کا ایک دلچسپ بیان، جو کسی نامعلوم مگر قیمتی نوفلاطونی ماخذ سے لیا گیا ہے، الشہرستانی، ص ۲۸۳ ببعد، میں موجود ہے (جرمن ترجمہ از Haarbrücker، ۲: ۱۱۷)۔ چونکہ مجموعی طور پر نوفلاطونیت افلاطونی مسلک کی تجدید کی مدّعی ہے، اس لیے یہاں بعض بااثر نوفلاطونی تصانیف کا بھی ذکر کر دینا مناسب ہے اور وہ حسبِ ذیل ہیں: *Theology of Aristotle*، جس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ارسطو بڑھاپے میں افلاطون کا پیرو ہو گیا تھا؛ *Liber de causis*، جو بروقلس (Proclus) کی *Elements of Theology* پر مبنی ہے؛ وہ نیا فلوطینی متن جسے P. Kraus نے دریافت کیا ہے (قب آخذ) اور وہ عربی فلوطینی ماخذ جس سے روزنتھال (F. Rosenthal) نے بحث کی ہے (قب مادّۂ ''ارسطوطالیس''، ''الشیخ الیونانی'')۔

السہروردی المقتول [رک بآن] اور اِشراقیّون [رک بآن] سے ایک نئے ارتقا کا آغاز ہوتا ہے، جو الفارابی اور ابن سینا پر نکتہ چینی کرتے ہوئے افلاطونیت یا زیادہ صحیح طور پر، نوفلاطونیت کے باطنی یا روحانی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور ''صوفی'' افلاطون کو فلسفے کا اصل امام قرار دیتے ہیں۔ اس وقت سے صوفیہ افلاطون کے اصلی پیرو بن جاتے ہیں (قب مثلاً السہروردی: *Opera Metaphsica et Mystica* (طبع Corbin)، ۱: viii، xxxiii ببعد)۔ ایک نامعلوم مصنّف کی کتاب *On the Platonic Ideas* (طبع بدوی A. Badawi، قاہرہ ۱۹۴۷ء)، جو غالباً چودھویں صدی میں لکھی گئی (Corbin: کتاب مذکور، ص ۴، حاشیہ ۷۹) افلاطون کے خیالات کی اس عجیب تعبیر و تفسیر پر مبنی ہے جو السہروردی نے کی تھی۔

افلاطونیت کی ایک اَور مخصوص روایت کی نمائندگی محمد بن زکریا الرّازی [رک بآن] نے کی ہے اور وہ بھی افلاطون کو اپنا سب سے بڑا مقتدا مان کر اس کی پیروی کا دعوٰی کرتا ہے۔ اس کے افلاطونیت آموز علم الاخلاق (قب الطب الروحانی) کا تعلق جالینوس کے مطالعے سے ہو سکتا ہے اور ابدیتِ عالم سے اس کا انکار طیماوس (*Timaeus*) کی ان تشریحات کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جو پلوٹارک اور جالینوس نے پیش کی ہیں؛ مگر اس کے پانچ ابدی اصول نوفیثاغورثی مصادر سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ وہ انھیں افلاطونی خیال کرتا ہے۔ مادّے کی جوہری (atomic) ساخت کا جو نظریہ اس نے پیش کیا ہے، ممکن ہے وہ افلاطون کے درس ''دربارۂ خیر'' (*On the Good*) پر مبنی ہو، لیکن یقیناً یہ افلاطون کے فلسفۂ مابعد الطبیعیات کی اس تفسیر میں موجود ہے جو نوفیثاغورثی دبستان نے پیش کی ہے (Sextus Empiricus: *Adversus Physicos*، ۲: ۲۴۹ ببعد)۔

عرب سوانح نگاران تمام مکالمات کے عنوان تو دے دیتے ہیں جو افلاطون کی یونانی تصانیف کے مجموعے (Greek Corpus Platonicum) میں پائے جاتے ہیں، لیکن عربی ترجموں کے متعلق بہت کم معلومات مہیا کرتے ہیں۔ وہ الجمہوریۃ (*Republic*) کی ایک شرح (جس کا ترجمہ حُنین بن اسحٰق نے کیا)، نیز یحییٰ

بن البِطریق، حُنین بن اسحٰق اور یحییٰ بن عَدِی کے کیے ہوے تراجم طیماوس (*Timaeus*) کا ذکر کرتے ہیں (حُنَین نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس کا نام ہے: *That which aught to be read before Plato's works* = وہ جسے افلاطون کی تصانیف سے پہلے پڑھنا واجب ہے)۔ ابن الندیم نے *Crito* کے ایک نسخے کا بھی ذکر کیا ہے، جو یحییٰ بن عَدِی نے اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ بروقلس (Proclus) کی شرح *Phaedo* (جس کی یونانی اصل مفقود ہے) کے کچھ حصّے کا ترجمہ ابن زُرعہ نے سریانی سے کیا۔

ان ترجموں کے یا کسی افلاطونی مکالمے کے دوسرے عربی ترجموں کے مخطوطات کا کوئی سراغ اس وقت تک بالکل نہیں مل سکا۔ الجمہوریۃ (*Republic*) کی عبارت کا لفظ بہ لفظ اقتباس (علاوہ ان کم وبیش لفظ بہ لفظ حوالہ جات کے جو ابن رشد کے توضیحی ترجمے یا اس کتاب کے مضامین کے متعلّق دوسرے عرب فلسفیوں کے حوالوں میں آ گئے ہیں) ملتا ہے، مثلاً رسائل اخوان الصفا، قاہرہ ۱۳۴۷ھ، ۴: ۱۳۴ میں حکایت متعلقہ *Gyges*، در *Rep.*، ۲: ۳۵۹ ببعد؛ قب Rosenthal، ص ۳۹۷)، الکندی نے افلاطونی عدد پر ایک رسالہ لکھا (*Rep.*، ج ۸، الفہرست، ص ۲۵۶)۔ اس میں طیماوس (*Timaeus*) کی عبارتوں کے اقتباسات اکثر پائے جاتے ہیں، لیکن یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا وہ براہ راست افلاطون سے لیے گئے ہیں یا کسی واسطے سے استفادہ کیا گیا۔ البیرونی کی کتاب الھند میں نوامیس (*Laws*) کے جو اقتباسات ملتے ہیں ان کے لیے قب F. Rosenthal، ص ۳۵۹ ببعد و F. Gabrieli: *Plato Arabus*، ۳: xii، حاشیہ ۲۔ اس کتاب میں *Phaedo* کے بھی بہت سے اقتباسات ہیں۔ سقراط کی موت سے متعلّق آخری فصل بھی ملتی ہے، مثلاً ابن القِفطی، ص ۲۰۰-۲۰۶ و ابن ابی اُصَیبِعہ: ۱: ۴۵ میں۔ مکالمے کا ایک فارسی ترجمہ بروسہ میں موجود ہے (*Bell.*، ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۴)۔ آلکیبیادی (Alcibiades) تقریر، جو *Banquet* سے لی گئی ہے، F. Rosenthal نے ڈھونڈ کر استانبول، کوپرولو، شمارہ ۸-۱۶، ورق ۲۱۶ میں نکالی ہے۔ لگاتار جستجو سے بلاشبہہ افلاطونی مکالمات کے مزید اقتباسات عربی کی فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ تصانیف میں مل سکیں گے۔

افلاطون سے منسوب فلسفیانہ تصانیف میں مندرجہ ذیل کا ذکر کیا جا سکتا ہے: نوفیثاغورثی رسالہ *Plato's Exhortation of Young men*، جو غالباً یونانی الاصل ہے (F. Rosenthal، در *Orientalia*، ۱۰: ۳۸۳-۳۹۵)؛ (۲) افلاطون کا ایک خط فرفوریوس (Porphyry) کے نام، جس کا موضوع رفع حزن ہے اور جس پر الکندی کا ایک رسالہ مؤاساۃ و تعزیت مبنی ہے (*Mash*، ۱۹۲۲ء، ص ۸۸۴-۸۸۹، نیز دیکھیے R. Walzer و H. Ritter: *Memorie Ac. die Lincei*، ۱۹۴۰ء، ص ۳۸۸، حاشیہ ۲) اور (۳) افلاطون کی وصیّت بنام ارسطو۔

لیکن عرب صرف افلاطون کے فلسفیانہ خیالات کی ان مختلف تعبیرات ہی سے واقف نہیں تھے جن سے یونانی فلسفے کا ہر طالب علم آشنا ہے، بلکہ اس افلاطون سے بھی آگاہ تھے جسے توہّمات سے وابستہ کر دیا گیا تھا اور یہ توہّمات نوفلاطونیت کے اکثر دبستانوں کی تعلیمات کا جزو لاینفک بن گئے تھے، یعنی سحر، نجوم اور کیمیا (اولیمپیوڈورس (Olympiodorus) اور دیگر متأخّر نوفلاطونی کیمیا میں بھی دخل رکھتے تھے اور انھوں نے افلاطون کو اپنا مربّی قرار دیا تھا)۔ عرب ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے؛ چنانچہ انھوں نے افلاطون کو کیمیا کی کتابوں کا مصنّف بھی بنا دیا۔ جابر (بن حیّان) نے ایک مصحّحات افلاطون کا اقتباس دیا ہے، جس میں وہ اپنے شاگرد طیماوس (Timaeus) کو اسرارِ کیمیا سے آگاہ کرتا ہے؛ مگر جابر نے طیماوس کی جو عبارتیں نقل کی ہیں ان کا افلاطون کے اصل مکالمے سے کوئی تعلق نہیں (P. Kraus: *Jabir et la science grecque*، ص ۴۸ ببعد)۔ اسی نوع کی ایک اَور تصنیف، جو کیمیا اور فلسفے سے متعلّق ہے اور افلاطون کی طرف منسوب کی گئی ہے، روابع افلاطون ہے، جو مغرب میں *Liber Quarto-torum* کے نام سے مشہور ہے اور دو عربی مخطوطوں میں محفوظ ہے۔ اس میں احمد بن الحسین بن جہار بُختار اور حرّان کے مشہور ماہرِ ریاضی ثابت بن قرّہ کے مابین ایک مکالمہ درج ہے (P. Kraus: کتاب مذکور، ص ۵۱، ۳۳۹)۔ کیمیا کے ایک اَور رسالے *Liber Platonis de XIII clavibus* کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۳۰۱ء میں اس کا ترجمہ عربی سے لاطینی میں کیا گیا تھا (L. Thorndike: *A History of Magic*، ۳: ۵۷)، نیز قب Kraus: کتاب مذکور، ص ۵۱، حاشیہ ۹۔

سحر سے متعلق ان رسائل میں جو افلاطون کی طرف منسوب ہیں، النّوامیس قابلِ ذکر معلوم ہوتا ہے، جس میں مصنوعی تناسُل سے بحث کی گئی ہے، (P. Kraus، کتاب مذکور، ص ۱۰۴، حاشیہ ۱۲) اور اسی طرح السّر الخفی بھی (وہی کتاب، ص ۵۲)۔

(ب) ''افلاطون کی عربی سوانح عمریاں'' اس مواد میں کوئی قابل وقعت اضافہ نہیں کرتیں جو اس یونانی روایت میں موجود ہے جس کی نمائندگی دیوجانس لائرٹیس (Diogenes Laertius)، کتاب سوم، اولیمپیوڈورس (Olympiodorus) اور ایک مجہول الاسم نوفلاطونی مصنّف کی کتاب *Prolegomena to the Platonic Philosophy* سے ہوتی ہے (قب H. Breitenbach، F. Buddenhagen، A. Debrunner، F. von der Muehll: *Diogenes Laertius*، ج ۳، ۱۹۰۷ء؛ J. Kirchner: *Prosopographia Attica*، عدد ۱۱۸۵۵)، تاہم انھیں یونانی متونِ معلومہ سے براہِ راست کوئی تعلّق نہیں۔ عربی روایت کے ایک حصّے کا تعلّق سمرنا کے تھیو (Theo) (دوسری صدی عیسوی) کی ایک تعارفی کتاب سے ہو سکتا ہے، جس کا ذکر الفہرست، ص ۲۴۵، میں موجود ہے اور جس سے ابن القِفطی (ص ۱۷-۱۹) نے ایک طویل اقتباس دیا ہے، (قب J. Lippert: *Studien auf dem Gebiete der griechischarabischen Übersetzungslitterature*، جلد ۱،

Braunnschweigh ۱۸۹۸ء، ص ۳۹ ببعد)۔ الفہرست میں (جعلی) پلوٹارک (Plutarch) کا بھی ذکر ہے، دیکھیے H. Diels: *Doxographie Graeci*، ص ۲۸۷۔ العامری نے، جو چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کا فلسفی ہے (منقول در ابوسلیمان المنطقی: تلخیص صِوان الحکمۃ، مقدّمہ)، غالباً کسی گم شدہ یونانی روایت کا تتبع کرتے ہوے افلاطون کو حکمت کے پانچ ستونوں میں سے ایک قرار دیا ہے؛ دوسرے چار یہ ہیں: اَنبادُقلیس (Empedocles)، فیثاغورس (Pythagoras)، سقراط (Socrates) اور ارسطوطالیس (Aristotle) [رک بآنہا]۔ [بقول اُس کے] ان فلسفیوں نے اپنی حکمت انبیا سے اخذ کی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ افلاطون نے بڑھاپے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور عبادت میں مشغول ہو گیا۔ اس فلسفی نے Delian مسئلے [مکعب کو دگنا کرنا] کے متعلّق افلاطون کا حل بھی پیش کر دیا ہے (قب پلوٹارک (Plutarch): *De gen. Socr.*، ۷: ۵۷۹؛ وہی مصنّف: *De Ei ap. Delphos*، ۲: ۳۸۶؛ Tannery: *La Géométrié grecque*، ص ۱۱۰؛ القزوینی: آثار البلاد (طبع وُسٹنفِلڈ Wüstenfeld)، ص ۴۵؛ لطفی المکتول: تضعیف المذبح (س۔ یلتقایا، الف۔ عدنان، H. Corbin، پیرس ۱۹۴۰ء)۔ صاعد الاندلسی: طبقات الامم، ص ۲۳، نے اسی پر اعتماد کیا ہے؛ صاعد کی سیرت سے، ایک کم تر درجے کے ماخذ کے طور پر، ابن القفطی نے استفادہ کیا ہے، مواضع کثیرہ۔

مبشّر بن فاتک کی کتاب مختار الحکم میں مندرجہ سیرتِ افلاطون (مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، شمارہ Add ۲۵۸۹۳، ورق ۴۴ ببعد؛ اس تصنیف کے بارے میں قب F. Rosenthal، در *Orientalia*، ۱۹۳۷ء، ص ۲۱ ببعد) ابن ابی اُصَیبِعہ نے نقل کی ہے (۱: ۵۰ ببعد)۔ اس نے افلاطون کے باپ اور ماں دونوں کو اسکلیپیس (Asclepius) کی اولاد بنا دیا ہے۔ غالباً یہ اس قطعے کا مطلب غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے جو *Diog. Laertius*، ۳: ۴۵، میں پایا جاتا ہے (قب E. J. و L. Edelstein: *Asclepius*، بالٹی مور ۱۹۴۵ء، ج ۱، عدد ۲۲۳ و ج ۲، عدد ۱۲۷)۔ عرب سوانح نگاروں میں فقط مبشّر ہی نے مصر میں افلاطون کے فرضی قیام کا تذکرہ کیا ہے۔ [افلاطون کی] شکل و شباہت سے متعلّق حصّے کے لیے قب F. Rosenthal، موضع مذکور، ص ۳۸۔

ابن القفطی نے اپنی طویل اور مفصّل سیرتِ افلاطون (ص ۱۷-۲۷) کی بنیاد الفہرست، نیز سمرنا کے تھیو (Theo) (قب اوپر) اور کسی نامعلوم یونانی ماخذ پر رکھی ہے (ص ۱۹ س ۱۶-ص ۲۵ س ۳)۔ تقریباً ہر بات جو اس میں بیان کی گئی ہے اس کے متوازی یونانی بیانات موجود ہیں۔ وہ حکایات جو ان مباحثوں کی مانند ہیں جن کی نسبت روایت ہے کہ Dionysius کے دربار میں ہوے تھے، Olympiodorus کی *Life* اور Plutarch کی *Dio* میں موجود ہیں۔ صرف چند باتیں ایسی ہیں جن میں التباس ہو گیا ہے، جیسے سسلی میں سقراط کا قیام، افلاطون کی دو خاتون شاگردوں کا تعارف اس کی بیبیوں کی حیثیت سے، اور بروقلس (Proclus) کو اس کے تلامذہ میں شامل کرنا۔ ص ۲۵ س ۴ تا ص ۲۷ س ۱۴ الفارابی سے لی گئی ہیں (قب مجہول الاسم مصنف کی *Proll. Phil. Plat*، عنوان ۷-۱۶)؛ ص ۲۶ س ۱۵ تا ص ۲۷ س ۱۴ صاعد الاندلسی، ص ۱۹، سے منقول ہے۔ نو فلاطونی زبان میں "دعاے افلاطون" بھی قابلِ ذکر ہے (ص ۲۷ س ۱۵-۱۷) (نیز قب مخطوطۂ اوکسفرڈ، Hunt، عدد ۱۶۲، ورق ۲۰۲ راست)۔

الشّہرزُوری نے اپنی نزھۃ الارواح (مخطوطہ) میں افلاطون کی جو سیرت بیان کی ہے وہ مبشّر کی تحریر پر مبنی ہے۔

بعد کی صدیوں میں افلاطون کے مزار کی زیارت قونیہ میں کی جا سکتی تھی (F. W. Hasluck: *Christianity and Islam under the Sultans*، اوکسفرڈ ۱۹۲۹ء، ص ۳۶۳ و مواضع کثیرہ)۔

(ج) اقوالِ افلاطون کے متفرق مجموعوں کا بڑا ماخذ حُنَین بن اسحٰق کی نوادر الفلاسفۃ و الحکماء ہے (قب عبرانی ترجمہ، جسے A. Löwenthal نے ایڈٹ کیا، فرانکفرٹ ۱۸۹۶ء، اور اسی کا ترجمہ جو اس نے جرمن میں کیا، برلن ۱۸۹۶ء، نیز K. Merkle: *Sinnsprüche der Philosophen*، لائپزگ ۱۹۲۱ء)۔ ایک اَور ابتدائی ماخذ ابن ہندو: الکلمۃ الروحانیۃ فی الحکمۃ الیونانیۃ، قاہرہ ۱۳۱۸ھ، ہے۔ ابوسلیمان کی تلخیصِ صوان الحکمۃ میں فقط افلاطون کے اقوال دے دیے گئے ہیں۔ ابن ابی اُصَیبِعہ، ۱: ۵۱ س ۷ تا ۵۳ س ۱۶، میں مبشّر کی فصل متعلّقہ اقوالِ افلاطون کو نقل کر دیا گیا ہے۔ افلاطون کی جانب منسوب اقوال عربی ادب میں اکثر پائے جاتے ہیں۔

مآخذ: (۱) Auiller: *Die griechischen Philosophen in der arabischen Überliefrung*، Halle ۱۸۷۳ء؛ (۲) M. Stein-schneider: *Die arabischen Übersetzungen aus dem Gri-echischen*، در *Central blatt für Bibliothekswesen*، ۱۸۹۳ء؛ (۳) F. Rosenthal: *On the knowledge of Plato's Philosophy in the Islamic World*، در *IC*، ۱۹۴۰ء، ص ۳۸۷ ببعد؛ (۴) وہی مصنّف: *As-Ṣayḥ Orientalia 'al-Yūnānī and the Arabic Plotinus source*، در *Orientalia*، ۱۹۵۲ء ببعد؛ (۵) P. Kraus: *Plotin chez les Arabes*، در *BIE*، ۱۹۴۱ء، ص ۲۹۳ ببعد۔

(R. WALZER)

اِفلاق: ولاشیا (Wallachia) کا ترکی نام۔ ۱۳۹۱ء میں Voivod* Mircea [ووئی ووڈ یا وائی ووڈ مقامی حکمران یا رئیس یا سرکاری افسر کو کہتے تھے۔ مرکیا (Mircea) ولاشیا کا حکمران تھا، اسے اعظم کا لقب بھی حاصل تھا (۱۳۸۶-۱۴۱۸ء)] ترکوں کا باج گزار بن گیا، لیکن سرزمین نے اپنی آزادی قائم رکھی۔ بویار (Boyars) [رؤساے رومانیا] کو اپنا حاکم منتخب کرنے کا حق باقی رہا، جس

کی توثیق بعد ازاں باب عالی سے ہوجاتی تھی۔ معاہدۂ ادرنہ تک، جو ۱۸۲۹ء میں ہوا، اس صورتِ حال میں عملاً کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی، اگرچہ شرائط میں، جب کبھی کسی حاکم (Voivod) نے خراج دینے سے انکار کیا یا آسٹریا یا روس نے ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کی، ایک سے زائد مرتبہ تغیّر ہوا؛ مثلاً پندرھویں صدی عیسوی ہی میں بدنام وُلَد دُرَکول (Wlad Drakhul) نے، جسے ترک ہمیشہ قازیقلُو (سولی چڑھانے والا) ووئی ووڈ (Kazyklu Voivoda) کہتے ہیں، ترکوں سے بغاوت کر بیٹھا؛ اس نے اپنی عادت کے مطابق ترکی سفیر حمزہ پاشا کو سولی پر چڑھا دیا اور بلغاریا کو تاخت وتاراج کیا۔ اس واقعے سے برافروختہ ہوکر سلطان محمد ثانی نے لشکرکشی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ درکول کو ہنگری بھاگ جانا پڑا اور ردول (Radul) کو اس کی جگہ حاکم بنا دیا گیا (۱۴۶۲ء)۔ ۱۴۷۷ء میں اس کی وفات کے بعد یہ ظالم حاکم (درکول) پھر واپس آ گیا، لیکن اسے ۱۴۷۹ء میں قتل کر دیا گیا۔ سولھویں صدی کے اواخر میں کچھ عرصے کے لیے میخائیل (Voivod Michael) ٹرانسلوینیا (Transylvania) اور مولدیویا (Moldivia) کو اپنی حکمرانی کے تابع لانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ۱۶۰۱ء میں مارا گیا۔ بعد کے زمانے میں یہ دستور ہوگیا کہ وائی ووڈ (Voivod) کو توثیق حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں بابِ عالی کی نذر کرنا پڑتی تھیں، جنھیں اکٹھا کرنے کے لیے بدقسمت رعایا کا خون چوسا جاتا تھا۔ یہ صورتِ حال اس وقت بطورِ خاص نمایاں ہوگئی جب ۱۷۱۶ء سے یونانی فَنَاری (قبطی فَنار) خاندانوں نے ولاشیا (Wallachia) اور مولدیویا (Moldivia) کے لیے حاکم مہیا کرنا شروع کیے۔ یہ صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً باب عالی کی طرف سے خراج اور لازمی نذرانوں کی رقم معیّن کرنے کی بابت احکام جاری کیے گئے اور جنس کی صورت میں غلہ، بھیڑ، بکری اور لکڑی کی ادائی بند کر دی گئی، پھر بھی بعض خرابیاں جاری رہیں اور ان کی اصلاح اس وقت بھی کچھ نہ ہوئی جب انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں روس کی تحریک پر یہ انتظام کیا گیا کہ حاکم صوبہ سات سال کے لیے مقرر کیا جائے اور اسے روسی سفیر کی منظوری کے بغیر برطرف نہ کیا جائے۔ معاہدۂ ادرنہ کے بعد یہ انتظام منسوخ کر دیا گیا۔ حاکم پھر عمر بھر کے لیے مقرر ہونے لگے۔ سالانہ خراج کے علاوہ انھیں اس خراج کے بدلے جو اجناس کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا ایک رقم دینا پڑتی تھی۔ اس معاہدے کی رو سے ترکوں کو دریاے ڈینیوب (Danube) کے بائیں کنارے کے شہر (بریلا Braila، جیورجیو Giorgiu اور ٹُرنو میگیوریل Turnu Magurele) بھی خالی کرنا پڑے اور مسلمانوں کو ان ریاستوں میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے منع کر دیا گیا۔ ۱۸۵۸ء میں جب کیوزا (Cuza) [یان قوزہ] کو ولاشیا اور مولدیویا دونوں کا صوبے دار منتخب کیا گیا تو باب عالی نے ان دونوں صوبوں کے اتحاد کا اعلان کر دیا اور اس کی توثیق بھی کر دی تو ترکیہ اور ولاشیا کے درمیان رابطہ منقطع ہوگیا، اگرچہ ۱۸۷۸ء کے معاہدۂ برلن کے بعد جا کر رومانیا کو بالکل مستقل حکومت تسلیم کیا گیا۔ [۱۸۸۱ء میں کیرول اوّل (Carol I) رومانیا کا بادشاہ ہوا۔ وہ ۱۹۱۳ء کی جنگِ بلقان میں شریک ہوگیا۔ عہد نامۂ بخارسٹ کے بعد دوبروجا کا صوبہ بھی اس کی مملکت میں شامل ہوگیا۔ ۱۹۱۴-۱۹۱۹ء کی عالمی جنگ میں رومانیا اتحادی حکومتوں کے ساتھ تھا اور اس کے خاتمے پر پورا ٹرانسلوینیا، بوکووینا اور بسربیا بھی اس کے تصرّف میں آ گئے۔ دیکھیے آ، ت بزیر مادّۂ افلاق، جہاں اس صوبے کی بہت مفصّل تاریخ اور مآخذ کی ایک طویل فہرست درج ہے].

اَفْلاک: رک بہ فلک. *

اَفْلاکی: شمس الدین احمد، سلسلۂ مولویّہ [رک بآن] کے اولیاء اللہ کا تراجم نگار۔ وہ (مولانا) جلال الدین رومی کے پوتے جلال الدین العارف کا مرید تھا اور انھیں کی فرمائش پر کتاب مناقب العارفین لکھی، جو (مولانا) جلال الدین رومی، ان کے والد، ان کے جانشینوں اور رفیقوں کے تراجم پر مشتمل ہے؛ آغاز تصنیف ۷۱۸ھ/۱۳۱۸-۱۳۱۹ء، تکمیل در ۷۵۴ھ/ ۱۳۵۳-۱۳۵۴ء؛ مطبوعۂ آگرہ ۱۸۹۷ء؛ ترجمۂ فرانسیسی از Cl. Huart: *Les saints des derviches tourneurs*، پیرس ۱۹۱۸-۱۹۲۲ء؛ اقتباسات کا انگریزی ترجمہ، در *The Mesnevi*، مترجمۂ J. W. Redhouse، کتاب اوّل، لنڈن ۱۸۸۱ء، ص ۱-۱۳۵۔ اس کتاب کا ایک اَور نسخہ، جسے عبدالوہّاب البہمدانی نے نظرِ ثانی کے بعد مزید تاریخوں وغیرہ کے اضافے کے ساتھ شائع کیا (۹۴۷ھ/ ۱۵۴۰-۱۵۴۱ء) اَور اس کا ترکی ترجمہ بھی موجود ہے۔

مآخذ: (۱) Storey، ۱: ۷۹۳ ببعد؛ (۲) Cl. Huart، در *JA*، ۱۹۲۲ء، ص ۳۰۸ ببعد؛ (۳) محمد فؤاد کوپرولو، در *Bell.*، ۱۹۴۳ء، ص ۳۸۳، ۴۲۲-۴۲۳، ۴۲۵؛ (۴) H. Ritter، در *Isl.*، ۱۹۴۲ء، ص ۱۲۹ ببعد.

(F. MEIER)

اَفْلَح بن یَسَار: رک بہ ابوعطاء السندی.

اَفِن (Offen): بوداپست کا جرمن نام؛ رک بہ بوداپست. *

اِفِندی: عثمانی ترکی کا ایک لفظ، جو قدیم یونانی لفظ αὐθέντης (بمعنی "جناب، آقا") سے ماخوذ اور بوزنطی یونانی لفظ ἀφέντης (Du Cange) سے مستعار ہے، نیز ایک قانونی اصطلاح (جسے فرینیقوس (Phrynieces)، پولیبیوس (Ploybius) بلکہ یوریپیدس (Euripides) نے بھی اس مفہوم میں استعمال کیا ہے)۔ [تیرھویں سے پندرھویں صدی تک یہ لفظ ابن بطّوطہ کے سفرنامے (رِحلة) اور اَفْلاکی کی مَناقِب العارِفین میں بھی استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ مولانا رومی کی دختر ملکہ خاتون بھی افندی پولُو (Poulo) یعنی "ہمارے افندی کی لڑکی" کہلاتی تھیں۔ سلطان محمد فاتح نے غَلَطَہ کے باشندوں کے نام مشہور یونانی فرمان میں اپنے لیے

افندی کا لقب استعمال کیا تھا۔ اگرچہ یہ لفظ سلجوقی عہد سے استعمال میں تھا تاہم اس کا زیادہ رواج عثمانلی عہد میں انیسویں صدی کے نصف سے شروع ہوا۔] اس نام کا اطلاق ان لوگوں پر کیا جاتا ہے جنھوں نے اچھی تعلیم حاصل کی ہو۔ معمولی لوگ اور نیچے درجے کے حکّام اَغَا [بروزنِ وَفَا] کہلاتے ہیں؛ انھیں افندی کا لقب اس وقت دیا جاتا ہے جب وہ ادبی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں۔ بے تکلفی اور مزاح سے اِفِنْدم (اختصار کر کے اِفَم) کہہ دیتے ہیں، جو ''صاحبِ من''، ''بیگم صاحب'' کا مترادف ہے [چنانچہ مردوں کے لیے 'بے افندی' اور عورتوں کے لیے 'خانم افندی' استعمال ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں سلطان کی بیگمات 'قادِین افندی' کہلاتی تھیں]۔ قسطنطینیہ کے قاضی کو استانبول اِفِنْدِسی بھی کہا جاتا ہے۔ اصلاحات سے پہلے رئیس افندی (براے رئیس الکُتّاب = صدرِ محرّرین) امورِ خارجہ کا وزیر ہوتا تھا۔ [شہزادوں اور] سلطانِ ترکی کا ایک لقب اِفِنْدِمِز (= ہمارے آقا) بھی تھا، اگرچہ یہ اس کے لیے مخصوص نہیں۔ [رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو بھی [ترک] عوام اکثر اِفِنْدِمِز پیغمبر (= ہمارے آقا پیغمبر) کہتے ہیں۔] مصری عرب اس کے مماثل اصطلاح ''اِفِنْدِنا'' کا اطلاق خدیو پر کرتے ہیں۔ اِفِنْدِی کی اصطلاح خالص ترکی ہے اور ہر جگہ جہاں ترکی اثر سرایت کر چکا ہے رائج ہے [اور اکثر ناموں کے ساتھ احترامًا بجاے بے کے مستعمل ہے، اگرچہ ۲۶ تشرین ثانی (= نومبر) ۱۹۳۴ء کے ایک قانون کی رو سے اس کا استعمال ہر قسم کی سرکاری تحریروں میں ممنوع قرار دیا جا چکا ہے]۔

مآخذ: (۱) J. Psichari: *Efendi*، در *Mélanges Havet*، ص ۳۸۷-۴۲۷؛ (۲) A. de Biberstein-Kazimirski: *Dictionnaire Arabe-Français*، ۱: ۴۱؛ (۳) Barbier de Meynard: *Dictionnaire Turc-Français*، ۱: ۴۲-۴۳؛ [(۴) آ، ت، بذیل مادّہ، از اورخان فواد کوپرولو]۔

(CL. HUART ہوار)

---

* **الأَفْوَہ الأَوْدِیّ:** ابو رَبِیْعَہ صَلائَۃ بن عَمْرو، زمانۂ جاہلیت کا ایک عرب شاعر، جو چھٹی صدی عیسوی کے وسط کے قریب قبیلۂ مَذْحِج کی شاخ اَوْد کا سردار تھا۔ اس کا جو کلام محفوظ ہے اس کا بیشتر حصّہ اپنے قبیلے اور اس کے سردار کے جنگی اوصاف کی مدح سرائی پر مشتمل ہے، لیکن حکمت آمیز اشعار کی بدولت اس کا شمار زمانۂ جاہلیت کے داناؤں میں ہوتا ہے۔ تاہم الجاحِظ (الحیوان، طبع ثانی، ۶: ۲۸۰) ان نظموں کی صحت کو جو اس سے منسوب ہیں شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو دلائل الجاحظ نے دیے ہیں وہ برمحل ہیں۔

مآخذ: (۱) الأَفْوَہ الأَوْدی: دیوان، در الطَّرائف الادبیۃ، قاہرہ ۱۹۳۷ء؛ لوئیس شیخو (L. Cheikho): شعراء النصرانیۃ، ص ۷۰-۷۴؛ (۳) اس کے دیوان کو اندلس میں القالی نے متعارف کرایا اور خود اسے وہ دیوان ابن دُرَید سے ملا تھا، دیکھیے *BAH*، ۹: ۳۹۶؛ (۴) اس کے اشعار اور سوانحی اشارات کے لیے دیکھیے الجاحظ: الحیوان، طبع ثانی (بمدد اشاریہ)؛ (۵) وہی مصنّف: البیان (طبع سَنْدُوبی)، ۱: ۱۷۱؛ (۶) ابن قُتَیبہ: الشعر، ص ۱۱۰، ۱۱۱؛ (۷) وہی مصنّف: عُیُون الأَخْبار، ۳: ۱۱۳؛ (۸) القالی: الأمالی، ۱: ۱۲۵؛ (۹) الأغانی، طبع ثانی، ۱۱: ۴۱، ۴۲؛ (۱۰) Barbier de Meynard: *Surnoms*، ص ۴۵ (منقول از *JA*، ۱۹۰۷ء)؛ (۱۱) براکلمان: تکملہ، ۱: ۵۷؛ (۱۲) نالینو (Nallino): *Scritti*، ۶: ۲۹ (فرانسیسی ترجمہ، ص ۴۸)۔

(CH. PELLAT)

---

* **اَفْیُون:** (Opium، افیم)، مشتق از یونانی ὀπιόν، جو ὄπος، (= عرقِ نباتی) کی تصغیر ہے۔ افیون اس خشک شدہ لیس دار عرق کا نام ہے جو پوست (لاطینی: Papaver Somniferum؛ عربی: خشخاش) کے کچے ڈوڈے سے نکالا جاتا ہے۔ اس کے بنانے کا طریق قدیم یونانی مصنّف، مثلاً دیسقوریدس (Dioscorides)، ۴: ۶۴، مفصّل تحریر کر چکے ہیں (عہد عتیق میں افیون کے متعلّق دیکھیے Pauly-Wissowa، بذیل مادّہ Mohn.)۔ مسلمانوں کے زمانے میں افیون طبّی ضروریات کے لیے اور بطور مخدِّر استعمال کی جاتی تھی [درویشوں کے ہاں بھی]۔ بالائی مصر میں پوست کی کاشت بہت قدیم زمانے سے ہوتی تھی۔ کوہِین العطّار، ص ۱۲۸، کے بیان کے مطابق، اس کے زمانے (ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی) میں بہترین افیون ابوتیج میں تیار کی جاتی تھی، جو اَسْیُوط کے جنوب میں ہے۔ پوست کی کاشت اور افیون کی تیاری کا کام مصر میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک فروغ پر رہا (قب Lane: *Modern Egyptians*، طبع پنجم، ۱: ۱۱۸ و ۲: ۳۵)۔ ایشیاے کوچک میں پوست کی کاشت کا سراغ بظاہر بوزنطی حکومت کے عہد تک نہیں جاتا، بلکہ معلوم ہوتا ہے اس کا رواج صلیبی جنگوں کے بعد عام ہوا اور ترکوں کے عہد میں اس پودے کو قَرَہ حِصار کے قرب و جوار کی آب و ہوا خصوصیت سے بہت راس آئی؛ چنانچہ اس شہر کا عرف ہی افیون قَرَہ حصار [رک بآن] ہو گیا۔ یہ شہر انیسویں صدی عیسوی تک پوست کی کاشت اور افیون کی تیاری اور برآمد کا مرکز بنا رہا (قب O. Blau: *Etwas Über das Opium*، در *ZDMG*، ۱۸۶۹ء، ص ۲۸۰)۔ ایران اور ترکی میں افیون کو تِریاق (دافعِ زہر) بھی کہتے ہیں۔ شاہ عبّاس ثانی نے جب ممانعتِ شراب کا قانون نافذ کرنا چاہا تو افیون کا استعمال اس قدر بڑھ گیا کہ اسے اپنے امتناعی حکم میں کسی حد تک نرمی اختیار کر کے اس کی جگہ افیون کی تجارت کے خلاف احکام صادر کرنا پڑے (۱۶۲۱ء، P. Della Valle، ۲: ۱۰۸)۔ یَزْد اور اِصفہان سے افیون ہندوستان اور ترکی کو برآمد کی جاتی تھی (دیکھیے Chardin: *Voyages*، ایمسٹرڈم ۱۷۳۵ء، ۳: ۱۴-۱۵، ۹۲ ببعد و ۲: ۵۸-۶۷؛ J. E. Polak: *Persien*، لائپزگ ۱۸۶۵ء، ۲: ۲۴۸-۲۵۵، نیز افیون نوشی کا دلچسپ بیان از براؤن (E. G. Browne): *A Year amongst the Persians*، بمددِ اشاریہ)۔ افیون نے ہندوستان میں خاصا اہمّ کردار ادا کیا، جہاں ان ڈوڈوں کو جن سے افیون نکالی جاتی ہے پوست کہتے ہیں اور انھیں جوش دے کر عرق نکال لیا جاتا ہے (قب J. Charpentier: *BSOS 'Pōst* (ā)، ۱۹۳۵-۱۹۳۷ء، ص ۱۰۱ ببعد، بالخصوص مغلیہ عہد کے لیے)۔ B. Laufer کے قول کے مطابق

(در *T'oung Pao*، ۱۹۱۶ء، ص ۴۶۲؛ قب نیز O. Franke: *Geschichte d. Chines. Reiches*، ۲: ۵۵۱ و ۳: ۴۲۸) افیون تیار کرنے کا علم اہلِ چین کو ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان سے حاصل ہوا، نہ کہ مسلمانوں سے (یہ قول بعض دوسرے محققین کی رائے کے خلاف ہے، مثلاً J. Edkins: *The Poppy in China*، ص ۵؛ E. Bretschneider در A. de Candolle: *Origin of Cultivated Plants*، ص ۴۰۰؛ Yule و Burnes: *Hobson-Jobson*، ص ۶۴۱؛ Giles: *Glossary of Reference*، ص ۲۰۰، جو افیون کے چینی نام کو عربی سے مشتق بتاتے ہیں)۔ بددیانت تاجروں کی طرف سے افیون میں ملاوٹ (مختلف قسم کے گوند، لال ہڑتال، سیندور وغیرہ کی آمیزش) کے لیے دیکھیے E. Wiedemann، در *SBPMS Erl.*، ۱۹۱۴ء، ۴۶: ۱۷۶-۲۰۶.

مآخذ: (۱) ابو المنصور المُوَفَّق: الأَبْنِیَة (طبع Seligmann)، ۱: ۳۶؛ (۲) ابن العَوّام: فِلاحة، ترجمہ از Clément-Mullet، ۲/۱، ص ۱۲۸ ببعد؛ (۳) ابن البَیْطار: جامع، ۱: ۴۵، ترجمہ از لِکلَرک (Leclerc)، شمارہ ۱۱۶ و ۲۱۲۰؛ (۴) قَزْوِینی (طبع وُسٹِنْفِلْڈ)، ۱: ۲۸۲؛ (۵) تُحفةُ الأحباب (طبع Renaud-Colin)، ص ۴۰؛ (۶) I. Loew: *Die Flora der Juden*، ۲: ۳۶۴-۳۷۰؛ (۷) M. Meyerhof: *Un glossaire de matière médicinale comp. par Maimonide*، شمارہ ۳۵ (قب نیز شمارہ ۴۰۱)؛ (۸) Millaut: *L'opium et le hachiche*، در *La Géographie*، ۱۹۱۲ء، ص ۱۳۲ ببعد.

(C. E. DUBLER)

---

* **اَفْیُون قَرَہ حِصار:** صحیح تر افیون قَرَہ حصاری (جدید املا: Afyonḳara-hisar)، بہ معنی ''افیون کا سیاہ قلعہ''، جسے آج کل صرف افیون بھی کہتے ہیں اور جس کا پرانا نام ''قَرَہ حِصارِ صاحب'' تھا (درِ نثری، مطبوعۂ انقرہ، ص ۶۴ = مطبوعۂ برلن، ص ۲۱ = Leunclavius: *Hist. Musulm.*، فرینکفرٹ (Frankfurt) ۱۵۹۱ء، عمود ۱۴۰: صاحِبْک قَرَہ حِصار [ی]، *Principis Maurocostrum*؛ Saibcarascar. در Caterino Zeno: *Commentarii del Viaggio in Persia*، وینس ۱۵۵۸ء، ص ۱۴ ب)؛ مغربی آناطولی کا ایک شہر، جو ۳۸° ۵۰′ عرض بلد شمالی اور ۳۰° ۳۰′ طول بلد مشرقی پر سطحِ بحر سے ۱۰۰۷ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ شہر دریاے اقار چای کے کنارے پر آباد ہے، جو پہلے اِیبِر گورلو (Eber Gölü) میں گرتا، پھر آق شہر گورلو (Akshehir Gölü) میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ جھیل ایک الگ تھلگ آتش فشاں مخروطی اور سلامی دار پہاڑی کے دامن میں واقع ہے، جس کے اردگرد شہر آباد ہے۔ پہاڑی، میدانی سطح سے دو سو میٹر بلند ہے۔ قَرَہ حِصارِ صاحب، ایالت آناڈولو کی ایک سنجاق کا صدر مقام تھا (حاجی خلیفہ: جہان نُما، ص ۶۴۱) اور ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء سے ولایتِ خداوندگار (بروسہ) کی ایک سنجاق کا صدر مقام قرار پایا۔ عصرِ حاضر کی ترکی میں افیون قَرَہ حِصار اسی نام کی ولایت (=ایل) کا صدر مقام ہے۔ یہ ولایت افیون قَرَہ حِصار، بُولْوادِین، دِنار امیر طاغ (عزیزیّہ)، صَنْدِیقْ لی اور شُہُت (شہود) کی قضاؤں (ایلچہ) پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۵ء میں شہر کی آبادی ۲۹۰۳۰ (اور ۱۹۵۰ء میں ۲۹۸۲۶) تھی۔ قضا (ایلچہ) کی آبادی ۱۳۶۶۷ اور ولایت کی آبادی ۳۳۵۶۰۹ (۱۹۵۰ء میں ۳۷۲۶۰۰) تھی۔ ولایت کی سطح کا رقبہ ۱۳۵۵۵ مربّع کیلومیٹر ہے۔ افیون قَرَہ حِصار کا یہ نام، جو پہلے صِرف عوام میں معروف تھا، اب سرکاری کاغذوں میں بھی استعمال ہونے لگا ہے (Tavernier: *Les six voyages*، ۱: ۱۲۰، میں اس کا نام ''Aphiom Carassar'' درج ہے اور Ch. Texier: *Asie mineure*، پیرس ۱۸۳۴ء، میں اَفْیُوم (Aphioum) لکھا ہے)۔ اس کا یہ نام اس لیے پڑا کہ اس علاقے میں اچھی افیون کثیر مقدار میں پیدا ہوتی تھی، جس کا ذکر پہلے ہی Belon: *Les observations de plusieurs singularitez et choses mémorables*، پیرس ۱۵۵۵ء، ص ۱۸۳ الف (قب O. Blau، در *ZDMG*، ۱۸۶۹ء، ص ۲۸۰) میں آچکا ہے.

قَرَہ حِصارِ صاحب وہی بوزنطی عہد کا قلعہ اَکْروی نوس (Akroïnos) یا اَکْروے نوس (Akroynos) مانا گیا ہے جس کے قریب قیصر لیو (Leo) ثالث نے ۷۴۰ء میں عربوں کو شکست دی تھی اور افسانوی غازی سیّد بطّال اور اس کی فوج نے شہادت کا مرتبہ حاصل کیا تھا (Theophanes: *Chronogr.* (طبع de Boor)، ۱: ۳۹۰، ۴۱۱) اور جہاں قیصر الیکسیس اوّل کومنینُوس (Alexius I Comnenus) نے ۱۱۱۶ء میں سلجوقی سلطان ملک شاہ سے صلح کی بات چیت کی تھی (Anna Comnena: *Alexius* (طبع B. Leib، پیرس ۱۹۳۴-۱۹۴۵ء، ۳: ۲۰۹)۔ یہ شہر ترکوں نے بوزنطیوں سے غالباً تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لیا تھا، لیکن تفصیلات میسّر نہیں۔ آلتی گورز کوپرُوسی (Altigöz Koprüsü) کے کتبے (*RCEA*، شمارہ ۳۶۵۸) سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء میں یہ شہر ترکوں کے قبضے میں تھا۔ مشہور سلجوقی وزیر صاحِب عطا فخر الدّین علی بن الحسین (م ۶۸۷ھ/ ۱۲۸۸-۱۲۸۹ء) قرہ مانیوں سے شکست کھانے کے بعد اپنے خزانوں سمیت اسی شہر میں آکر جا گزیں ہوا تھا۔ اسی کے نام پر یہ شہر قَرَہ حِصارِ صاحب کہلانے لگا۔ اس کے بیٹوں تاج الدّین حسین اور نصرت الدّین کو ۱۲۷۱ء میں قرہ حصار کا سارا علاقہ کُوتاہیہ، صَنْدِیقْ لی، غُرْغُرُم، آق شہر کے مقامات، اور بعد میں لَادِیق (موجود دِنِزْلی کے قریب دریاے لائیکس (Lycus) کے کنارے والا پرانا لاذقیہ (Laodicaea) اور خونُس (عہد قدیم کا Chonae، آج کل کا ہُونَز) کے قصبے جاگیر کے طور پر مل گئے۔ دیکھیے آق سرای (عثمان توران)، ص ۷۴؛ وابن بی بی (طبع ہوتسما Houtsma)، ص ۳۰۸۔ (صاحب عطا کے بیٹوں کے حال میں بھی صفحات ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۳۴ پر اس کا ذکر آیا ہے۔ قرہ حصار دِوِلہ سے یہی قَرَہ حِصار مراد ہے)۔ جُمْری کی شورش کے دوران میں (۱۲۷۷ء) لادِیق اور خونُس، علی بیگ ترکمان کے قبضے میں چلے گئے تھے، مگر سلطان نے اسے قَرَہ حِصار کے قریب ایک کام یاب مہم میں شکست دی اور وہ اسی جگہ مارا گیا (ابن بی بی، ص ۳۳۳)۔ صاحب

عطا کے بعد کے جانشینوں کو گرمیانوں کی اطاعت قبول کرنا پڑی اور بالآخر اپنا علاقہ انھیں کے حوالے کرنا پڑا (ابن فضل اللہ العُمَری: مَسالک الأبصار (طبع Taeschner)، ص ۳۱ کی ایک عبارت میں بیان کرتا ہے کہ قَرَہ سار پر ابنِ طُور غود قابض تھا، پھر ص ۳۶ و ۳۷ کی ایک اَور عبارت میں لکھتا ہے کہ قَرَہ ساری گرمیانوں کے ماتحت ابن الصاحب کے قبضے میں ہے۔ اس سے بلاشبہہ صاحب کا جانشین مراد ہے؛ قُبْ نیز احمد توحید، در *TOEM*، سلسلۂ اوّل، ۲: ۵۶۳ ببعد)۔ اس کے بعد قَرَہ حِصار ریاستِ گرمیان [رک بآں] کے انقلابات میں شریک رہا، جو جلد ہی سلاطین عثمانیہ کی باج گزار ہوگئی، بلکہ بایزید کے عہد میں کچھ عرصہ، یعنی ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء سے لے کر تیمور کے اسے بحال کرنے (۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) تک، براہِ راست آلِ عثمان کے قبضے میں رہی۔ گرمیان کے خِضر پاشا بن سلیمان شاہ (م ۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء) اور اس حکم ران خاندان کے دوسرے ارکان کو قَرَہ حِصار کے فرقۂ مولویہ کی بستیوں کے رئیس (چلپی) بتایا گیا ہے (دیکھیے غالب دِدِہ: تذکرۂ شعرائے مولویہ، مخطوطۂ وی انا، شمارہ ۱۲۵۷، ورق ۵۴ (۹۰ (=علی اِنْور: سِماع خانۂ اِدب، استانبول ۱۳۰۹ھ ص ۴۸ ببعد، ۱۰۲)۔ ایشیائے کوچک پر تیموری حملے کے دوران میں انقرہ کی جنگ کے بعد (۱۴۰۱ء) قَرَہ حِصار کو بھی فاتح کے چھاپا مار دستوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانا پڑا (شَرَف الدّین علی یَزْدِی: ظفر نامہ، کلکتہ ۱۸۸۷-۱۸۸۸ء، ۲: ۴۴۶، ۴۵۷، ۴۸۴، ۴۹۲=*Histoire de Timur-Bec*، مترجمۂ Pétis de la Croix، مطبوعۂ Delft ۱۷۲۳ء، ۴: ۲۱، ۳۱، ۶۰، ۶۸؛ (۲) Dukas: *Hist.*، مطبوعۂ Bonn، ص ۷۷)۔

۸۳۲ھ/۱۴۲۸-۲۹ء میں گرمیان اُوغلو کی ریاست قطعی طور پر آلِ عثمان کے ہاتھوں میں چلی گئی اور قَرَہ حِصار کو اپنے نواحی علاقے کے ساتھ اِیالتِ آناطولی کا ایک لِوا (=سنجاق) بنا لیا گیا (قُبْ جِہان نُما، ص ۶۴۱) قَرَہ مان کی ریاست کا سرحدی قلعہ ہونے کی وجہ سے اسے اس وقت تک فوجی اہمیّت حاصل رہی جب تک کہ قَرَہ مان کی آزادی برقرار رہی۔ اوزون حسن سے جنگ چھڑ جانے پر (۸۷۷ھ/۱۴۷۲-۷۳ء) شہزادہ مصطفٰی پیچھے ہٹ کر قَرَہ حِصار آ گیا اور اس نے اس مقام کو قَرَہ مان اوغلو کے خلاف اپنی مہمّات کا جنگی مرکز بنایا۔ آخرالذکر ایرانیوں کے حلیف تھے (عاشق پاشازادہ: تاریخ (طبع Giese)، ص ۱۶۹؛ سعدالدّین: تاج التواریخ، ۱: ۵۳۴؛ زینو (Caterino Zeno)، محلِ مذکور)۔ ۸۹۵ھ/۱۴۸۹-۱۴۹۰ء میں جب مصریوں نے قَرَہ مان پر حملہ کیا تھا تو شہران کے خلاف ہرسِک زادہ احمد پاشا کے جنگی اقدامات کا مرکز بنا رہا (سعد الدّین، ۲: ۶۵)۔ سترھویں صدی عیسوی کے متحارب پاشاؤں کی کش مکش اور ان کی بغاوتوں کے سلسلے میں بھی قَرَہ حِصار کا ذکر بکثرت آیا ہے (جلالی کی بغاوت ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء؛ بابا عُمر کی بغاوت ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء؛ اَبازَہ حَسَن پاشا کی بغاوت ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء)۔ ۱۸۳۳ء میں محمد علی پاشا [والی مصر] کے بیٹے ابراہیم پاشا نے اس شہر کو عارضی طور پر قبضے میں لے لیا۔ ۱۹۲۱-۱۹۲۳ء کی ترکی - یونانی جنگ کے دوران میں یونانیوں نے اس شہر پر دو مرتبہ قبضہ کیا (از ۲۸ مارچ ۱۹۲۱-۱۷ اپریل ۱۹۲۱ء، و از ۱۳ جولائی ۱۹۲۱-۷ اگست ۱۹۲۲ء) اور اس جنگ میں شہر کو بہت نقصان پہنچا۔ تاہم قیامِ جمہوریت کے بعد اسے بڑے پیمانے پر از سرِ نو تعمیر کر کے پورے نقصان کی تلافی کر دی گئی۔ قبل ازیں قَرَہ حِصار ایک طرف تو سمرنا اور اندرونِ ملک کے تجارتی مرکزوں (انقرہ، قَیْصری، تَلْت (Tolot) وغیرہ کے درمیان کاروانی راستوں کے سنگھم پر اہمّ مقام تھا، دوسری طرف استانبول یا یوں کہیے کہ سقوطری (اُوسکودار Üsküdār) اور ملک شام کے مابین یہی اہمیت رکھتا تھا، دیکھیے F. Taeschner: *Das anatolische Wegenetz nach osmanischen Quellen*، ج ۱، لائپزگ ۱۹۲۴ء، خصوصاً ص ۱۲۷۔ نزدیک تر زمانے میں یہ مقام آناطولی کے ریلوں کے سلسلے کا ایک بڑا جنکشن ہو گیا ہے اور اس ریلوے لائن کا بھی جو سمرنا سے قَصَبہ کی طرف جاتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یونانی اور رومی عہد کے چند آثارِ قدیمہ کا بیشتر حِصّہ گردونواح کے کھنڈروں، خاص کر سیدی لر (Prymnessus)، اِنْچہ قَرَہ حِصار (Docimium) اور چِفْت قَصَبہ سی (synnada) سے اُٹھا کر شہر میں لایا گیا ہے۔ شہر کی نمایاں علامت، یعنی کوہ آتش فشاں کی عمودی مخروطی پہاڑی، جس پر بوزنطیوں کے آخری دَور کے مورچے بنے ہوئے ہیں اور جنھیں گرمیان اوغلو نے از سرِ نو بحال کیا تھا (ان کی کیفیت اولیا چلپی نے بیان کی ہے، سیاحت نامہ، ۹: ۲۹-۳۴)، نی بور (Niebuhr) کے زمانے (۱۷۶۶ء) تک بِک برن قلعہ سی (یعنی ”قلعہ، جو بیگ (=سردار) کو پناہ دیتا ہے“) کہلاتی تھی۔ یہ قلعہ کبھی مناسب طور پر آباد نہیں ہوا اور اب ویران پڑا ہے۔ بعض اوقات اسے سیاسی قیدیوں کی نظر بندی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا (عاشق پاشازادہ: تاریخ، مطبوعۂ استانبول، ص ۲۴۳ ببعد؛ طبع Giese میں مذکور نہیں)۔ ۱۸۰۲ء تک وہ مِصر سے لائے ہوئے فرانسیسی اسیرانِ جنگ یہیں رکھے جاتے تھے۔ سلاجقہ اور گرمیان اُوغلو کے عہد کے دیگر آثار مثلاً صاحبِ لر تُربت سی، اُلُو جامع خواجہ بیگ، سلطان دیوانی کا مقبرہ، نیز عہدِ عثمانی کی یادگاریں، مثلاً احمد گِدِک پاشا کی مسجد اور اس کے ملحقات (آج کل مدرسے کو عجائب گھر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے؛ اِکرم حقّی آی ویردی: فاتح دوری معماری سی، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۲۵۲-۲۵۸) ایسے آثار ہیں جو ابھی تفصیلی معائنے کے محتاج و منتظر پڑے ہیں۔ آلتی گوز کو پروسی کے مذکورۂ بالا کتبے کے علاوہ شہر کے دیگر کتبے *RCEA*، شمارہ ۴۱۳۲، ۴۳۲۹، ۴۵۴۰ و ۴۶۶۷ میں شائع ہو چکے ہیں۔

مآخذ: (۱) سالنامۂ ولایت خداوندگار، بابت ۱۳۰۲ھ، ص ۴۶۶ ببعد؛ (۲) V. Cuinet: *La Turquie d' Asie*، ۴: ۲۲۴ ببعد؛ (۳) حاجی خلیفہ: جِہان نُما، ص ۶۴۱ ببعد؛ (۴) Tavernier: *Les six voyages*، پیرس ۱۶۷۷ء، ۱: ۸۷ ببعد؛ (۵) Pococke: *Description of the East*، لنڈن ۱۷۴۵ء، ۲/۲: ۸۲؛ (۶) نی بور (C. Niebuhr): *Reisebeschreibung*، ۳: ۱۳۱-۱۳۴ (نقشہ اور سیر بین بھی ساتھ ہے)؛ (۷) براؤن (W.G. Browne) (۱۸۰۲ء)، در R. Walpole: *Travels in various countries of the East*، لنڈن ۱۸۲۰ء، ص ۱۱۶ ببعد؛ (۸) Léon de Laborde: *Voyage de l'*

Asie Mineure، پیرس ۱۸۳۸ء، ص ۶۴ ببعد (خوب صورت مناظر کے ساتھ)؛ (۹) ہیملٹن (W. Hamilton): *Researches in Asia Minor*، لنڈن ۱۸۴۲ء، ۱: ۴۶۲، ۴۷۰؛ (۱۰) v. Vincke، F. L. Fischer و v. Moltke: *Planatlas von Kleinasien*، برلن ۱۸۴۶ء، ص ۵۴، پلیٹ ۴؛ (۱۱) *Mitt. des Deutschen Arch. Instituts in Athen* ۱۸۸۲ء، ص ۱۳۹ ببعد؛ (۱۲) G. Radet: *Rapport sur une Mission scientifique en Asie Mineure.*، در *Nouv Archives des Missions scientifiques*، ۱۸۹۵ء، ص ۴۲۵ ببعد؛ (۱۳) E. Naumann، در *Globus*، ج ۷، شمارہ ۱۹ (باتصویر)؛ (۱۴) Körte: *Anatolische Skizzen*، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۸۱ ببعد؛ (۱۵) Zimmerer و Oberhummer: *Durch Syrien und Kleinasien*، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۳۹۰ ببعد؛ (۱۶) Besim Darkot، در آ، ت، ۷: ۲۷۷-۲۸۰؛ (۱۷) ادیب علی باقی: افیونده اِسکی زمان لرده یاشایش، درطاش پنار درجیسی، مطبوعۂ افیون؛ (۱۸) محمد فرید و محمد مسعود: صاحِب عطااِیلِه او غُللری، استانبول ۱۹۳۴ء.

(FR. TAESCHNER و J. H. MORDTMANN)

⊗ **اِقامَہ**: (ع) ایک طرح کی دوسری اذان [رک بآں] جس سے یہ اعلان مقصود ہوتا ہے کہ نماز باجماعت شروع ہورہی ہے۔ اِقامہ صف بندی کے وقت کہی جاتی ہے۔ اقامہ حتی الوسع مؤذّن ہی کہتا ہے، جیسے حدیث میں ہے: مَنْ اَذَّنَ فَھُوَ یُقِیْمُ (احمد: مسند، ۴: ۱۶۹؛ ترمذی: کتاب الصلوٰۃ؛ ابن ماجہ: کتاب الاذان)، مسلم کے الفاظ ہیں اَلْمُؤَذِّنُ یُقِیْمُ (کتاب صلوٰۃ المتاخرین) لیکن کوئی دوسرا مقتدی بھی کہہ سکتا ہے۔ اقامہ کے کلمات احناف کے نزدیک یہ ہیں: اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر؛ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ؛ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ، اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ؛ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح؛ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ، قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ؛ اَللّٰہُ اَکْبَر، اَللّٰہُ اَکْبَر؛ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ دوسرے فقہی مسالک میں کلمات اقامۃ تو یہی رہتے ہیں البتہ جس تعداد میں انھیں دہرایا جاتا ہے اس میں کچھ فرق ہے، مثلاً اس کی ایک صورت یہ ہے: اللہ اکبر (دوبار)، اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ (ایک بار)، اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ (ایک بار) حیی علی الصلوٰۃ (ایک بار) حیی علی الفلاح (ایک بار) قدقامت الصلوٰۃ (دوبار) اللّٰہ اکبر (دوبار) لاالٰہ الا اللّٰہ (ایک بار)۔ مالکیوں کے نزدیک اقامۃ اس طرح کہی جاتی ہے: اللّٰہ اکبر (دو بار)، اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ (ایک بار)، اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ (ایک بار)، حیی علی الصلوٰۃ (ایک بار)، اللّٰہ اکبر (دو بار)، لا الٰہ الا اللّٰہ (ایک بار)۔ اکیلے نماز پڑھنے والے کے لیے بھی کتب فقہ میں اقامۃ کا کہنا سنت قرار دیا گیا ہے (کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعۃ، مصر ۱۹۵۰ء، ۱: ۲۳۵)۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام میں اقامۃ کا تصور یہود کی نماز سے لیا گیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے المَقْرِیْزی، ۲: ۲۷۱، کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ حوالہ غیر متعلق ہے اور ان مستشرقین کا یہ خیال درست نہیں جس کے لیے دیکھیے بخاری: صحیح، کتاب الاذان، باب ۱؛ احمد: مسند، ۴: ۴۲ ببعد؛ جہاں آغاز اذان کی بحث ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہ کلمات یہود، نصاریٰ اور مجوس کے طریق کے خلاف اور اسے چھوڑتے ہوئے اختیار کیے گئے؛ نیز دیکھیے آ عربی، ۲: ۴۵۵، تعلیقہ از محمد عرفہ.

مآخذ: (۱) احادیث کے مجموعوں اور فقہ کی کتابوں کے علاوہ دیکھیے: (۱) الدّمشقی: رحمۃ الامۃ فی اختلاف الأئمۃ (بولاق ۱۳۰۰ھ)، ص ۱۴ ببعد؛ (۲) باجوری (بولاق ۱۳۰۷ھ)، ۱: ۱۶۷.

(عبدالمنّان عمر)

⊗ **اِقبال**: ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؒ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء/ ۲۰ ذوالحجّہ ۱۲۸۹ھ کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے (بلدیۂ سیالکوٹ کے اندراجاتِ پیدائش و اموات شائع کردہ روزنامۂ انقلاب مورخۂ ۷ مئی ۱۹۳۸ء) [اور فقیر سید وحیدالدین کی رائے میں ۳ ذوالقعدہ ۱۲۹۴ھ/ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو، دیکھیے روز گار فقیر، طبع دوم، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۷]۔ آباواجداد ''سپرو'' گوت کے کشمیری پنڈت تھے، جو غالباً اٹھارھویں صدی کے اوائل میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے (مشاہیر کشمیر، ص ۱۷۷)، تجارت کے سلسلے میں پنجاب آتے اور واپس چلے جاتے تھے۔ دادا مستقل طور پر سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہوگئے؛ ساٹھ سال کی عمر میں ہیضے سے روپڑ میں وفات پائی، جہاں ان کے چھوٹے بیٹے (اقبال کے عمّ محترم) ملازم تھے.

اقبال کے والد بزرگوار شیخ نور محمد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن دقیقہ سنجی اور فہم حقائق میں ایسی دسترس حاصل تھی کہ شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی جیسے فاضلِ اجلّ نے انھیں ان پڑھ فلسفی کا خطاب دے رکھا تھا۔ وہ دستکاری سے روزی کماتے تھے اور بہ لحاظ معاش فارغ البال نہ تھے، لیکن کردار نہایت پاکیزہ اور مزاج صوفیانہ تھا، جس کی وجہ سے اہلِ شہر ان کی بہت عزت کرتے تھے.

اقبال نے خود لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک فقیر ہمارے دروازے پر آکر ڈٹ گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ جو کچھ اس نے بھیک مانگ کر جمع کر رکھا تھا گر پڑا۔ یہ دیکھتے ہی والدہ تڑپ اٹھے، آنکھیں نم ناک ہوگئیں، فرمایا: قیامت کے دن خیر الرُّسُلؐ کی امّت کے غازی، شہید، عالم، زاہد، عاشق جمع ہوں گے اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مجھ سے پوچھیں گے کہ ایک جوان مسلمان تیرے حوالے ہوا تھا، جسے میری تعلیم سے کچھ حاصل نہ ہوا؛ تو مٹھی بھر خاک کو آدمیّت کے اوصاف نہ سکھا سکا۔ بتا! میں کیا جواب دوں گا؟ (رموز بیخودی، طبع اوّل، ص ۱۷-۴۷).

اقبال جب موقع پاتے والد کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ گرمیاں پہاڑ پر بسر کرنے کے بجائے ان کی گرمی صحبت سے مستفید ہوتے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ ایک متوفّی عزیز کا ذکر آ گیا۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے: ''معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے''؟ اس خیال

سے اس قدر متاثّر ہوے کہ تقریباً بے ہوش گئے۔ رات کے دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی (مکاتیب اقبال، حصّۂ دوم، ص ۶۷)۔

اقبال کی پیدائش سے پیشتر ان کے والد ایک ڈپٹی کے ہاں ملازم ہو گئے تھے، جس پر رشوت ستانی کا شبہہ تھا۔ والدہ نے بطورِ خود حلف اٹھالیا کہ ملازمت کی آمدنی سے کھانے پینے کی کوئی شے نہ خریدیں گی؛ چنانچہ اقبال کی شیر خوارگی کے زمانے سے والد کی تنخواہ سے خریدی ہوئی کوئی چیز نہ دس سال کی عمر تک اقبال کو کھانے دی نہ خود کھائی، یہاں تک کہ والد نے ڈپٹی کی ملازمت ترک کر دی۔

عرفان وتقوٰی اور آدابِ اسلامیت کی یہ پُر سعادت فضا تھی جس کی آغوش میں اقبال نے تربیت پائی اور اس تربیت سے ان کے خداداد جوہر چمک اُٹھے۔

دو بھائیوں اور چار بہنوں میں اقبال سب سے چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں شروع ہوئی۔ پھر سکاچ مشن سکول میں داخل ہو گئے۔ پرائمری، مڈل اور میٹرک کے امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا۔ ایف۔اے کا امتحان سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوے۔ بی۔اے کے سالانہ امتحان میں انگریزی اور عربی کے لیے دو طلائی تمغے ملے۔ عربی کے امتحان میں پنجاب بھر میں اوّل رہے۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کیا اور تمغہ پایا۔

مولانا میر حسن اقبال کے والد کے ہم محلّہ اور عزیز دوست تھے۔ وہ پہلے سکاچ مشن سکول میں عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ پھر کالج کے پروفیسر بن گئے۔ عربی اور فارسی میں اپنے عہد کے یگانہ عالم مانے جاتے تھے۔ اقبال کو جوہرِ قابل دیکھ کر مولانا نے تعلیم وتربیت پر خاص توجّہ فرمائی اور اقبال نے بھی اس تربیت سے انتہائی فائدہ اٹھایا، جس کا اعتراف ان کی ایک نظم میں موجود ہے (بانگ درا، ص ۹۸-۹۹)۔ حالی نے سرسیّد کی تاریخ وفات کے سلسلے میں دو عجیب وغریب عربی مادّوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک غُفِرلَہ۔ دوسرا اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ (حیاتِ جاوید، حصّۂ اوّل ۳۰۵)۔ ان میں سے پہلا مادّہ مولانا میر حسن نے اور دوسرا اقبال نے نکالا تھا (روایات، جمع کردۂ راقم)۔ اس شفیق استاد سے اقبال کی غیر معمولی عقیدت برابر قائم رہی۔ یہاں تک کہ جب خود ان کے لیے ''سر'' کا خطاب تجویز ہوا تو حکومت سے کہہ کر مولانا کو ''شمس العلماء'' کا خطاب دلایا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کا خاص تعلّق پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، استادِ فلسفہ، سے پیدا ہوا، جو عربی کے فاضل تھے اور اپنی کتاب *Preaching of Islam* کے باعث شہرۂ آفاق ہیں۔ وہ اقبال کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کا معیارِ فکر بلند کر دیتا ہے۔ اس شفیق استاد کے متعلق اقبال کے عقیدت بھرے جذبات نے ''نالۂ فراق'' (بانگِ درا) کی شکل میں بقاے دوام کا لباس پہنا۔

ایم۔اے کرنے کے بعد اقبال ۱۸۹۹ء میں اورینٹل کالج لاہور میں [بطور میکلوڈ عربک سکالر (ریڈر) مقرر ہوے۔ اس دوران میں عارضی طور پر اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفے کے استاد بھی رہے۔] اسی زمانے میں اقبال نے علم الاقتصاد پر ایک کتاب لکھی، جو [ان کے اپنے قول کے مطابق] اس مضمون پر ''اردو میں سب سے مستند کتاب تھی'' (مکتوب اقبال، در شاد اقبال، ص ۴۵)۔ [اس زمانے میں انھوں نے اور بھی علمی کام کیا (ملاحظہ ہو مجلّۂ اقبال، اپریل ۱۹۶۲ء، مضمون از ڈاکٹر غلام حسین، ص ۵۲)۔ یہ ریڈر شپ ۱۲ مئی ۱۹۰۳ء تک رہی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ۳ جون ۱۹۰۳ء کو گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرّر ہوے۔ ۱۹۰۵ء میں تین سال کی رخصت لے کر انگلستان چلے گئے]۔

۱۸۹۵ء میں حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان (بازارِ حکیماں، اندرون بھاٹی دروازہ) پر ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی۔ دہلی کے مرزا ارشد گورگانی اور لکھنؤ کے میر ناظر حسین کاظم اس مشاعرے کی روحِ روان تھے۔ یہ دونوں صاحب اور ان کے شاگرد ایک دوسرے کے مقابلے میں طبع آزمائیاں کیا کرتے تھے۔ اس مشاعرے کی ایک مجلس میں اقبال نے طرحی غزل پڑھی، جس کے مندرجۂ ذیل شعر پر مرزا ارشد تڑپ اٹھے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مقطع میں دہلی اور لکھنؤ کے جھگڑوں پر یہ حقیقت آموز تبصرہ کیا گیا تھا:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

(تفصیل کے لیے دیکھیے حکیم احمد شجاع: لاہور کا چیلسی، در نقوش، لاہور)۔

مقامِ مشاعرہ کے سامنے حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ موصوف کے خصائل حسنہ کے باعث یہ گویا بامذاق اصحاب کا کلب گھر تھا۔ چند روز میں اقبال بھی اس حلقۂ احباب کے رکن بن گئے۔ انھیں احباب کے اصرار پر اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے لیے اپنی پہلی مشہور نظم ''نالۂ یتیم'' لکھی، جو ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو انجمن کے اجلاس میں نمازِ عصر کے بعد پڑھی گئی۔ یہ اگرچہ بانگ درا میں شامل نہ کی گئی، لیکن اپنے اچھوتے انداز اور کمال سوز واثر کے باعث اس درجہ مقبول ہوئی کہ اجلاس میں یتیموں کی امداد کے لیے روپوں کی بارش ہونے لگی، آنسوؤں کے دریا بہہ گئے اور نظم کی ایک ایک مطبوعہ کاپی چار چار روپے میں فروخت ہوئی (اقبال پر ایک نظر، ص ۴)۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد صدر اجلاس نے فرمایا: ''اگرچہ میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی'' (حمایتِ اسلام، انجمن کا ماہانہ رسالہ، بابت مارچ ۱۹۰۰ء، ص ۳۶)۔

اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئیں؛ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں ''یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے''، ۱۹۰۲ء میں ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے''، ۱۹۰۳ء میں ''فریاد امت بہ حضور سرور کائناتؐ'' موسوم بہ ''ابرِ گوہر بار'' اور ۱۹۰۴ء میں ''تصویرِ درد'' پڑھی گئیں۔ یکم اپریل ۱۹۰۱ء

سے مخزن کا اجرا ہوا اور اس میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' چھپی۔ اس کے ساتھ ہی نئے انداز کی نظموں اور غزلوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ یوں انجمن کے جلسوں اور مخزن کے صفحات کے ذریعے اقبال شعرائے ہند کی صفِ اوّل میں ممتاز مقام پر فائز ہو گئے۔

اگست ۱۹۰۵ء میں وہ ولایت گئے اور تین سال وہاں گزارے۔ فلسفے میں اعلیٰ ترین امتحان کیمبرج (انگلستان) اور میونخ (جرمنی) کی یونیورسٹیوں سے پاس کیے۔ پی ایچ۔ڈی کے لیے جو مقالہ لکھا تھا وہ *Development of Metaphysics in Persia* (''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا'') کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گیا۔ چھے ماہ کے لیے لنڈن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ عربی کے پروفیسر رہے۔ کیکسٹن ہال میں اسلام پر ایک لیکچر دیا، جو تمام مشہور اخباروں میں لفظ بہ لفظ شائع ہوا۔ وہیں مارچ ۱۹۰۷ء میں ایک نظم لکھی، جس میں یورپی تہذیب کی بے اساسی کے علاوہ اسلام کے درخشاں مستقبل کا اظہار کیا گیا تھا؛ اسی میں یہ بھی فرمایا تھا:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شُعلہ بار ہوگا

رہنمائی ملّت کا جو مقامِ بلند اقبال کے لیے روزِ ازل سے مقرر ہو چکا تھا یہ اس کی ابتدائی جھلک تھی۔

پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ وہ ولایت سے بیرسٹر بن کر آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ حکومت نے انھیں کالج کے کام کے ساتھ وکالت کی بھی اجازت دے دی۔ چونکہ وہ کالج میں مشغول ہونے کے باعث اوّل وقت میں کچہری نہ جا سکتے تھے لہٰذا ہائی کورٹ کے ججوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ ان کے مقدمات دن کے پچھلے حصّے میں پیش ہوا کریں۔ اٹھارہ ماہ بعد انھوں نے پروفیسری چھوڑ دی اور وکالت ہی کو بطورِ پیشہ اختیار کر لیا (مکاتیب اقبال، حصّۂ دوم، ص ۱۲۷) [یوں تدریس سے وہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے، اگرچہ پنجاب یونیورسٹی کی تعلیمی کمیٹیوں سے بعد میں بھی متعلق رہے]۔

اگرچہ شہرتِ عام کے باوجود اس زمانے میں انھیں وہ درجہ حاصل نہ تھا جو بعد میں انھیں ملا، بایں ہمہ ان کے قلب میں اپنے افکار کی ندرت کا احساس موجزن تھا۔ انھوں نے خود ۱۹۰۹ء میں لکھا: جن خیالات نے میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کر رکھا ہے عوام پر ظاہر ہوں تو مجھے یقین واثق ہے کہ موت کے بعد میری پرستش ہوگی، دنیا میرے گناہوں پر پردہ ڈالے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرے گی (مکاتیب اقبال، حصّۂ دوم، ص ۱۲۶)۔

دو تین سال کی خاموشی کے بعد ان کی قومی و ملّی نظموں کا زرّیں سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ ان میں سے ''شکوہ''، ''شمع اور شاعر''، ''خضرِ راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' انجمن حمایت اسلام کے مختلف جلسوں میں پڑھی گئیں۔ ''جوابِ شکوہ'' موچی دروازے کے باہر ایک جلسۂ عام میں سنایا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں فارسی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی، جو ان کی خاص تعلیمات کا پہلا جامع اور منظّم مرقّع تھی۔ تین سال بعد رموزِ بیخودی منظرِ عام پر آئی، جسے اسرارِ خودی کا تتمّہ سمجھنا چاہیے۔

لفظ ''خودی'' سے اقبال کی مراد ''قوّتِ نفس'' اور ''رفعتِ روح'' تھی، لیکن اس کے مروّجہ مفہوم سے بعض حلقوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اقبال کی رائے تھی کہ جب انسان میں خوے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوّتِ نفس اور رفعتِ روح ہو۔ اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوّتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معیّن کرتا ہے۔ اسی تعیّن کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ خودی کا کمال یہ ہے کہ احکامِ الٰہی اس میں بہ وجہ اتم سرایت کر جائیں، یہاں تک کہ اس کے ذاتی امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضاے الٰہی مقصود ہو جائے (مکاتیب اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۲۰۱، ۲۰۲)۔

اقبال اس خودی کے داعی تھے جو سچّی بے خودی، یعنی ہجرت الی الحق، کا نتیجہ ہوتی ہے۔ حقیقی اسلامی بے خودی یہ ہے کہ انسان ذاتی میلانات اور رجحانات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جائے۔ اس پابندی کے نتائج سے بھی اسے کوئی غرض نہ ہو، محض تسلیم و رضا اس کا شِعار بن جانا چاہیے (مکاتیب اقبال، حصّۂ دوم، ص ۵۹، ۶۰)۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے زیرِ اثر ہیں۔ انھیں عربی اسلام، اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آگاہی نہیں۔ ان کے ادبی اور مجلسی نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ اقبال اس حقیقی اسلام کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے جس کی اشاعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمائی (مکاتیب اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۲۴)۔

[اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ خودی کے ارتقا میں پیکار لازم ہے اور عشق کی قوّتِ تسخیر کی بھی بڑی اہمیّت ہے۔ خودی قوی سے قوی تر بھی ہوتی ہے مگر سوال اور خوف جیسی بیماریاں خودی کو ضعیف بھی کرتی ہیں۔ رموز بے خودی میں فرد و ملّت کے روابط اور ملّت اسلامیہ کی زمانی و مکانی لاانتہائیت کی بحث ہے]۔

اس کے بعد اقبال کی فارسی اور اردو نظموں کے مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوے۔ آخری مجموعہ ارمغانِ حجاز ان کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا، لیکن وفات کے بعد چھپا۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے چھے خطبے انگریزی زبان میں لکھے تھے، جو مدراس، میسور اور حیدرآباد (دکن) میں پڑھے گئے۔ بعد میں ایک کا اضافہ کیا۔

اقبال نے عملی سیاسیات میں بہت کم حصّہ لیا۔ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل انھیں پیہم مضطرب رکھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دماغی اعتبار سے مسلمانوں پر وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لُوتھر کے عہد سے ہوئی۔ اسلامی تحریک کی رہنمائی کے لیے کوئی بلند منزلت شخصیت نظر نہ آتی تھی لہٰذا اس تحریک کے مستقبل کو خطرے سے خالی نہ سمجھتے تھے (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۱۴۳)۔

مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی تڑپ موجزن تھی، لیکن ایسی شخصیّت کوئی نہ تھی جس کی زندگی قلوب پر مؤثّر ہوتی (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۲۳۹)۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان میں اسلام کے لیے نازک زمانہ آرہا ہے۔ حسّاس لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۲۴۹، ۲۵۰)۔ یہی احساس اقبال کو عملی سیاسیات میں کشاں کشاں لے آیا۔

سیاسیات میں ان کا نصب العین اسلامی مقاصد کے تحفّظ اور مسلمانوں کی بہبود کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کی پختہ رائے تھی کہ جو اسلامی جماعت مسلمانوں کی بہبود کی ضامن نہ ہو عوام کے لیے باعثِ کشش نہیں ہوسکتی (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ دوم، ص ۱۴)۔ مسلم لیگ کا مستقبل بھی ان کے نزدیک اس امر پر موقوف تھا کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ دوم، ص ۱۵)۔ پنجاب کی اہمیّت ان کے نزدیک بہت زیادہ تھی، اس لیے کہ یقین تھا، اسلام کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑی جائیں گی ان کی رزم گاہ پنجاب ہوگا (مکاتیب اقبال، حصّۂ دوم، ص ۷۹)۔

۱۹۲۶ء کے انتخابات میں وہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے رکن بنے۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے لیے صدر چنے گئے، جہاں انھوں نے ایک شہرۂ آفاق خطبہ پڑھا اور پاکستان کے لیے اس سرزمین میں پہلی مرتبہ صدا بلند کی۔ گول میز کانفرنس کے آخری دو اجلاسوں میں بھی شریک رہے۔ مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اسلامی نصب العین کے تحفّظ اور مسلمانوں کے قومی حقوق کے حصول کے لیے انھوں نے انتہائی استقامت سے کام لیا۔ ان کے نزدیک ہندی مسلمانوں کے کام اس وجہ سے بگڑتے رہے تھے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہوسکی تھی (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۳۹۷)۔ اقبال کی صدارت میں مسلم کانفرنس نے مسلمانانِ ہند میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کی جو آگے چل کر پاکستان کے نصب العین کی تکمیل کا ذریعہ بنی۔

اقبال نے اگرچہ شاعری ہی کے ذریعے شہرتِ عام اور بقاے دوام حاصل کی لیکن شاعری میں ادب محض بہ حیثیت ادب کبھی ان کا مطمحِ نظر نہ رہا۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔ اس غرض کے لیے جن خیالات کو مفید سمجھتے تھے بہ صورت نظم ظاہر کرتے رہے۔ وہ اپنا پورا وقت بیرسٹری یا ملازمت میں بسر کرتے تو اونچے سے اونچے عہدے پر پہنچ جاتے، لیکن ملّتِ اسلام کی خدمت کے جذبے نے انھیں مال وجاہ کی طرف متوجّہ نہ ہونے دیا۔ ۱۹۳۳ء میں سر راس مسعود اور سیّد سلیمان ندوی کے ساتھ ترتیبِ نصاب کے سلسلے میں حکومتِ افغانستان کی دعوت پر براہِ خیبر کابل گئے اور براہِ غزنی وقندہار واپس آئے۔ اسی سال دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس سے اگلے سال علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو ڈی۔لٹ (D. Litt.) کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

۷ جنوری ۱۹۳۵ء کو عید الفطر کے دن سویّاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا۔ بہی دانہ پینے سے زکام جاتا رہا تو گلا بیٹھ گیا (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۴۱۳)۔ علاج کے باوجود گلا صاف نہ ہوا تو ڈاکٹروں نے رائے دی کہ جو رگ حلق سے دل کی طرف جاتی ہے اس میں رَسولی پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا عملِ جرّاحی ضروری ہے یا بجلی کا علاج کرایا جائے۔ بجلی کے علاج سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوا، لیکن مرض کا ازالہ نہ ہوسکا۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء ساڑھے پانچ بجے شام کو ان کی بیگم کا انتقال ہوا۔ دو کم سن بچوں کی تربیت کی پریشانی نے صحّت پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ انھیں کھانسی اور دمہ شروع ہوگیا۔ کھانسی اٹھتی تو بیہوش ہوجاتے (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۴۱۵)۔ گلا بیٹھتے ہی وکالت ختم ہوچکی تھی۔ والیِ بھوپال نے مئی ۱۹۳۵ء میں ان کے لیے پانسو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرّر کردیا (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۳۶۲)۔

صحّت کی طرف سے جب مایوسی ہوگئی تو انھوں نے بچوں کی تولیت بعض عزیزوں اور دوستوں کو سونپ دی۔ دسمبر ۱۹۳۷ء سے بیماری زور پکڑ گئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے علم وحکمتِ اسلامی کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ شاہی مسجد کے بیرونی احاطے میں صدر دروازے کے قریب انھیں سپردِ خاک کیا گیا اور اس پر ایک خوب صورت مقبرہ تعمیر ہوا۔ تعویذ حکومت افغانستان نے تین لاکھ روپے کے صرف سے تیار کرا کے بطور خراجِ عقیدت بھیجا۔

اقبال کی پوری زندگی انتہائی سادگی، خودداری اور استغنا میں بسر ہوئی؛ کبھی کسی سے سوال نہیں کیا، کبھی کسی کا احسان نہ لیا۔ اس لحاظ سے وہ فقرِ غیور کا ایک نادر پیکر تھے۔ ان کی مجلس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے تھے۔ ادنیٰ و اعلیٰ، امیر وغریب، شناسا و ناشناسا کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ مسلمان نوجوانوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ اسلام کے لیے اپنی دلی تڑپ کو نوجوانوں میں منتقل کردیں۔ اسلام کی حقّانیّت کا یقین اور ملّتِ اسلامیہ کا درد ان کی رگ وپے میں جاری وساری تھا۔ ان کے ہاں افکار کی جو ثروت پائی جاتی ہے اس کی مثال اسلامی شعر وادب میں کم ہی ملے گی۔ اقبال سے سات سو سال قبل رومی نے شرق و غرب، ایران ویونان اور اسلام وعرب کے بہترین افکار کو اپنی مثنوی اور دیوان میں منتقل کردیا تھا۔ اس کے بعد چھے سات صدیوں میں جتنے جدید زاویہ ہاے نگاہ اور افکارِ نو پیدا ہوے اقبال ان سے بوجہ اتمّ بہرہ مند ہوے اور انھوں نے ایک بالغ نظر محقّق کی حیثیت سے اس سرمائے سے فائدہ اٹھا کر حقیقی اسلامی زندگی کی قدریں انتہائی پُرتاثیر انداز میں اس طرح واضح کردیں کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے صدیوں تک روشنی کا بلند ترین مینار بنے رہیں گے۔

اقبال کے نظریۂ حیات کا خلاصہ چند سطروں میں یہ ہے:

(۱) اقبال اسلام کے سچّے معتقد اور اسلامی تہذیب کے بہت بڑے داعی تھے۔ خدا اُن کے نزدیک خلّاقِ ازلی ہے۔ اس کی خلّاقی ہر لحہ بروے کار آتی رہتی ہے۔ زندگی سراپا خلّاقی ہے [انسان اگر اپنے مقصد سے آگاہ ہوجائے تو وہ اپنی اس خلّاقی کی جہت متعین کرسکتا ہے]۔

(۲) نوعِ انسانی کے ارتقا کا سدرۃ المنتہیٰ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ بابرکات تھی۔ ختمِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ زندگی کے تمام بنیادی حقائق خدا کی آخری کتاب قرآن حکیم میں محفوظ کر دیے گئے اور لامتناہی ترقّی کی راہیں کھول دی گئیں؛ ملّت اسلامیہ کو اجتہاد کا دروازہ بند نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اصل زندگی اور اس کا مقصد جہادِ پیہم اور اجتہادِ مسلسل ہے۔ زندگی کے سانچے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن نئی تشکیلِ افکار اور تعمیرِ اقدار میں ہمیشہ ہر ارتقا پر حاوی رہے گا۔

(۳) انسان کو خارجی اور باطنی فطرت دونوں کی تسخیر سے اپنی معرفت اور قدرت میں اضافہ کرنا چاہیے۔

(۴) اقبال تہذیب اور تمدّنِ افرنگ پر شدّت سے تنقید کرتے ہیں۔ وہ یورپ کی محدود عقلیّت اور مادّیت سے بیزار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی یورپ کی طرح علوم وفنون میں ترقی کریں، لیکن مادّی تمدّن میں روحانی اندازِ تفکّر وتاثّر کی آمیزش سے اسے کامل انسانیت کا آئینہ دار بنائیں۔

(۵) اقبال زندگی کے ہر دائرے میں صرف اسلامی نظام کی پابندی کے داعی ہیں۔

(۶) اقبال اسلام کے ارکان وشعائر کی پابندی تعمیر وتکمیلِ سیرت کے لیے لازم قرار دیتے ہیں، لیکن باطن کو ظاہر پر بہرحال ترجیح دیتے ہیں۔

(۷) اسلامی تعلیم میں غیر اسلامی تصوّف اور فرار عن الحیات کے جو عناصر داخل ہو گئے تھے اقبال مسلمانوں کو ان سے احتراز کی دعوت دیتے ہیں، لیکن وہ تصوّف کے اس صحیح جوہر کے قائل ومعتقد ہیں جو رومی جیسے اکابر صوفیہ میں پایا جاتا ہے۔

(۸) فلسفیانہ حیثیت سے اقبال تخلیقی ارتقا پسند (creative evolutionist) ہیں۔ اس لحاظ سے انھیں برگساں (Bergson) کا ہم نوا سمجھنا چاہیے۔ وہ نٹشے (Nietzsche) کے بھی مدّاح ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ کبریائی کا صحیح تصوّر قائم نہ کر سکنے کے باعث وہ توازن کھو بیٹھا؛ اسے کوئی مرشدِ کامل نہ ملا۔

(۹) اقبال کا خاص مضمون خودی کی معرفت اور تکمیل ہے۔ عرفانِ نفس سے عرفانِ ذاتِ الٰہی کی طرف راستہ کھلنے کا مضمون پرانا تھا؛ اقبال نے اس کی تشریح وتوضیح اس انداز سے کی جو اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتی۔

(۱۰) خودی کے علاوہ اقبال کا خاص مضمون عشق ہے، جو ان کے نزدیک ملکۂ خلّاقی ہے۔ منطقِ عقل کے مقابلے میں عشق ہی حقیقی معرفت کا سرچشمہ ہے۔ صوفیانہ حکمت ووجدان کا یہ مضمون بھی پرانا تھا؛ اقبال کے دل ودماغ اور شاعری کے کمال نے اس میں غیر معمولی وسعت، تازگی اور گہرائی پیدا کر دی۔

افکار کے لحاظ سے اقبال ملّتِ اسلامیہ کے عظیم ترین رہنماؤں میں شمار ہونے کے حق دار ہیں۔ ان کے افکار وتاثّرات مسلمانوں کے شعور اور تحت الشّعور میں جاگزیں ہیں۔ انھیں جمود سے نکال کر حریّت وتحقیق کے راستے پر ڈالنے میں جتنی کامیابی اقبال کو ہوئی ان کے معاصرین میں سے کسی مفکّر اور رہنما کو نہ ہوئی۔ ان کا اثر پاک وہند سے نکل کر افغانستان اور ایران کے علاوہ عربی اور فرنگی دنیا تک پہنچ چکا ہے۔ وہ ان شخصیتوں میں سے ہیں جو صدیوں کے بعد فضائے انسانیت کو منوّر کرتی ہیں۔

تصانیف:

(۱) بانگ درا (منتخب اردو نظموں کا مجموعہ): [۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۶۵ء تک تینیس ایڈیشن چھپے]؛

(۲) بال جبریل (اردو): [جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۵ء تک چودہ مرتبہ چھپی]؛

(۳) ضرب کلیم (اردو): جولائی ۱۹۳۶ء سے جولائی ۱۹۶۵ء تک بارہ مرتبہ چھپی؛

(۴) اسرارِ خودی (فارسی): پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں، دوسری مرتبہ ۱۹۱۹ء میں چھپی۔ اس کا منظوم اردو ترجمہ ترجمانِ اسرار کے نام سے مسٹر جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن نے اور انگریزی ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے شائع کیا؛

(۵) رموزِ بیخودی (فارسی): پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۱۸ء میں چھپی۔ پھر اسرار و رموز کو یک جا کر دیا گیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۰ء میں تیسری مرتبہ شائع ہوا [اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی ۱۹۶۴ء تک آٹھ بار چھپی]؛

(۶) پیامِ مشرق (فارسی): جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے (Goethe) کے ''مغربی دیوان'' کا جواب [۱۹۱۲ء سے ۱۹۶۳ء تک دس ایڈیشن نکلے]؛

(۷) زبورِ عجم (فارسی): مع گلشن راز جدید و بندگی نامہ [جون ۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۸ء تک چھے بار چھپی]؛

(۸) جاوید نامہ (فارسی): اطالوی شاعر دانتے (Dante) کی *Divine Comedy* (''طربیۂ خداوندی'') کا جواب [۱۹۳۲ء سے ۱۹۶۴ء تک پانچ ایڈیشن نکلے]؛

(۹) مسافر (فارسی): سفرنامۂ افغانستان، پہلی بار آرٹ پیپر پر تھوڑی سی تعداد میں چھاپی گئی؛

(۱۰) پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (فارسی): یہ مثنوی پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں مع مسافر شائع ہوئی [۱۹۶۵ء تک پانچ ایڈیشن نکلے]؛

(۱۱) ارمغانِ حجاز (فارسی): اس کے ساتھ ابلیس کی مجلس شوریٰ اور چند دیگر اردو نظمیں بھی شامل ہیں [نومبر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۴ء تک آٹھ ایڈیشن شائع ہوے]؛

(۱۲) *The Development of Metaphysics in Persia* (فلسفۂ عجم): پہلی مرتبہ لنڈن میں چھپی (۱۹۰۸ء)، دوسری مرتبہ بزمِ اقبال کے زیرِ اہتمام لاہور میں۔ اس کا اردو ترجمہ حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوا (۱۹۳۶ء)؛

(۱۳) *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* (تشکیلِ جدیدِ الٰہیات اسلامیہ): یہ چھے لیکچروں کا مجموعہ ہے۔

[پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں لاہور میں چھپا، دوسری مرتبہ ۱۹۳۴ء میں اوکسفر ڈ یونیورسٹی پریس میں، معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مع ساتویں لیکچر کے، جو پہلی طباعتوں میں شامل نہ تھا، تیسری مرتبہ لاہور میں؛ اردو ترجمہ از سیّد نذیر نیازی، مطبوعۂ لاہور ۱۹۵۷ء]؛

(۱۴) مکاتیب کے مختلف مجموعے.

ان کے علاوہ اقبال کے متعدّد انگریزی اور اردو مضامین اور کئی لیکچر مختلف رسالوں میں الگ شائع ہوے.

بعض کتابوں کے خاکے ان کے ذہن میں تھے، مثلاً:

(۱) فقہ اسلام کے متعلق مفصّل کتاب بہ زبان انگریزی، جس کے لیے مصر و شام و عرب سے مواد فراہم کیا تھا (شاد اقبال، ص ۴۶ و مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۳۲۰).

(۲) رامائن کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کا خیال (شاد اقبال، ص ۱۰۲).

(۳) ملٹن (Milton) کی تقلید میں لمبی نظم لکھنے کا ارادہ (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۲۱).

(۴) قرآن حکیم پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں حواشی تیار کرنے کا ارادہ؛ اس کتاب کو وہ مسلمانانِ عالم کے لیے اپنی بہترین پیشکش سمجھتے تھے (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۳۵۷ و ۳۵۸ و ۳۶۱ و ۳۶۲).

(۵) کیمبرج کی تاریخِ ہند (*Cambridge History of India*) کے لیے اردو ادب پر مضمون (مکاتیب اقبال، حصّۂ دوم، ص ۴۳).

(۶) تصوّف کی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ (مکاتیبِ اقبال حصّۂ دوم، ۵۱ و ۵۲).

ان کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی مضامین ہیں.

مآخذ: متن میں مندرجہ کتابوں کے علاوہ (۱) اقبال کی اپنی تصانیف؛ (۲) مولوی عبدالرزّاق حیدرآبادی: کلیاتِ اقبال، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۴۳ھ؛ (۳) انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں کی روئدادیں؛ (۴) کشمیری میگزین کی جلدیں، بابت ۱۹۰۸ و ۱۹۰۹ء؛ (۵) شاد اقبال، مرتبۂ سیّد محی الدین قادری زور، حیدر آباد (دکن) ۱۹۴۲ء؛ (۶) اقبالنامہ، مرتبۂ شیخ عطاء اللہ، ۲ جلد، لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۷) چراغ حسن حسرت: اقبالنامہ، تاج کمپنی، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۸) محمد طاہر فاروقی: سیرت اقبال، لاہور ۱۹۳۹ء؛ (۹) احمد الدین: اقبال، لاہور ۱۹۲۶ء؛ (۱۰) مقالات یوم اقبال، مرتبۂ انٹر کالجیٹ بردر ہڈ، لاہور ۱۹۳۸ء؛ (۱۱) مقالات یوم اقبال، مرتبۂ انٹر کالجیٹ بردر ہڈ، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱۲) محمد الدین فوق: مشاہیر کشمیر، لاہور ۱۹۳۰ء؛ (۱۳) محمود نظامی: ملفوظاتِ اقبال، لاہور [تاریخ درج نہیں]؛ (۱۴) یوسف حسین: روحِ اقبال حیدرآباد (دکن) ۱۹۴۱ء؛ (۱۵) شیخ اکبر علی: اقبال، اس کی شاعری اور پیغام، لاہور ۱۹۴۶ء؛ (۱۶) رئیس احمد جعفری: دید و شنید، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱۷) عارف بٹالوی: اقبال اور قرآن، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۱۸) عبدالرحمٰن طارق: جہانِ اقبال، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۱۹) وہی مصنّف: اشاراتِ اقبال، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۲۰) وہی مصنّف: فردوسِ معانی، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۲۱) وہی مصنّف: معارفِ اقبال، لاہور؛ (۲۲) وہی مصنّف: روحِ مشرق (از ۱۷ - ۲۲)؛ (۲۳) میر ولی الدین: رموزِ اقبال؛ (۲۴) بشیر مخفی: عرفانِ اقبال؛ (۲۵) غلام دستگیر: آثارِ اقبال، ۱۹۴۴ء؛ (۲۶) انیس احمد جعفری: اقبال امامِ ادب؛ (۲۷) سیّدہ اختر: اختر و اقبال؛ (۲۸) محمد بخش مسلم: اقبال اور پاکستان؛ (۲۹) عزیز احمد: اقبال ــــ نئی تشکیل؛ (۳۰) بشیر الحق: اصلاحات اقبال؛ (۳۱) طاہر فاروقی: بزمِ اقبال، آگرہ ۱۹۴۴ء؛ (۳۲) اشفاق حسین: مقامِ اقبال، ۱۹۴۵ء، (۳۳) سعید صدیق: اقبال کے خطوط جناح کے نام، [تاریخ درج نہیں]؛ (۳۴) شیر احمد خاموش: دانائے راز، ۱۹۴۰ء؛ (۳۵) ابو محمد مصلح: قرآن اور اقبال؛ (۳۶) ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی: اقبال کی کہانی؛ (۳۷) خلیفہ عبدالحکیم: اقبال اور ملّا، بزمِ اقبال، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۳۸) وہی مصنّف: رومی، نطشہ اور اقبال؛ (۳۹) عبدالسّلام ندوی: اقبال کامل، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء؛ (۴۰) رسالۂ اردو، اقبال نمبر ۱۹۳۸ء؛ (۴۱) رسالۂ نیرنگِ خیال، اقبال نمبر؛ (۴۲) نواب سر ذوالفقار علی خان: *A Voice from the East or the Poetry of Iqbal*، لاہور ۱۹۲۲ء؛ (۴۳) عبداللہ انور بیگ: *The Poet of the East*، لاہور ۱۹۳۹ء؛ (۴۴) خواجہ غلام السّیدین: *Iqbal's Educational Philosophy*، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۴۵) غلام دستگیر رشید: فکرِ اقبال، حیدرآباد (دکن) ۱۹۵۶ء؛ (۴۶) ملک نذیر احمد: کلیدِ اقبال، بہاولپور ۱۹۶۳ء؛ (۴۷) سید احتشام حسین: اقبال بہ حیثیت شاعر اور فلسفی، لکھنؤ ۱۹۵۶ء؛ (۴۸) اختر صدیقی: تأثرات اقبال، لاہور ۱۹۴۹ء؛ (۴۹) فلسفۂ اقبال، مرتبۂ بزمِ اقبال، لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۵۰) غلام دستگیر رشید: حکمتِ اقبال، حیدرآباد (دکن) ۱۹۴۵ء؛ (۵۱) رئیس احمد جعفری: اقبال اور عشقِ رسول، لاہور ۱۹۵۶ء؛ (۵۲) سعید احمد رفیق: اقبال کا نظریۂ اخلاق، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۵۳) عبدالرحمٰن طارق: جوہر اقبال، لاہور؛ (۵۴) ظفر احمد صدیقی: حکمتِ کلیمی، علی گڑھ ۱۹۵۵ء؛ (۵۵) خلیفہ عبدالحکیم: فکرِ اقبال، لاہور، تاریخ درج نہیں؛ (۵۶) عبدالمجید سالک: ذکرِ اقبال، لاہور [تاریخ درج نہیں]؛ (۵۷) سیّد محمد عبداللہ: مقامات اقبال، لاہور ۱۹۵۹ء؛ (۵۸) محمد شاہ: اقبال پر ایک نظر، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۵۹) سیّد وحید الدین: روزگارِ فقیر، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۶۰) نصیر احمد ناصر: اقبال اور جمالیات، کراچی ۱۹۶۴ء؛ (۶۱) عبدالمالک آروی: اقبال کی شاعری، آرہ ۱۹۳۸ء؛ (۶۲) محمد یوسف خان سلیم چشتی: تعلیماتِ اقبال، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۶۳) لطیف فاروقی: اقبال اور آرٹ، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۶۴) سیّد محمد طفیل احمد بدر امروہوی: یادگارِ اقبال، لاہور ۱۹۴۵ء؛ (۶۵) سید عبدالواحد: *Introduction to Iqbal*، کراچی ۱۹۵۲ء؛ (۶۶) وہی مصنّف: *Iqbal, his Art and Thought*، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۶۷) شیخ اکبر علی: *Iqbal, his Poetry and Message*، لاہور ۱۹۳۲ء؛ (۶۸) آربری (A. J. Ed. Arberry): *Notes on Iqbal's Asrar-i-Khudi*، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۶۹) بوسانی (A. Bausani): *Dante and Iqbal*، در *Crescent and Green*، لنڈن ۱۹۵۵ء؛ (۷۰) وہی مصنّف: *Iqbal, his Philosophy of Religion and the West*، در *Crescent and Green*، لنڈن ۱۹۵۵ء؛ (۷۱) بشیر احمد ڈار: *Iqbal and Post-Kantian Voluntaryism*، لاہور ۱۹۵۶ء؛ (۷۲) وہی مصنّف: *Study in Iqbal's Philosophy*، لاہور ۱۹۴۴ء؛ (۷۳) عشرت حسن انور: *Metaphysics of Iqbal*، لاہور؛ (۷۴) اقبال سنگھ: *Ardent Pilgrim*،

لنڈن ۱۹۵۱ء؛ (۷۵) جمیلہ خاتون: *Place of God, Universe and Man in Philosophical System of Iqbal*، کراچی؛ [(۷۶) سیّد نذیر نیازی: مکتوباتِ اقبال، مطبوعۂ اقبال اکادمی، کراچی ۱۹۵۷ء؛ (۷۷) وہی مصنّف: اقبال کا مطالعہ، لاہور ۱۹۴۰ء؛ (۷۸) وہی مصنّف: در رسالۂ طلوعِ اسلام، ۱۹۳۵ء، شمارہ اوّل۔ اقبال کے متعلّق مختلف جرائد میں جو مضامین اور مستقل کتب لکھی گئیں ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (۷۹) خواجہ عبدالوحید: *A Bibliography of Iqbal*، کراچی ۱۹۶۶ء، جس میں دیگر کتابیات کا حوالہ موجود ہے]؛ (۸۰) عاشق حسین بٹالوی: اقبال کے آخری دو سال، اقبال اکادمی، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۸۱) سیّد عبدالواحد: مقالاتِ اقبال، لاہور.

(خلیفہ عبدالحکیم و غلام رسول مہر)

---

* **اِقْتِباس**: اقتباس کے معنی ہیں جلتی ہوئی آگ سے "قَبَس"، یعنی شعلہ یا انگارہ یا روشنی (قَبَس) لینا۔ لفظ قَبَس قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً (۲۰ [طٰہٰ]: ۱۰؛ ۲۷ [النّمل]: ۷؛ ۵۷ [الحدید]: ۱۳)، یوں اس کے معنی علم حاصل کرنے کے بھی ہو گئے (قَبَس الْعِلْم)؛ علمِ بلاغت میں اصطلاحًا اس کا مطلب ہے قرآن یا حدیث سے مخصوص الفاظ نقل کرنا، یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ کہاں سے نقل کیے گئے ہیں اگر ماخذ ظاہر کر دیا جائے اور اقتباس نظم سے ہو تو اسے "عُقْد" کہتے ہیں، یعنی گرہ لگانا۔ اگر یہ اقتباس منظوم ہو، قرآن یا حدیث کی کوئی عبارت نہ ہو اور اسے نظم میں لایا جائے، تو تضمین یا اِدخال کہلاتا ہے۔ اقتباس میں الفاظ کا اصل مفہوم قائم بھی رکھا جا سکتا ہے اور اسے بدل بھی سکتے ہیں۔ اس کے جواز میں بہت اختلاف رہا ہے۔ مالکیّہ اسے بالعموم ناجائز قرار دیتے تھے، لیکن دوسروں نے بعض شرائط کے تحت اسے جائز قرار دیا ہے، مثلاً وعظ، دعا اور حمد و ثنا میں (یعنی سنّتِ نبویہ کے مطابق)، لیکن اشعار میں اسے مکروہ قرار دیا گیا ہے؛ اَور لوگوں نے اس قسم کے اقتباس کو اشعار میں بھی جائز بتایا ہے، بشرطیکہ صحیح جذبے کے تحت کیا گیا ہو، لیکن جن الفاظ کا کنایہ اللہ کی طرف ہوتا ہے انھیں توڑ مروڑ کر مخلوق کے لیے استعمال کرنا انتہائی مذموم سمجھا گیا ہے... ۔الفہرست (ص ۱۰۴، س ۱۲) میں المدائنی (م ۲۱۵ھ یا ۲۲۵ھ) کی ایک کتاب المُقْتَبِس کا حوالہ ہے [یعنی کتاب المقتبس فی اخبار النحویّین البصریّین، لیکن اقتباس بطور اصطلاح اس کا موضوع نہیں ہے، (آ، عربی، بذیل مادّہ] اور ایسے ہی مَرْزبانی کی ایک کتاب کا (ص ۱۳۳، س ۲۵)، لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا ان کا اقتباس یہی اصطلاحی اقتباس ہے۔ اِختیارالدین (م ۹۲۸ھ، براکلمان (Brockelmann): تکملہ، ۲: ۲۵۶) کی کتاب اساس الاِقتباس (آستانہ ۱۲۹۸ھ) میں اصل اصطلاح کو وسعت دے کر اس میں امثال، اشعار بلکہ مختصر حکایات بھی شامل کر لی گئی ہیں [لیکن یہ بھی اصولِ ادب کے ماتحت ادبی اقتباسات ہی کا ایک مجموعہ ہے، یعنی فقط لغوی اقتباسات، (آ، عربی بذیلِ مادّہ].

مآخذ: (۱) [تھانوی:] کشّاف اصطلاحات الفنون، ص ۱۱۸۷ (کلکتہ ۱۸۶۲ء)؛ (۲) Mehren: *Rhetorik der Araber*، متن، ص ۱۰۰، ۱۳۶؛ ترجمہ، ص ۱۴۰، ۲۰۱؛ (۳) گارساں دتاسی، (Garcin de Tassy): *Rhétorique*، et Prosodie، ص ۲۰۲؛ (۴) لِسان، ۸: ۴۸.

(D. B. MacDonald میکڈونلڈ)

اَقْچہ: [ت] اَقْچَہ [= چھوٹا سفید]، یہ چاندی کے ایک سکّے کا نام ہے۔⊗ اصفہانی سلجوقی بھی اپنے سکّے کو اقچہ کہتے تھے [الرّاوندی: راحۃ الصُدُور، ص ۳۰۰]۔ آلِ عثمان نے اپنے سکّے کا نام درہم اور دینار نہ رکھا، جو نہ صرف گزشتہ بلکہ ہم عصر حکومتوں میں بھی رائج تھا، بلکہ انھوں نے چاندی کا جو سکّہ پہلے پہل چلایا اسے "اَقْچۂ عثمانی" کا نام دیا، جس کے معنی تھے "سفید عثمانی سکّہ"۔ اوّلین اَقْچۂ عثمانی جو ضرب ہوا (دیکھیے مادّۂ اورخان)۔ ۸٫۳ گرام (۶ قیراط) وزن کا تھا، [اس میں چاندی ۹۰ فی صد تھی اور اس کا قطر ۱۸ ملی میٹر تھا] لیکن اقچہ کا وزن ہمیشہ یکساں نہ رہا اور وقت گزرنے پر اس کی قیمت گر گئی (دیکھیے اسمٰعیل غالب: تقویم مسکوکات عثمانیہ، ج ۲، استانبول ۱۳۰۷ھ)۔ تاریخ ترکیہ میں اس کا ذکر مختلف ناموں سے آیا ہے۔ زُیُوفْ اَقْچہ، کِرْپِک اَقْچہ، قِرْ ل اَقْچہ، میخانہ اَقْچہ سی، چل اَقْچہ وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں اَقْچہ کا وزن اور قیمت ظاہر کرتی ہیں۔ تانبے کے سکّے کو چُرُک اَقْچہ (سڑا ہوا روپیہ) کہتے تھے.

اب سے کوئی پچاس سال پہلے تک زرِ نقد کہنے کو حسب ذیل اجزا و اضعاف پر منقسم تھا۔ یک قُرُش = ۴۰ پارہ، یک پارہ = ۳ اَقْچہ، یک اَقْچہ = ۳ پُول ترکی۔ زر کا معیاری سکّہ صرف قُرُش قرار دیے جانے سے پہلے (دیکھیے مادّۂ سلیمان ثانی) یہ کام اقچہ سے لیا جاتا تھا۔ یک کیسۂ زر پندرھویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں تیس ہزار اَقْچہ کا، سولھویں صدی کے وسط میں بیس ہزار اَقْچہ کا، سترھویں صدی کے وسط میں چالیس ہزار اَقْچہ کا اور اٹھارھویں صدی کے آغاز میں پچاس ہزار اَقْچہ کا ہوا کرتا تھا، لیکن اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہوتے ہوتے ایک کیسہ اسّی ہزار اَقْچہ کا ہو گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں پانصد قُرُوش کو کِیسۂ اَقْچہ ("کیسحقہ") کا خاص نام دیا جاتا تھا.

پندرھویں صدی کے بعد اَقْچہ کا لفظ نقدی کے لیے استعمال ہونے لگا اور سکّے کے بجائے بولا جاتا تھا، مثلاً لالہ یولرگوچ اَقْچہ سی، اَوَرِیز اَقْچہ سی، اَقْچہ کِیسَہ سی، اَقْچہ تَخْتَہ سی، اَق اَقْچہ، گِچر اَقْچہ، کَلْپ اَقْچہ وغیرہ۔ دوسرے ترک ملکوں میں بھی اَقْچہ کا لفظ زرِ نقد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (اس کی قیمتوں کے لیے دیکھیے Radloff) یورپ کے لوگ اَقْچہ کا ترجمہ Aspre کرتے ہیں، جو یونانی لفظ [aspron سے ماخوذ] ہے، اس کے معنی ہیں سفید [دورِ تنظیمات [رک بآں] میں اَقْچہ کو اوقاف کے معاملات کے سوا بلکہ بالآخر ان میں بھی بالکل ترک کر دیا گیا].

مآخذ: (۱) اسمٰعیل غالب: تقویم مسکوکات عثمانیہ، استانبول ۱۳۰۷ھ؛ (۲) علی: عثمانلی امپراطور لغنون الک سکّہ سی (در *TOEM*، سال ہشتم، ۴۸: ۳۶۰)؛ (۳) علی: فاتح زَمانِینده اَقْچه نه اِیدِی (در *TOEM*، سال ہشتم، ج ۴۹ و سال ہشتم، ج ۶۲)؛ (۴) آ، لائڈن، ۴: ۸۶؛ (۵) خلیل اِدْہم: مسکوکاتِ عثمانیہ، استانبول ۱۳۳۴ھ؛ (۶) اسمٰعیل حَقّی اُوزُون چَرْسِیلی: تاریخ لغت (زیرِ طبع)؛

(۷) راونڈی: راحۃ الصُّدُور و آیۃ السُّرُور، لنڈن ۱۹۲۱ء؛ (۸) باش وکالت عَرْصَعِی وِی، امیری تصنیفی، احمد ثالث دوری، شمارہ ۱۴۲۴۰؛ (۹) ابن الامین تصنیفی: خارجیہ، شمارہ ۱۳۲۹[(۱۰) سیّد مصطفٰی نوری: نتائج الوُقُوعات، ۱:۶۶، ۱۴۸ و ۲:۹۹ ببعد و ۳:۱۰۶؛ (۱۱) جودت پاشا؛ تاریخ، ۱:۲۵۴ ببعد؛ (۱۲) لین پُول (Lane-Poole): *The Coins of the Turks in the British Museum*].

(اسمٰعیل حقّی اوزون چَرْسِلی)

---

* **اَقْرا باذِیْن**: یا قَرَابَاذِین، مشتق از سریانی گرافاذِیْن، جو یونانی لفظ، γραφ'ιδιον بہ معنی "مختصر مقالہ" سے منقول ہے۔ عربوں نے اسے ترکیبِ ادویہ پر رسالہ جات یا فارماکوپیا (pharmacopoeias) کا عنوان بنالیا۔ مفرد دوائیں، جن سے مرکبات تیار ہوتے تھے، الادویۃ المفردۃ [رک بآن] کہلاتی تھیں۔

عمل دوا سازی: شفاخانوں میں دواسازی کی بابت ہدایات بہت قدیم زمانے سے تعلیم کا ایک اہمّ جزو خیال کی جاتی تھیں۔ البیرونی کی کتاب الصَّیْدَلَۃ فی الطبّ سے پتا چل سکتا ہے کہ بڑے شِفاخانوں میں طبّی اساتذہ کے ساتھ دوا ساز بھی موجود رہتے تھے۔ نہ صرف یونانی بلکہ ایرانی و ہندی الاصل ادویۂ مفردہ میں بھی تیزی سے اضافہ اسی کا متقاضی تھا کہ دواسازی کو طبابت سے ایک علیحدہ پیشہ قرار دیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ معمولی طبابت میں طبیب خود ہی نسخے لکھتا ہو اور خود ہی مرکبات تیار کرتا ہو (قب C. Elgood: *A Medical History of Persia and the Eastern Caliphate*، کیمبرج ۱۹۵۱ء، ص ۲۷۲ ببعد)۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ ادویۂ مفردہ دوافروشوں سے خریدی جاتی تھیں (قب العطّار) پھر ان سے مرکبات تیار کیے جاتے۔ محتسب کو خاص خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کن کن طریقوں سے دواؤں میں آمیزش کی جاتی ہے (قب ابن الاُخُوۃ: مَعَالِم القُرْبَۃ، طبع Levy، باب ۴۵)۔ بعض مفرد ادویہ کے بدل تیار کر لینے کی تصدیق الکِندی کے بیان سے ہو جاتی ہے، جس نے ایک کتاب کم یاب دواؤں کے بدل تیار کرنے کی ترکیبوں پر لکھی ہے (کیمیاء العِطر و التصعیدات، طبع K. Garbers، لائپزگ ۱۹۴۸ء)۔

فن دواسازی پر تصنیفات: جالینوس کی کتاب *De medicamentorum compositione secundum locos et genera* کا ترجمہ حُنَیْن بن اسحٰق سُریانی میں کر چکا تھا، حُبَیْش نے اس کا ترجمہ سریانی سے عربی میں کیا اور کتاب ترکیب الأدویۃ اس کا نام رکھا (قب G. Bergsträsser: *Ḥunain ibn Isḥāq über die Syrischen und arabischen Galen-übersetzungen*، لائپزگ ۱۹۲۵ء، ص ۲۳ ببعد)۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جرّاحوں کے لیے ضروری تھا کہ اپنا فنّی کام شروع کرنے سے پیشتر اس کتاب پر پورا پورا عبور حاصل کر لیں (قب ابن الاُخُوۃ، باب ۴۵)۔

دواسازی کی سب سے پہلی کتاب جس نے خلافتِ اسلامیہ میں قبولِ عام حاصل کیا ایک مسیحی طبیب سابُور بن سَہْل (م ۲۵۵ھ/ ۸۶۹ء) کی تصنیف تھی، جو شفاخانۂ جُندی سابور کے اطبا میں سے تھا۔ ابن النّدیم (الفہرست، ص ۴۹۷) کا بیان ہے کہ یہ کتاب بائیس ابواب پر اور ابن ابی اُصَیْبِعہ (عیون الأنباء، ۱: ۱۶۱) کہتا ہے کہ سترہ ابواب پر مشتمل تھی۔ امین الدولۃ ہِبَۃُ اللہ بن التِّلْمِیذ (م ۵۶۰ھ/ ۱۱۶۵ء) کی اقرابادین شائع ہونے سے پہلے سابُور بن سَہْل ہی کی کتاب عام استعمال میں تھی۔ ابن التِّلْمِیذ خلیفہ المُکْتَفی اور اس کے جانشین المُسْتَنْجِد کا درباری طبیب اور بغداد کے عَضُدی دارالشّفا میں ملازم تھا۔ بیس باب کی اس اقرابادین کے علاوہ اس نے المُوجَز البیمارستانی کے نام سے ایک مختصر کتاب معمولی شفاخانوں میں استعمال کے لیے بھی تیار کر دی تھی (ابن ابی اُصَیْبِعہ، ۱: ۲۷۶)۔ ان تصانیف یا ان کے بعض بعض حصّوں کے قلمی نسخے ہم تک پہنچے ہیں (براکلمان (Brockelmann)، ۱: ۲۶۴ و تکملہ، ۱: ۸۸۸) اور اسی طرح مشہور طبیب و حکیم ابوبکر محمد بن زکریّا الرّازی کی تصنیف کردہ اقرابادین کے بھی مخطوطات موجود ہیں (براکلمان، ۱: ۲۶۹)۔ مشرق میں ترکیب الادویہ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بدرالدین محمد بن بَہْرام القلانِسی کی اقرابادین بھی قابل ذکر ہے، جو ۵۹۰ھ/ ۱۱۹۴ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں، جس کے کئی قلمی نسخے ہم تک پہنچے ہیں، مصنّف نے الرّازی کی الحَاوی اور طبِ المَنْصُوْری، بوعلی سینا کی قانون اور دوسری کتابوں کے اقتباسات دیے ہیں (ابن ابی اُصَیْبِعہ، ۲: ۳۱)۔ نجم الدّین محمد بن الیاس الشِیرَازی (م ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء) کی گراں قدر طبّی تالیف کے پانچویں حصّے کو، جس میں ادویۂ مرکّبہ کا ذکر ہے، F. F. Guigues نے ترتیب و تہذیب کے بعد شائع کرایا تھا (مقالۂ تحقیقی، پیرس ۱۹۰۲ء)۔

مصر میں یہودی طبیب موسٰی [یاولوی] بن العازار (Moses b. Eleazar) نے ایک اقرابادین فاطمی خلیفہ المُعِزّ کے لیے لکھی تھی (ابن ابی اُصَیْبِعہ، ۲: ۸۶)۔ مصر، شام اور عراق کے شفاخانوں میں الدستور البیمارستانی مصنّفۂ ابوالفضل بن ابی البیان الاسرائیلی (شائع کردۂ P. Sbath، در *BIE*، ۱۹۳۳ء، ص ۱۳-۷۸) عام طور سے مستعمل رہی، یہاں تک کہ اس کی جگہ منہاج الدکّان مصنّفۂ ابن العطّار الاسرائیلی نے لے لی، جو ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء میں بمقام قاہرہ شائع ہوئی (براکلمان، ۱: ۶۴۸)۔

مسلم اندلس میں ڈیوسکوریڈیس (Dioscurides) [ایک یونانی طبیب، م ۵۰ء، جو اپنی مخزن الادویہ Materia medica کی وجہ سے ازمنۂ وسطٰی میں مشہور تھا] کی کتاب کے مطالعے کا اثر یہ ہوا کہ وہاں کے لوگوں میں ادویۂ مفردہ پر بالخصوص اعتماد پیدا ہو گیا۔ ابن ابی اُصَیْبِعہ (۲: ۴۹) کا قول ہے کہ مشہور طبیب ابن وافِد (م بعد ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۸ء) شاذ و نادر ہی کوئی مرکب دوا تجویز کیا کرتا تھا۔ اپنے ہم عصر عبداللہ بن عبدالعزیز البَکْری کی طرح، جس نے الاَنْدَلُس کے پودوں اور بیڑوں کی ایک فہرست مرتّب کی تھی (ابن ابی اُصَیْبِعہ، ۲: ۵۲)، ابن وافد ڈِیوسکو رِیڈِین (Dioscoridean) روایتِ طب کا سرگرم حامی تھا اور یہی حال الغَافِقی کا تھا، جو مسلم اندلس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف ماہر ادویہ تھا۔ جس حد

تک دوا سازی کا تعلّق ہے لاطینی روایت طب میں Mesue Junior کی قرابادین (*Grabadin*) سیکڑوں سال تک تمام یورپ میں حجّت مانی جاتی رہی اور علم الادویہ کی مؤقّر سرکاری کتابوں کے لیے سنگِ بنیاد کا کام دیتی رہی۔ (لیو افریکانوس Leo Africanus [الحسن بن محمد الوزان الزیاتی] کے قول کے بموجب یہ کتاب ماسَوَیْہ المَارِنْدی نے لکھی تھی، جو بمقام بغداد ۱۰۱۵م میں فوت ہوا اور صقلیّہ کے ایک یہودی نے لاطینی میں اس کا ترجمہ کیا تھا).

ادویہ کی ترکیب اور ان کے استعمال کے بنیادی طبّی اصول کے لیے دیکھیے مادّۂ طب.

(B. LEWIN لِیْوِن)

---

* **اِقْرار:** (ع) اقبال واعتراف۔ اگر ملزم کسی مقدّمے میں قاضی کے سامنے اقرار کرلے کہ مستغیث سچ کہتا ہے تو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی، قاضی اپنا فیصلہ فوراً دے سکتا ہے۔ تاہم اقرار صرف اسی وقت قابلِ قبول سمجھا جائے گا جب اقرار کرنے والا بالغ وسلیم الحواس ہو اور بغیر کسی دباؤ کے قاضی کے سامنے اقرار کرے۔ کسی سے جبراً اقرار لینے کی تدابیر سے کام لینا قطعاً ممنوع ہے۔ یہاں تک کہ وہ اقرار بھی ناجائز ہے جو کسی نے تازیانے لگنے وغیرہ کے خوف سے کیا ہو۔ اگر مقدمہ قانونِ املاک سے متعلّق ہے تو مطالبہ تسلیم کرنے والا شخص اپنے افعال میں مختار (''رشید'') ہونا چاہیے۔ اگر کسی مقدمے میں کسی الزام کی صحت ایک بار تسلیم کی جاچکی ہے تو بعد میں اس اقرار کی تنسیخ ناجائز ہوگی۔ اس کے سوا کہ ملزم نے کسی ایسے جرم کا اقبال کیا ہو جس کے لیے وہ حقوق اللہ کے مطابق سزا کا مستوجب ٹھیرے (دیکھیے مادّۂ عذاب).

شریعت میں اپنی بلا نکاح اولاد کو تسلیم کرنے کی کوئی وقعت نہیں، حدیث میں ہے: الوَلَدُ لِلْفِراشِ ولِلْعاهِرِ الحَجَرُ (البخاری، کتاب البیوع، باب ۳)۔ اگر کسی ولدِ حلال کی ولدیّت مشتبہ ہوجائے اور خاوند واضح الفاظ میں اسے اپنا بیٹا مان لے تو کسی اَور ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں ''اقرار'' سے بچے کی ولدیّت معیّن ہوجاتی ہے، لیکن شوہر کا بیان حقیقتِ حال یا قانون کے خلاف نہ ہونا چاہیے.

دوسری صورتوں میں بھی شخصی نسب ''اقرار'' کے ذریعے سے مسلّم ہوجاتا ہے اور بعض حالات میں کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی، مثلاً کوئی بالغ مسلمان مرد بیان کرے کہ فلاں شخص اس کا باپ یا بھائی یا چچا ہے، لیکن رشتے کا یہ دعوٰی اگر کسی ایسے شخص کے متعلّق کیا گیا ہو جو ابھی زندہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ (زندہ انسان) اس ''اقرار'' کی تصدیق کرے، بشرطیکہ وہ عدمِ بلوغ یا ضعفِ دماغی کے باعث تصدیق سے معذور نہ ہو۔ اگر اقرار ذرا دور کے رشتہ داروں کے بارے میں ہو (مثلاً بھائی یا چچا) تو یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں کے واسطے سے رشتے کا دعوٰی کیا گیا ہے (مثلاً باپ، دادا) وہ مرچکے ہوں.

مآخذ: (۱) فقہ کی کتابوں میں باب الأقرار؛ (۲) C. Snouck Hurgronje: *Rechtstoestand von Kinderen buiten huwelijk geboren uit Inlandsche vrouwen die den Mohammedaanschen godsdients belijden* در *Het Recht in Nederl. -Indië*، ج ۱۹ (۱۸۹۷ء): ۱۳۳-۱۳۶، ۲۸۵-۲۹۰؛ ج ۲۰ (۱۸۹۸ء): ص ۸۷-۹۲؛ (۳) Th. W. Juynboll: *Handb. d. Islām, Gesetzes.* ص ۱۹۲ ببعد، ۳۱۴.

(TH. W. JUYNBOLL)

---

* **اَقْراص:** (ع) قُرْص [= ٹکیا] کی جمع، بعض اوقات انگریزی لفظ Pastille یعنی بخورات کی بتی کے لیے اور لوز (Lozenge) کے معنی میں بھی قرص کا لفظ استعمال ہوجاتا ہے۔ طبّی اصطلاح کے طور پر یہ لفظ عربی کی کسی [قدیم] لغت میں استعمال نہیں ہوا، حتّٰی کہ ابن سِیْدَہ کے یہاں بھی۔ ابن سینا نے البتہ اپنی تصنیف قانون (۳: ۳۸۲، متن میں غلطی سے ص ۳۷۲) میں مختلف قسم کی لوزات کے کچھ نسخوں اور ناموں کا ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ اس کا قاعدہ تھا ان کی توضیح نہیں کی.

سب سے پہلے اس نے اَقْراص الکَوْکَب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اطبّاے متقدّمین اس کی قدر و قیمت سے خوب واقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کے لیے یہ نام تجویز کیا۔ پھر ان کے اثرات بیان کرتے ہوے بتایا ہے کہ یہ معدے کی کمزوری کو دور کرتی ہیں، دوسرے اعضا سے آنے والے فُضْلوں کو روکتی ہیں اور غیر منہضم غذا کو آگے نہیں جانے دیتیں۔ انھیں پیشانی پر بھی ملا جاتا ہے، تاکہ دردِ سر کو سکون ہو۔ نزلے اور دانت کے درد میں بھی ان کا استعمال مفید رہتا ہے، بلکہ ان میں مازُو (galbanum) شامل کرکے جسم کے کھائے ہوے حصّے پر بھی ملا جاتا ہے۔ کان کے درد میں بھی ان کا استعمال فائدہ مند ہے۔ اسی طرح نفث الدّم میں، خواہ اس کا تعلّق جسم کے کسی حصّے سے ہو، مفید ہیں۔ وہ مُزْمن کھانسی اور باری کے بخار میں بھی فائدہ دیتی ہیں، بشرطیکہ انھیں [مُرْز جوش یعنی] ایسے جوش دیے ہوے پانی میں ملا کر پلایا جائے جس میں چاندی موجود ہے۔ آبِ اسپند کے ساتھ استعمال کرائی جائیں تو سمّی اثرات زائل ہوجاتے ہیں.

ان کا نسخہ یہ ہے:-

[مُر، جُنْد بیْدَسْتَر، سُنْبُل الطِّیْب، تَجْ، گِلِ مَخْتُوْم اور قشر یبروج (مردم گیاہ) ہر ایک چار چار درہم۔ افیون، زعفران، قُسْط، کوکب الارض، اَنِیْسُوْن، تُخْمِ بَنْج (بھنگ)، روغن بَلْسان، تُخْم کرفس، ہر ایک آٹھ آٹھ درہم لیکن آ، لائڈن، بذیلِ مادّہ میں... کوکب الارض، یعنی طلق پانچ درہم۔ خشخاش سفید چھے درہم، دوقو، اَنِیْسُوْن سِیْسالِیُوْس، تخم بَنْج، روغن بَلْسان اور تخم کرفس ہر ایک آٹھ آٹھ درہم]۔ ان سب اجزا کو پیس کر ایسے گوند میں ملا لیجیے جسے خوش بودار شراب [ریحانی] سے تر کرلیا گیا ہو۔ پھر بقدر نصف درہم لوز بنا بنا کر سایے میں خشک کرلیجیے.

اس کے بعد سات خوش بودار اقراص کا مع ان کی ترکیب کے ذکر آتا ہے:-

۱۔ اقراص الوَرْد عوام کے لیے؛

۲۔ اقراص الورد ایسکلو پیاس [اساطیری یونانی معالج دیوتا]؛

۳۔ اقراص الورد سَقْمُونِیا؛
۴۔ اقراص الورد طَباشِیر؛
۵۔ اقراص الورد اُسْتُمّی دِنْیُوردہ؛
۶۔ اقراص الورد بہ نسخۂ دیگر؛
۷۔ اقراص الورد سُنْبُلی.

پھر پانچ کافوری لوزات کا ایک ایک کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ علاوہ ان کے (کسی اَور نسخے کے مطابق) اقراص الکافور کا، پھر اقراص طباشیر کا، پھر اقراص امیر بَشِیر کا، پھر چھے اَور قسموں کا چھے صفحوں میں مع ان کے اثرات اور ترکیب کے ذکر ہے.

(J. LIPPERT لِپّرٹ)

⊗ **الأَقْرعؓ بن حابِس**: بن عِقال بن محمد بن سفیان المُجاشِعی، الدّارِمی، الحَنْظَلی، التَّمیمی (م ۳۱ھ/۶۵۱ء) صحابی اور اپنے قبیلے کے بہادر و نامور سردار، فراس نام، سر کے بال اڑ جانے کے باعث الأَقْرع مشہور ہوے (ابن دُرَید؛ ثَعالبی)، اور لنگڑا ہونے کے باعث الأَعْرَج بھی کہلائے (المعارف؛ أَعْلاق النَّفِیسَة)۔ ان کا بھائی مُرثِد بن حابِس تھا (لِسان العرب)، اور بہن لیلیٰ بنت حابِس، جو مشہور شاعر فَرَزْدَق کی والدہ اور غالب بن صَعْصَعَہ کی بیوی تھی (کتاب الشِعر)۔ الأقرع کا ابن عم عَیاض بن حِمار بن عِقال بن محمد زمانۂ جاہلیت سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا بڑا دوست اور حَرَمی تھا، یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا لباس مبارک پہن کر طوافِ کعبہ کیا کرتا تھا۔ عیاض کو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی صحبت اور تیس حدیثوں کی روایت کا شرف بھی حاصل ہے (جوامع السیرۃ؛ جَمْهَرة اَنْساب العرب)۔ الأقارِع، یعنی خاندان اَقْرع کی شرافت اور بزرگی کا اعتراف مشہور شاعر اَلصّلتان العَبْدی نے بھی کیا ہے (کتاب الشِعر، ص ۷۷ ۴)۔ الأقرع کی جانب کچھ اشعار بھی منسوب ہوے (معجم الشعراء؛ أُسْد الغابة)۔ ان کا شمار زمانۂ جاہلیت کے عرب سربراہوں (ائمّہ)، ثالثوں (حُکّام) اور داناؤں (حکما) میں ہوتا ہے (المُحبَّر؛ الإصابة)۔ جاہلی دور میں سُوقِ عُکاظ کے موقع پر ثالثی اور قضا کا شرف بنوتمیم کو حاصل تھا اور ظہورِ اسلام کے وقت یہ عہدہ الأقرع بن حابِس کے سپرد تھا (اسواق العرب، ص ۲۹۱؛ القاموس)۔ اقرعؓ کو جرّار، یعنی ایک ہزار لشکروں کی قیادت کرنے والا بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے یوم الکُلاب الاوّل (یا الثانی میں بنوحنظلہ کی قیادت کی تھی (المُحبَّر).

اسلام لانے کے بعد بھی الأقرع کی عزّت و شرافت مسلّم رہی۔ وہ ایمان و اسلام میں پختہ تھے (الإصابة)۔ فتح مکّہ، غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف میں شرکت کی۔ انھیں نبی اکرمؐ نے غنائمِ ہَوازن میں سے ایک سو اونٹ عطا کیے تھے (جَوامع السیرۃ؛ المُحبَّر)۔ اس امتیازی سلوک پر رشک کرتے ہوے عبّاس بن مِرْداس السُّلمی نے اپنے مشہور اشعار کہے تھے (کتاب الشعر)۔ ایک مرتبہ یمن سے کچھ سونا آیا تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے چار صحابہ میں تقسیم فرما دیا، جن میں الأقرعؓ بھی شامل تھے (الإصابة)۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے الأقرع کو بنودارِم بن مالک بن حَنْظَلَہ کے صدقات کی فراہمی کے لیے عامل مقرّر فرمایا (اَنْساب الاَشْراف)۔ محرّم ۹ھ میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عُیَیْنَہ بن حِصن الفزاری کی سرکردگی میں پچاس شہسواروں کا ایک رسالہ بنوتمیم کے ایک خانوادے بنوعَنْبَر کے خلاف روانہ کیا۔ وہ لوگ لشکر دیکھ کر بھاگ گئے۔ مسلمان ان کے گیارہ مرد، اکیس عورتیں اور تیس بچے پکڑ کر مدینۂ منوّرہ لے گئے۔ بنوتمیم کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد قیدیوں کی رہائی کے لیے حاضر ہوا، جس میں الأقرع بن حابس بھی شامل تھے (بخاری؛ زادُ المَعاد)۔ قیدیوں میں اپنے بچے اور عورتیں دیکھ کر وفد بڑا بے قرار ہوا۔ اضطراب، گھبراہٹ اور جلدی میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آوازیں دے کر بلانا شروع کیا (زادالمعاد)۔ اس پر سورۃ الحُجُرات کی پہلی چار آیتیں نازل ہوئیں (زمخشری؛ خازن؛ تفسیر مواهب الرحمن)۔ ایک روایت کے مطابق الأقرع نے آواز دی تھی (احمد: مسند؛ لباب النقول)۔ الأقرع نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس وقت مجھ میں جہالت و بدویّت موجود تھی اور میں اپنی بے تمیزی سے حجرے کے باہر سے چلایا کہ اے محمدؐ نکل کر ہمارے پاس آؤ (مواهب الرحمن، ۲۶:۱۸۱)۔ غالباً الأقرع سے یہی ایک روایت کتب حدیث میں محفوظ ہے۔ اسی وفد تمیم کے سلسلے میں حضرت ثابتؓ بن قَیس اور حضرت حَسّانؓ بن ثابت کے جوابی قصائد اور خطبے کا ذکر آتا ہے (حسّان: دیوان؛ زادالمعاد)، اور اسی موقع پر الأقرع نے اعلان کیا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خطیب ہمارے خطیب سے بہتر اور حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شاعر ہمارے شاعر سے افضل و اعلیٰ ہے۔ الأقرع نے بھی قیدیوں کی رہائی کی سفارش کی۔ ان کی رہائی کے بعد وفدِ بنی تمیم نے اسلام قبول کر لیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انھیں انعام و اکرام سے خوب نوازا (زاد المعاد، ۲:۲۰۳)۔ الأقرع تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے (جوامع السیرۃ) البتہ حضرت عمرؓ نے سفارش کی کہ الأقرع کو بنوتمیم کا سردار مقرّر کر دیا جائے (البخاری)۔ جب وفدِ نجران آیا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک عہدنامے کے ذریعے انھیں امان دی۔ اس کے شاہدوں میں الأقرع بھی شامل تھے (البلاذری: فُتُوح، ص ۷۲؛ [ابن سعد:] طبقات، ۱/۲:۸۵)۔ ایک مہمّ میں عامر بن اَضْبَط الأشْجَعی کسی غلط فہمی کی بنا پر مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کے قبیلے والوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے شکایت کی اور قِصاص کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے خوں بہا دینا چاہا، لیکن وہ رضامند نہ ہوے۔ آخر الأقرعؓ کے کہنے سننے پر ان لوگوں نے دیت قبول کر لی (زادالمعاد، ۲:۱۵۰).

الأقرعؓ بن حابس کی فوجی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے حضرت خالدؓ بن ولید کے ساتھ ہو کر جنگ یمامہ وغیرہ میں شرکت کی (الإصابة)۔ حضرت

عُیَیْنَہؓ بن حِصْن اور الأقرعؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے جاگیر طلب کی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیتے ہوے الأقرع سے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمھاری دل جوئی فرمایا کرتے تھے، لیکن اب تمھیں محنت کرنا چاہیے (تاریخ صغیر)۔ الأقرعؓ نے شُرَحْبِیلؓ بن حَسَنَہ کے ساتھ ہوکر دُوْمۃ الجَنْدل کے معرکے میں حصّہ لیا (الإصابۃ)۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے زیر قیادت اہلِ عراق کے خلاف صف آرا رہے اور فتح اَنْبار کے وقت مقدمۃ الجیش کی قیادت کر رہے تھے (تجرید اسماء الصحابۃ)۔ بقول رضی الشّاطبی ، الأقرع اور ان کے دس بیٹوں نے معرکۂ یَرْمُوک میں شہادت پائی (الإصابۃ)، لیکن حافظ ذَہبی اور البلاذری کے نزدیک حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت عبداللہ بن عامر نے الأقرع کو سالارِ لشکر بنا کر خراسان کے محاذ پر بھیجا تھا (تجرید اسماء الصحابۃ) اور بقول البلاذری جوزجان فتح کیا (فُتوح، ص ۴۱۴)۔ الأقرع کا بھائی مُرْشِد بن حابس بھی فتح جوزجان میں شامل تھا اور وہیں وفات پائی۔ ابن حَجَر نے بھی جوزجان میں وفات کی روایت کو ترجیح دی ہے (تعجیل المَنْفَعۃ)۔

مآخذ: (۱) ابن الأثیر: أُسْدُ الغابۃ (۱: ۱۰۷ ابعد)، مکتبۂ اسلامیہ، تہران؛ (۲) ابن حَجَر: الإصابۃ، ۱: ۷۳؛ (۳) وہی مصنّف: تَعْجِیل المَنْفَعۃ، ص ۳۹، ۴۰، حیدرآباد ۱۳۲۴ھ؛ (۴) ابن حزم: جَوامِع السِیْرَۃ، ص ۲۶، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۵۹، دارالمعارف، مصر؛ (۵) وہی مصنّف: جمھرۃ انساب العرب (طبع عبدالسلام محمد ہارون)، دارالمعارف، مصر ۱۹۶۲ء؛ (۶) ابن رُسْتَہ: الأعْلاق النَفِیْسَۃ، لائڈن ۱۸۹۱ء؛ (۷) ابن رَشِیْق: العُمْدۃ، ۲: ۱۶؛ (۸) ابن سعد: الطبقات، ۲/۲: ۴۰، ۸۵، ۱۴۵، لائڈن ۱۳۳۵ھ؛ (۹) ابن سَیِّد الناس؛ عیون الأثر، ۲: ۲۰۵؛ (۱۰) ابن عبدالبرّ: الإستِیْعاب، ۱: ۴۵، حیدرآباد ۱۳۱۸ھ؛ (۱۱) ابن عبدرّبہ: العِقد، بمددِ اشاریہ؛ (۱۲) ابن عساکر: تہذیب، ۳: ۸۶، مطبوعۂ دمشق؛ (۱۳) ابن قتیبہ: کتاب الشعر و الشعراء (طبع احمد محمد شاکر)، بمددِ اشاریہ، قاہرہ ۱۳۶۴-۱۳۶۶ھ؛ (۱۴) وہی مصنّف: کتاب المعارف، ص ۱۹۴، ۳۰۵، قاہرہ ۱۹۳۵ء؛ (۱۵) ابن القیّم الجوزیہ: زاد المَعاد، ۲: ۱۵۰، ۱۸۹، ۲۰۱، ۲۰۳، و ۳: ۴۰، مصر ۱۹۲۸ء؛ (۱۶) ابن الکلبی: جَمْھَرۃ الانساب، مخطوطۂ موزۂ برطانیہ، شمارہ ۱۳۰۲، ورق ۶۵ ب؛ (۱۷) ابن منظور: لِسان العَرَب (مادّہ، ق رع)؛ (۱۸) ابن ہِشام: سیرۃ، بمددِ اشاریہ؛ (۱۹) الأغانی، بمددِ اشاریہ؛ (۲۰) امیر علی (مولوی، سید): تفسیر مواھب الرحمٰن، ۲۶: ۱۶۷-۱۷۱، نولکشور، لکھنؤ ۱۹۴۱ء؛ (۲۱) البخاری (کتاب المغازی، باب وفد بنی تمیم، غزوۂ عُیَیْنَہ ابن حِصْن الفزاری)؛ (۲۲) وہی مصنّف: التاریخ الصغیر، ص ۳۱، الٰہ آباد ۱۳۲۵ھ؛ (۲۳) البغدادی: خِزانۃ الأدب، ۳: ۳۹۷؛ (۲۴) البلاذری: فتوح البُلْدان، ص ۴۷۲، ۴۱۳، قاہرہ ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء؛ (۲۵) وہی مصنّف: انساب الأشراف، ج ۱ (طبع محمد حمیداللہ) دارالمعارف، مصر ۱۹۵۹ء؛ (۲۶) الثعالبی: لطائف المعارف، مصر ۱۹۶۰ء؛ (۲۷) الجاحظ: البیان، ۱: ۲۳۶؛ (۲۸) حسّان بن ثابتؓ: دیوان، ص ۲۴۳، ۲۵۲، ۳۸۳، بشرح البَرْقُوقی، مصر ۱۹۲۹ء؛ (۲۹) الخازن: لُباب التأویل (تفسیر خازن) ۶: ۴۳، مصر ۱۳۲۰ھ؛ (۳۰) الذّہبی: تجرید اسماء الصحابۃ، ۱: ۲۷، حیدرآباد ۱۳۱۵ھ؛ (۳۱) الزمخشری: الکشّاف، ۴: ۷، مصر ۱۳۵۴ھ؛ (۳۲) سعید احمد اکبرآبادی: صدیق اکبر، ص ۲۵۸، ۲۶۳، دہلی ۱۹۵۷ء؛ (۳۳) سعید الافغانی: اسواق العرب، دمشق ۱۹۶۰ء؛ (۳۴) السیّوطی: لباب النقول فی اسباب النزول، ص ۲۰۱، مصر ۱۹۳۵ء؛ (۳۵) الطبری: تاریخ، بمددِ اشاریہ؛ (۳۶) المبرّد: الکامل، ۱: ۳۳، قاہرہ ۱۳۳۵ھ؛ (۳۷) مجدالدّین فیروز آبادی: القاموس المحیط (مادّہ، ح ک م)؛ (۳۸) محمد بن حبیب: کتاب المُحبَّر، بمددِ اشاریہ، حیدرآباد ۱۳۶۱ھ؛ (۳۹) محمد حسین ہیکل: ابوبکر الصّدیق، ص ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۳، مصر ۱۳۶۱ھ؛ (۴۰) المقریزی: امتاع الأسماع، اشاریہ، قاہرہ؛ (۴۱) النّووی: تہذیب الأسماء، ۱: ۱۲۴، مصر؛ (۴۲) یاقوت: مُعجم البُلْدان، مادّۂ جوزجان.

(عبدالقیوم)

اِقْرِیطِش: اس کا انگریزی نام کریٹ (Crete) ہے، اور ترک ''کِرِیْد'' کہتے ہیں۔ صقلیہ، سارڈینیا اور قُبْرُص (یا قُبْرُص Cyprus) کے بعد بحیرۂ روم میں یہ سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ شمال میں ۳۴ ثانیہ ۵۰ دقیقہ اور ۳۵ ثانیہ ۴۰ دقیقہ عرض بلد کے درمیان اور مشرق میں ۲۳ ثانیہ ۴۰ دقیقہ اور ۲۶ ثانیہ ۲۰ دقیقہ طول بلد کے درمیان واقع ہے [کل رقبہ ۸۳۳۵ کیلومیٹر ہے]۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اِقْرِیطِش پانچ سَنْجاقوں میں منقسم تھا: (۱) خانیہ (Canea)، (۲) الخَنْدَق (Candia)، (۳) رِتِیْمْنُوس (Rethymnos) (ترکی: رِیمو)، (۴) سُفاکیہ (Sphakia) اور (۵) لَیْسِتی (Lasithi) (ترکی: لاشِیْد)۔ ہر سنجاق ایک ناظم (Nomarch) کے ماتحت تھا۔ اقریطش کا دارالحکومت خانیہ تھا۔

آبادی: اہلِ وینس کے ماتحت اقریطش کی آبادی تخمیناً اڑھائی لاکھ تھی۔ ترکوں کے زیرِ اقتدار آجانے کے بعد اس کی آبادی بڑھ کر ۲۶۰۰۰۰ ہوگئی، جس میں ۱۸۲۱ء میں نصف کے قریب مسلمان تھے۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کی رو سے اس جزیرے کی آبادی ۲۷۹۱۶۵ تھی۔ شہروں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ جون ۱۹۰۰ء کی یونانی مردم شماری کے لحاظ سے عیسائیوں کی تعداد بڑھ گئی اور مسلمانوں کی کم ہوگئی، یعنی اس کی آبادی ۳۰۱۲۷۳ تھی، جس میں سے عیسائی ۲۶۷۲۶۶ اور مسلمان ۳۳۲۸۱ تھے۔ جون ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے عیسائی ۳۰۷۸۱۲، مسلمان ۲۷۸۵۲، یہود ۱۴۸۷ اور کل آبادی ۳۳۶۱۵۱ تھی [۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رو سے کل آبادی ۴۸۳۲۵۸ تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۸۰۰۰ بتائی گئی ہے۔ اس وقت مسجدوں کی تعداد تین سو تھی]۔

تاریخ: اس جزیرے سے مسلمانوں کا سب سے پہلے آمنا سامنا بوزنطیوں کے خلاف اپنی ابتدائی مہمّوں کے دوران میں ہوا اور انھوں نے ۶۷۳ء میں اس پر عارضی طور پر قبضہ بھی کرلیا۔ ۲۵۰ھ میں ابوحَفْص عمر ابن عیسٰی بن شُعَیْب البَلُّوطی [رک بہ ابوحَفْص] نے اس جزیرے کو مستقل طور پر مسلمانوں کے لیے فتح کیا۔ ابو

حَفْص عمر ان لوگوں کا سردار تھا جو قُرطُبہ میں الحَکَم کے خلاف ناکام بغاوت کرنے کے بعد بھاگ گئے تھے۔ اس نے روم کے ساحل پر حملے کرنے کے بعد اِقْرِیطِش میں اپنی فوج اُتار دی اور اسے بتدریج فتح کر لیا، بجز اس علاقے کے جو اہلِ سفاکیہ (Sphakiots) کے قبضے میں تھا۔ بوزنطی شہنشاہوں نے مسلمانوں کو اس جزیرے سے نکالنے کے لیے بار بار کوشش کی، لیکن ناکام رہے اور یہ جزیرہ ۱۳۵ برس تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس جزیرے میں اپنے دفاع کو مزید مضبوط بنانے کے لیے مسلمانوں نے راس خَرَکس (Charax) کے نزدیک ایک نئے دارالحکومت کی بنیاد رکھی، جس کا نام انھوں نے الخَنْدَق رکھا، جسے بعد میں کینڈیا (Candia) کہنے لگے، اس نام کا اطلاق زمانۂ قریب تک عام طور پر تمام جزیرے پر ہوتا تھا۔

۹۶۱ء میں بوزنطی سپہ سالار نقفور فوقاس (Nikephoros Phokas) نے کئی ماہ کے محاصرے کے بعد الخَنْدَق (Candia) پر قبضہ کر لیا اور بعد میں جزیرے کے باقی حصّوں کو بھی مُسخّر کر لیا۔ آخری امیر عبدالعزیز کا انتقال قسطنطینیہ میں ہوا اور اس کے لڑکے اَنیماس (Anemas) نے شہنشاہِ روم کی ملازمت اختیار کر لی۔ مسلم آبادی اس جزیرے کو چھوڑ کر چلی گئی اور جو باقی رہے انھیں عیسائی بنا لیا گیا۔

اہلِ روما کے قسطنطینیہ کو فتح کر لینے کے بعد اقریطش منتفرا کے کاؤنٹ بونفاس (Count Boniface de Montferrat) کے ہاتھ لگا، جس نے ۱۲۰۴ء میں اسے اہلِ وینس کے ہاتھ فروخت کر دیا اور یہ ۱۶۶۹ء یعنی ترکوں کی فتح تک ان کے قبضے میں رہا۔ اگرچہ اہلِ وینس کی حکومت کو وہاں کے باشندے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اس حکومت نے بسا اوقات ان پر مظالم بھی توڑے تھے تاہم اس حکومت کی وجہ سے اس جزیرے کو کچھ خوش حالی بھی نصیب ہوئی۔

بہر حال طرزِ حکومت چونکہ آمرانہ اور مستبدانہ تھا اس لیے رعایا نے متعدّد بار شورشیں اور بغاوتیں کیں۔ Daru کے قول کے مطابق ۱۲۰۷ - ۱۳۶۵ء چودہ بغاوتیں ہوئیں، ان میں سے اہم ترین ۱۳۶۱ - ۱۳۶۴ء کی بغاوت تھی۔ اب وینسی آبادکاروں نے ''ریبلک'' کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، لیکن جب وہ ناکام و مایوس ہو گئے تو انھوں نے اس مستبد و ظالم حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے ترکوں کی طرف رجوع کیا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، بذیلِ مادّہ) ترکوں نے ۱۶۴۵ء تک اس جزیرے کو فتح کرنے کی سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی، لیکن اُس سال انھوں نے اپنی پچاس ہزار فوج اس جزیرے میں اُتار دی۔ اس حملے کا فوری سبب یہ تھا کہ وینس اور مالٹا کے باشندوں نے قِزلَر آغاسی طوپال پر اس وقت حملہ کیا جب وہ مصر کو جا رہا تھا۔ ترکوں نے ستاون دنوں کے محاصرے کے بعد خانیہ اور اس کے بعد رِتیمنوس کو فتح کیا۔ ۱۶۴۸ء میں ترکوں نے اَلخَنْدَق کا محاصرہ کیا اور بیس برس کے طویل محاصرے کے بعد اسے سر کر لیا۔

تمام مغربی ملکوں نے موروسینی (Morosini) کے ماتحت اہلِ وینس کو امداد بھیجی، تاہم اس شہر نے ستمبر ۱۹۲۹ء کو وزیر اعظم کوپریلی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ معاہدۂ صلح کی شرائط کی رُو سے اہلِ وینس کے پاس فقط غرابوزہ (Grabusa)، سَودَہ (Suda) اور سُپینَہ لونگہ (Spinalonga) رہ گئے، لیکن ۱۶۹۱ء میں غرابوزہ پر اور ۱۷۱۵ء میں دوسرے دو شہروں پر بھی ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح تمام جزیرہ اہلِ وینس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اہلِ اقریطش نے ترکوں کا خیر مقدم کیا کہ وہ انھیں اہلِ وینس کی غلامی سے نجات دلانے والے ہیں اور ان کی کئی طریقوں سے مدد بھی کی؛ چنانچہ ان میں سے خاصی تعداد نے اسلام قبول کر لیا اور اس طرح وہ تمام اراضی کے مالک بن گئے۔ یکی [یَنی] چریوں کی بھرتی بھی انھیں سے ہوتی تھی اور اس جزیرے کے حقیقی حکم ران بھی یہی لوگ تھے، کیونکہ عثمانی حکومت ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اِقْرِیطِش میں ترکی حکومت کے گزشتہ صدی کے آغاز تک کے واقعات بہت ہی کم معلوم ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بغاوتیں تو وہاں ہوتی رہیں لیکن ۱۷۷۰ء میں ایک خطرناک بغاوت رونما ہوئی۔ یہ بغاوت روس کی ملکہ کیتھرائن دوم سے امداد ملنے کی توقع پر ہوئی تھی، جس نے امیر البحر اَورلوف (Orloff) کو حکم دیا کہ وہ یونانی سمندر میں جہاز گردی کرے۔ اس بغاوت کو، جس کا سرغنہ ماسٹر جون (John) نامی ایک سردار تھا، ترکوں نے سختی سے دبا دیا۔ ۱۸۱۳ء میں وہاں کا والی حاجی عثمانی عیسائیوں کی مدد سے یکی چریوں کو مختصر مدت کے لیے دبانے میں کام یاب ہو گیا، لیکن قسطنطینیہ میں اس کے متعلق غلط بیانی کی گئی اور اُسے واپس بلا لیا گیا۔ اب پھر یکی چری اس جزیرے کے حاکم بن بیٹھے۔ یونان کی جنگِ آزادی میں، جو ۱۸۲۱ء میں شروع ہوئی، اِقْرِیطِش نے نمایاں حصّہ لیا تھا۔ یہ بغاوت اتنی زیادہ پھیل گئی کہ سلطان (۱۸۱۳ء) کو اپنی امداد کے لیے مِصر سے محمد علی کو بلانا پڑا۔ جب ۱۸۳۰ء کی لنڈن کانفرنس میں یونان کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا تو اقریطش محمد علی کو تفویض کیا گیا۔ مصطفٰی پاشا البانوی نے ۱۸۳۲ - ۱۸۵۲ء اس جزیرے پر حکومت کی۔ اتحادی حکومتوں (فرانس، برطانیہ اور روس) نے فیصلہ کیا کہ اِقْرِیطِش کو یونانی مقبوضات میں شامل نہ کیا جائے۔ سلطان محمود ثانی کی رضامندی حاصل کر کے اسے مِصر کے حوالے کر دیا گیا اور اس کی تصدیق عثمانی حکومت نے اپنے ۲۰ دسمبر ۱۸۳۲ء کے فرمان کے ذریعے کر دی۔ مصطفٰی پاشا البانوی نے ۱۸۳۲ء سے ۱۸۵۲ء تک اس جزیرے میں حکومت کی۔ اس نے زراعت کو ترقی دی، سڑکوں کی تعمیر کی، پولیس میں اصلاحات کیں اور رہزنی اور ڈاکازنی کا قلع قمع کیا۔ اس کے عہد کو اقریطش کا زرّیں دَور کہا جاتا ہے۔

۱۸۴۰ء میں اِقْرِیطِش کو محمد علی سے لے کر ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن مصطفٰی پاشا بدستور اس کا والی رہا، یہاں تک کہ ۱۸۵۲ء میں وہ وزیر اعظم مقرّر ہوا۔ متعدّد چھوٹی چھوٹی شورشوں کے بعد ۱۸۶۶ء میں اس جزیرے میں اتنی بڑی بغاوت ہوئی جو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ترکی نے بڑی قربانیوں کے بعد اس بغاوت کو ۱۸۶۸ء میں فرو کر کے امن بحال کیا۔ سلطان نے اس سال دستورِ اساسی (''Organic Statute'') عطا کیا، جس کی رُو سے ایک قومی اسمبلی اور مخلوط عدالتوں کا قیام عمل میں آیا اور دیگر کئی اصلاحات نافذ کی گئیں اور اس طرح ایک قسم کی آئینی حکومت وجود میں آئی۔

۱۸۷۸ء میں جب ترکی روس سے برسرِ پیکار تھا تو یونان نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر اِقْرِیطِش کی عیسائی آبادی کو پھر بغاوت پر اُکسایا؛ چنانچہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں خوں ریز فسادات ہوے۔ انجام کار اِقْرِیطِش کے عیسائی سرداروں نے برطانیہ سے مداخلت کی درخواست کی اور ترکی نے، جو روس سے جنگ کی وجہ سے تھک چکا تھا، اسے قبول کرلیا اور ۱۸۷۸ء میں معاہدۂ شالپہ (Chalepa) (یا ہالپہ Halepa) طے پایا۔ دستورِ اساسی میں جو حقوق و مراعات اہلِ اِقْرِیطِش کو دیے گئے تھے ان کی تصدیق کی گئی، عدلیہ اور انتظامیہ کے نظام کو برقرار رکھا گیا، اور سابق مجلس عمومی (General Council) کی جگہ انچاس عیسائیوں اور اکتیس مسلمانوں پر مشتمل ایک اسمبلی کی تشکیل کی گئی۔ یونانیوں کی انگیخت کی وجہ سے حالات رُو بہ اصلاح نہ ہو سکے۔ ۱۸۸۹ء میں پھر تباہ کن فسادات شروع ہو گئے۔ باب عالی نے اس جزیرے میں عسکری آئین (مارشل لا) نافذ کر دیا اور معاہدۂ شالپہ میں قدرے ترمیم کی گئی، لیکن عیسائیوں نے نئے نظام کے تحت انتخابات کا مقاطعہ کر دیا۔ نتیجۃً ترکی حکومت کو مجبوراً اِقْرِیطِش پر اپنے گورنروں کے ذریعے حکومت کرنا پڑی اور اپنی عیسائی رعایا کو مطمئن کرنے کے لیے ۱۸۹۴ء میں قَرَہ تیودری پاشا (Karatheodory Pesha) نام ایک عیسائی کو اس جزیرے کا والی مقرر کیا، لیکن یونانی حکومتوں کی سازشوں اور شورش پسند عیسائیوں کی تخریبی کارروائیوں کی وجہ سے حالات سُدھر نہ سکے اور قرہ تیودری پاشا نے استعفیٰ دے دیا، جسے فروری ۱۸۹۶ء میں منظور کرلیا گیا۔ بدامنی بڑھتی چلی گئی۔ ۲۴ مئی ۱۸۹۶ء کو خانیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان خون ریز فسادات پھوٹ پڑے اور اس بہانے سے بڑی عیسائی حکومتوں نے وہاں اپنے جنگی جہاز بھیج دیے، جو ۲۶ مئی کو وہاں پہنچے۔ ۲۰ جولائی کو عیسائی نمائندوں نے اعلان کیا کہ وہ خود اختیار حکومت کی تجویز قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، جو عیسائی حکومتوں اور بابِ عالی کے نمائندوں نے مِل کر تیار کی تھی، لیکن باغیوں کی انقلابی جماعت نے اس کی مخالفت کی، نیز مسلمان بھی اس سے مطمئن نہ تھے؛ چنانچہ ۳/۴ فروری ۱۸۹۷ء کو خانیہ کے گلی کوچوں میں پھر لڑائی شروع ہو گئی، مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا اور ان کے مکانوں اور جائدادوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ خارجی حکومتوں نے اپنی فوج خشکی پر اُتار دی اور ساتھ ہی یونانی جنگی جہاز بھی وہاں آ گئے، جنھوں نے ترکی کے ایک بار بردار جہاز پر حملہ کر دیا اور اپنی فوج جزیرے میں اُتار دی۔ یونان اور ترکی کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کا نتیجہ یونان کے حق میں تباہ کن ثابت ہوا اور اِقْرِیطِش کے معاملات کا کوئی خاطر خواہ تصفیہ نہ ہو سکا۔ ۱۸۹۸ء میں جرمنی اور آسٹریا نے اس جزیرے سے اپنی افواج واپس بلا لیں اور باقی ماندہ ملکوں (برطانیہ، فرانس، اطالیہ، روس) نے اس جزیرے کو اپنے لیے چار حصّوں میں بانٹ لیا اور ہر ملک اپنے اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگا۔ بالآخر ۱۴ - ۱۵ نومبر ۱۸۹۸ء کو ان حکومتوں کے مطالبے پر آخری ترک سپاہ بھی اس جزیرے کو خالی کر کے چلی گئی۔

یونان سے اتحاد: ۲۶ نومبر ۱۸۹۸ء کو ان حکومتوں نے یونان کے شہزادے جارج کو تین برس کے لیے اس جزیرے کا ہائی کمشنر مقرر کیا۔ وہ ۲۱ دسمبر کو اس جزیرے میں پہنچا۔ مسلمان، جنھیں بے یار و مددگار بنا کر ان کے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا، بے بسی و مفلوک الحالی کے عالم میں کثیر تعداد میں یہاں سے ہجرت کر کے چلے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں شہزادہ جارج کی میعادِ حکومت بڑھا دی گئی اور اسے مزید وسیع اختیارات دیے گئے۔ اس کی آمرانہ طرزِ حکومت سے اہلِ اِقْرِیطِش میں بے چینی بڑھتی چلی گئی، حتّٰی کہ ۱۹۰۵ء میں پھر شورش برپا ہو گئی اور یونان سے الحاق کا نعرہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۰۶ء کو ان حکومتوں نے متعدّد اصلاحات کا اعلان کیا۔ ۲۵ ستمبر کو شہزادہ جارج جزیرے سے چلا گیا اور اس کا جانشین اَلیگزنڈر زائمس (M. Alexander Zaimis)، جو یونان کا سابق وزیراعظم تھا، یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اِقْرِیطِش میں وارد ہوا۔

۲۲ فروری ۱۹۰۷ء کو اس نے ہائی کمشنر کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس نے اپنی فراست اور فراخ دلی سے جزیرے میں امن و امان قائم کیا اور خارجی حکومتوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ انھوں نے اپنی افواج سے یہ جزیرہ خالی کرنے کے لیے جو شرائط عائد کی تھیں وہ پوری ہو چکی ہیں، یعنی: (۱) مقامی پولیس کا قیام؛ (۲) جزیرے میں امن و امان کی بحالی و قیام؛ (۳) مسلم آبادی کا تحفّظ۔ لہٰذا ان حکومتوں نے اپنی افواج کو واپس بلا لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس پر عیسائیوں نے خوشی کے شادیانے بجائے، لیکن مسلمانوں نے کئی مقامات پر سخت احتجاجی مظاہرے کیے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے ان حکومتوں نے ان سے غدّاری کی ہے اور انھیں ان کے دشمن عیسائیوں کے رحم کرم پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو اِقْرِیطِش کی قومی اسمبلی نے یونان سے اتحاد کا اعلان کر دیا۔ اس پر ان حکومتوں نے احتجاج کیا اور ۱۳ جولائی ۱۹۰۹ء کو فیصلہ کیا کہ وہ اس جزیرے پر ترکوں کے حقوقِ سیادت کی بحالی اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے جزیرے میں اپنے چار جنگی جہاز متعیّن کریں گی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگِ بلقان کے موقع پر یونان کے وزیراعظم وینیز یلوس (M. Venizelos) نے اِقْرِیطِش کے نمائندوں کو یونانی اسمبلی (Chamber) میں بیٹھنے کی اجازت دے دی اور ڈروگومس (S. Drogaumes) کو منتظمِ عمومی بنا کر اِقْرِیطِش بھیج دیا۔ معاہدۂ لنڈن (۱۹۱۳ء) کی دفعہ ۴ کی رو سے اِقْرِیطِش کو یونان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس جزیرے کی تاریخ یونانی تاریخ میں مدغم ہو گئی۔

دوسری عالم گیر جنگ میں جرمنی نے یونان کو فتح کرلیا اور مئی ۱۹۴۱ء میں اقریطش میں ہوائی جہازوں کے ذریعے اپنی فوج اُتاری تو تمام دنیا کی نظریں اس جزیرے کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہاں کی یونان اور نیوزی لینڈ کی افواج نے مِل کر جرمن فوج کا سخت مقابلہ کیا۔ ۱۹ مئی سے یکم جون تک زبردست تصادم رہا۔ اس کے بعد برطانیہ اپنی فوجیں نکال کر مصر لے گیا اور اِقْرِیطِش پر جرمنوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ ۸ مئی ۱۹۴۵ء کو جب جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے تو اِقْرِیطِش کو یونان کے حوالے کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) Pashley: *Travels in Crete*، کیمبرج ولنڈن ۱۸۳۷ء؛ (۲) Spratt: *Travels and Researches in Crete*، لنڈن ۱۸۶۷ء؛ (۳) W. J. Stillman: *The Cretan Insurrection of 1866-68*، ۱۸۷۴ء؛ (۴) Edwardes: *Letters from Crete*، ۱۸۸۷ء؛ (۵) J. H. Freese: *A Short Popular History of Crete*، ۱۸۹۷ء؛ (۶) Bickford-Smith: *Cretan Sketches*، ۱۸۹۷ء؛ (۷) Laroche: *La Créte ancienne et moderne*، ۱۸۹۸ء؛ (۸) Victor Berard: *Les Affairs de Créte*، ۱۸۹۸ء؛ (۹) G. Gerola: *Monumenti Veneti dell' isola di Creta*، وینس ۱۹۰۵ـ۱۹۱۷ء؛ (۱۰) انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، بذیلِ مادّہ؛ (۱۱) G. F. Hertzberg: *Geschichte der Byzantiner und des osmanischen Reiches*، برلن ۱۸۸۳ء، ص ۵۸، ۱۲۸، ۱۶۸؛ (۱۲) Jorga: *Gesch. des osm. Reiches*، گوتھا ۱۹۱۱ء، ۱۶:۴ ببعد، ۱۲۳ ببعد؛ (۱۳) v. Hammer: *Gesch. des osm. Reiches*، Pest ۱۸۳۶ء، ۳:۲۶۱ ببعد؛ (۱۴) R. Dozy: *Histoire des Musul-mans d' Espagne*، لائڈن ۱۸۶۱ء، ۲:۶۷؛ (۱۵) Wasiliew: *Wizantija i Arabi*، پیٹرزبرگ ۱۹۰۲ء؛ (۱۶) M. Gaspar: *Cordobeses Mus-ulmanes en Alejandria y Creta Homenaje à D. Francisco Codera*، سرقسطہ ۱۹۰۴ء؛ (۱۷) *Monumenti Veneti dell' isola di Creta*، وینس ۱۹۰۶ـ۱۹۰۸ء؛ (۱۸) H. Noiret: *Documents inédits pour servir â l' histoire de la domination vénitienne au Créte*، پیرس ۱۸۹۲ء؛ (۱۹) R o b: *Der Kretische Aufstand 1866-1867 bis zur Mission Aali Paschas nach diplomatischen Quellen*، ہیرن ۱۹۰۸ء؛ (۲۰) J. Ballot: *Histoire de l' hearbeitet*، پیرس ۱۸۶۸ء؛ (۲۱) Joannides: *Narrative insurrection crétoise*، لنڈن ۱۸۶۵ء؛ (۲۲) *of the Cretan War of Independance A Little Tour in Crete*، لنڈن ۱۸۶۸ء؛ (۲۳) Yule: *Light on Cretan Insurrections*، لنڈن ۱۸۷۹ء؛ (۲۴) H. Strobl: *Kreta eine geograph. hist. Skizze*، میونخ ۱۸۷۵ـ۱۸۷۶ء؛ (۲۵) Elpis Melena: *Erlebnisse und Beobachtungen enines niehr als 20-jährigen Aufenthaltes auf unter d. attom. Verwaltung*، وی انا ۱۸۶۷ء؛ (۲۶) Alex. de Stieglitz: *Kreta in L'île de Créte*، پیرس ۱۸۹۹ء؛ (۲۷) H. Bothmer: *Vergangenheit und Gengenwart*، لائپزگ ۱۸۹۹ء؛ (۲۸) V. Bérard: *Les affaires de Créte*، پیرس ۱۸۹۸ء؛ (۲۹) *Ministère des affaires étrangères Documents diplomatiques*، پیرس ۱۹۰۳ـ۱۹۰۵ء؛ (۳۰) *Mémoire de la commission du pouvoir exécutif en Crète*، خانیہ ۱۹۱۰ء؛ (۳۱) Laroche: *La Crète anci-enne et moderne*، پیرس ۱۸۹۸ء؛ (۳۲) A. j. Reinach: *La question L' insurrection Crètoise vue de Crète*، پیرس ۱۹۱۰ء؛ (۳۳) Turot: *crétoise et la guerre grécoturque*، پیرس ۱۸۹۸ء؛ نیز دیکھیے مندرجۂ ذیل تصانیف: (۳۴) Kriaris: *Histoire de Crète*، خانیہ ۱۹۰۲ء؛ (۳۵) Jannaris: *Agriculture et Commerce en Crète*، خانیہ ۱۹۰۶ء؛ (۳۶) Papantonakis: *Documents relatifs à l' insurrection de 1897-1898*، خانیہ ۱۹۰۱ء؛ (۳۷) Psilakis: *Histoire de Créte*، ایتھنز ۱۹۰۹-۱۹۱۰ء.

(جیس F. GIESE [ونصیر احمد ناصر])

اَقْسَرَا: رک بہ آق سرای. *

الأقْصَر: (جمع قلّت کا صیغہ ہے؛ واحد: قَصْر، بمعنی قلعہ، محلّ، ایوان) ⊗ بالائی مصر (صعید) کا ایک قدیم شہر، جو دریاے نیل کے مشرقی کنارے پر واقع ہے جس کا فاصلہ قاہرہ سے دریا کے ذریعے ساڑھے چار سو اور ریل کے ذریعے چار سو اٹھارہ میل ہے۔ اسلامی عہد میں (عصر حاضر سے پہلے) اس ضلع (کورہ) کا نام بھی جہاں یہ قدیم شہر آباد ہوا الأقْصَر ہی تھا.

الأقصر (مغربی زبانوں میں Luxor) کا یہ نام اس لیے ہوا کہ ازمنۂ قدیمہ میں یہاں بکثرت قصر تعمیر ہوے (یاقوت: معجم البلدان، بذیلِ مادّہ)، القَلْقَشَنْدی کہتا ہے کہ یہاں ایک عظیم بُت موجود ہے، جسے پتھر سے تراشا گیا تھا (صُبْحُ الأعشٰی، ۳:۳۲۸)۔ المَقْرِیزی نے لکھا ہے کہ یہ صعید (بالائی مصر) کا ایک بہت بڑا شہر ہے (الخِطَط، ۱:۳۲۸).

الأقصر کا معبد طیبہ کی عظیم ترین یادگاروں میں سے ہے۔ یہ شہر کی جنوب مغربی سمت میں دریا کے کنارے واقع ہے اور اسے ابن بلوسف (بلوتپ) ثالث (Amenhophis III) نے تعمیر کیا تھا، گو تکمیل سیتی اوّل (Seti I) کے عہد میں ہوئی۔ یہ معبد آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ ماہرینِ تعمیر و آثارِ قدیمہ اور سیّاح اسے دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ بحالت موجودہ اس میں ایک مسجد اور گرجا بھی موجود ہے.

موجودہ شہر میں کئی عمدہ ہوٹل ملیں گے۔ الأقصر کی سب سے بڑی گزرگاہ بھی اس کے قدیم راستے پر بنی ہے۔ الأقصر اور آس پاس کے علاقے میں قدیم اشیا بکثرت جعلی طور پر تیار کی جاتی ہیں.

الأقصر کے آس پاس قدیم آثار کے لیے بند اُسوان کی تعمیر سے غرقابی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی تحریک شروع ہوئی۔ اب اس سلسلے میں مناسب تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں.

معبد کی مفصّل کیفیّت کے لیے دیکھیے فرگوسن (Furgusson): قدیم فن تعمیر.

مآخذ: (۱) یاقوت: معجم البلدان، ج اوّل، بذیلِ مادّہ؛ (۲) القَلْقَشَنْدِی: صُبْحُ الأعشٰی، ۳:۳۲۸، مطبع الامیریہ، قاہرہ ۱۳۳۱ھ؛ (۳) المقریزی: الخِطَط،

۱:۳۲۸، مطبعۃ النیل، مصر ۱۳۲۴ھ؛ (۴) *Encyclopaedia Britannica*، ج ۴، طبع ۱۹۵۰ء، بذیل مادّہ؛ (۵) G. Rawlinsen: *Ancient Egypt*، ج ۲، ۱۸۸۱ء؛ (۶) Furgusson: *History of Architectur*، ۱:۱۰۸-۱۰۹، طبع اوّل.

(سیّد نذیر نیازی)

⊗ **اِقْطاع**: اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح، جس سے مراد ہے حکومت کی طرف سے قطعات زمین کا عطیہ۔ فقہا نے اس کی متعدّد شکلیں بیان کی ہیں:-

۱- حکومت کوئی ایسا قطعۂ زمین جس کا کوئی مالک نہ ہو کسی کو آبادکاری کے لیے عطا کر دے۔ اس صورت میں جس شخص کو یہ قطعہ دیا گیا ہو وہ جب تک اس کا خراج رُعشر ادا کرتا رہے گا تب تک اسے حق ہوگا کہ اس میں جیسے چاہے مالکانہ تصرّفات کر سکے، کیونکہ وہی اس قطعۂ زمین کا مالک ہوگا اور یہ نسلاً بعد نسلٍ اس کے وارثوں کو منتقل ہوتا رہے گا۔

۲- حکومت نے کسی کو کوئی قطعۂ زمین عطا تو کیا لیکن حقوقِ ملکیّت نہ دیے۔ اس صورت میں جس کسی کو یہ زمین ملی وہ صرف اس کی آمد کا حق دار ہوگا۔ بعد میں یہ آمد وارثوں کو منتقل ہوگی۔ وہ بھی جب تک ادائے خراج میں کوتاہی نہیں کریں گے حکومت یہ قطعۂ زمین ان سے واپس نہ لے گی۔ ایسا قطعۂ زمین بیع نہیں ہوسکتا تھا، لیکن اس کی آمدنی میں ہر قسم کے تصرّفات کی اجازت ہوتی تھی۔

۳- حکومت کسی کو کوئی قطعۂ زمین تاحیات عطا کرے کہ اس کا خراج رُعشر دیتا رہے اور آمد سے متمتّع ہو۔ ظاہر ہے کہ جب یہ شخص فوت ہوگا قطعۂ زمین حکومت کو منتقل ہوجائے گا۔

۴- حکومت اس قسم کے عطیے میں جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وقت کی قید نہ لگائے بلکہ جب چاہے اسے واپس لے لے۔

۵- حکومت نے زمین کا کوئی قطعۂ یا رقبہ تو کسی کو عطا نہیں کیا البتہ اس کا خراج یا عُشر، جو بھی بیت المال میں جمع ہو رہا ہے، کلًا یا جزءًا اس کے نام کر دیا۔ اس صورت میں جو شخص بھی وہ زمین کاشت کر رہا ہے اسے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔

یہ پانچ شکلیں تو ان زمینوں کے اقطاع کی ہیں جو بیت المال، یعنی حکومت کی ملکیّت ہیں، لیکن اراضی مملوکہ (یعنی ایسی زمینیں جو دوسروں کے قبضے میں ہوں) پر بھی اصول اقطاع کا اطلاق کیا گیا؛ لہٰذا بہتر ہوگا اس کی صراحت بھی کر دی جائے۔ یہ گویا اقطاع کی چھٹی شکل ہوگی۔ اس میں اور اقطاع کی پانچویں شکل میں، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ اگر اس قسم کا قطعۂ زمین کسی کو عطا کیا جاتا ہے تو اس کی کاشت اور پیداوار سے تو اس کا کوئی تعلّق نہیں ہوتا البتہ اس کا خراج یا جزیہ، جیسا بھی بیت المال میں داخل ہو رہا ہے، تمامًا یا جزءًا اقطاع دار کو ملتا رہتا ہے۔

اقطاع کی ساتویں اور جہاں تک زمین کی آبادکاری کا تعلّق ہے اصولًا اوّلین شکل یہ تھی کہ ارض مَوات، یعنی کسی ایسی زمین کو جو بے آباد پڑی تھی، کوئی مسلمان یا ذمّی حکومت کی اجازت سے آباد کر لیتا اور اس کا خراج رُعشر ادا کرتا رہتا تو وہ اس میں ہر قسم کے مالکانہ تصرّفات کر سکتا تھا؛ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں وضاحت کر دی ہے کہ جس زمین کا کوئی مالک نہ ہو اور وہ آباد بھی نہ ہو اور جسے دی جائے وہ آباد کر لے تو وہی اس کا خراج ادا کرے گا اگر خراجی ہے، اگر عشری ہے تو عشر دے گا۔ حکومت کو اختیار نہیں ہوگا کہ یہ قطعۂ زمین اس سے یا اس کے وارثوں سے واپس لے (۳:۳۶۶)۔

لیکن اقطاع کی یہ مختلف شکلیں دفعتًہ پیدا نہیں ہوگئی تھیں۔ وہ دراصل نتیجہ تھیں ایک طویل تاریخی عمل کا، جس میں سیاسی اور انتظامی ضرورتوں کے علاوہ ان تبدیلیوں کا بھی حصّہ ہے جو مرورِ ایّام سے اسلامی ریاست میں رونما ہوئیں۔ اقطاع کی بنا تو اس اصول پر تھی کہ جو زمین بے کار پڑی ہے اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ زراعت کو ترقّی ہو اور پیداوار بڑھے۔ چنانچہ کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ اقطاع کا جواز صرف ان زمینوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے جو کسی کی ملکیّت نہیں؛ مملوکہ زمینوں کا اقطاع جائز نہیں (ابوعبید القاسم بن سَلّام: کتاب الأموال، باب الاقطاع، ص ۲۷۸)۔ احمد بن عثمان المُرُوَزی نے عبداللہ بن مبارک سے، انھوں نے مَعْمَر سے اور مَعْمَر نے ابن طاؤس سے روایت کی ہے اور انھوں نے اپنے والد کی سند پر کہا: ''رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ''عادی الارض'' اللہ اور اس کے رسول کی ہے، پھر تمھاری۔ اس پر جب دریافت کیا گیا کہ کیسے؟ تو فرمایا اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے''۔ عادی الارض (عہدِ عاد کی زمین)، سے مراد ہے ''قدیم الارض''، یعنی وہ زمین جو غیر مزروعہ چلی آرہی ہے اور جسے ایک دوسری روایت میں مردہ زمین بھی کہا گیا ہے (کتاب الأموال، ص ۲۷۲، حاشیہ ۲)۔ مگر، جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، جیسے جیسے اسلامی مملکت کی حدود میں توسیع ہوئی اور اس نے پھیلتے پھیلتے تقریبًا ساری متمدّن دنیا کو آغوش میں لے لیا (اس میں ایک طرف پورا شمالی افریقہ، بلکہ ہسپانیہ اور جزائر بحیرۂ روم دوسری جانب وسطی اور مغربی ایشیا کے جملہ ممالک شامل تھے) اقطاع کی سادہ اور ابتدائی صورت قائم نہ رہی۔ ایک طرف سابقہ نظامہائے حکومت کی جگہ ایک نئے نظامِ حکومت نے لے لی تھی، نیز فتوحات کی بدولت جو نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے ان کا تقاضا یہ تھا کہ بعض انتظامی معاملات کا فوری طور پر کوئی فیصلہ کیا جائے؛ دوسری جانب اسلامی مملکت میں بھی طرح طرح کے رجحانات ابھر رہے تھے، جن کی نوعیّت اصولی بھی تھی، سیاسی، معاشی اور انتظامی بھی۔ یہ سب عوامل ہیں جن کے زیر اثر اقطاع کی مختلف شکلوں کا ارتقا ہوا۔ اب صورت یہ نہیں تھی کہ عام اور بیکار پڑی ہوئی زمین کو کیسے اور کن لوگوں میں تقسیم کیا جائے، بلکہ یہ تھی کہ آبادکاری کے علاوہ کوئی قطعۂ زمین یا زمین کا بہت بڑا رقبہ، یا علاقہ، یا پورا ایک صوبہ بھی اصولِ اقطاع کی بنا پر کسی ایسے شخص کی تحویل میں دیا جا سکتا ہے جو اس کی عمل داری اور نظم ونسق کی ذمّے داریاں قبول کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس

اصول پر عمل ہونے لگا تو اقطاع کا تعلّق محض زمین کی آبادکاری سے نہ رہا بلکہ اس کا رشتہ ملک کے نظم ونسق، عمل داری اور سیاسی ضروریات سے جوڑ دیا گیا۔ یوں اقطاع کی ایک نہیں کئی شکلیں پیدا ہوگئیں، مثلاً بقول الماوَرْدِی (الأحکام السلطانیة، باب اقطاع): اقطاعِ تملیک اور اقطاعِ استغلال۔ اقطاع تملیک کی تین شکلیں ہیں: اوّل اقطاعِ موات، دوم اقطاعِ ارض عامر، سوم اقطاعِ معادن۔ ارض موات کی دوصورتیں ہیں، اوّل وہ جو ہمیشہ سے بے آباد پڑی ہوں، دوم وہ جو کسی وجہ سے بے آباد ہوگئی ہوں، گویا اقطاع کا تعلّق جہاں زمین (بقول الماوَرْدِی اقطاعِ تملیک) سے ہے وہاں پیداوار (اقطاعِ استغلال) سے بھی ہے، یعنی یہ کہ حکومت کسی قطعۂ زمین کی پیداوار یا اس کی آمد کسی کے نام کردے، لیکن جس کے نام کی جائے وہ یا تو اس کا انتظام واہتمام اپنے ہاتھ میں لے یا بیت المال میں جو رقم بطور خراج/عشر جمع ہورہی ہے اس سے متمتّع ہوتا رہے۔ یوں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں: اقطاعِ خَراج، جس کی عام اجازت ہے اور اقطاعِ عُشر، جس کی حیثیت زکوٰۃ کی ہے اور اس کا امکان جبھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کا حق جن لوگوں کو پہنچتا ہے وہ اس وقت موجود نہ ہوں (دیکھیے الماوَردی؛ الأحکام السلطانیة، ص ۱۷)۔

اب ایک اَور لحاظ سے اقطاع پر نظر ڈالیے۔ ہمیں معلوم ہے فقہا کے نزدیک زمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک ارضِ موات، یعنی غیر آباد اور وہ غیر مزروعہ زمین جس کا کوئی مالک نہیں اور جس کے اقطاع میں حکومت کو تین سال تک تو کوئی رقم ادا نہیں کی جاتی لیکن تین سال کے بعد جو بھی اس کا لگان ہوتا بذریعۂ نیلام (تزاید) مقرر کر لیا جاتا اور اقطاع دار پر اسے ادا کرنا لازم ٹھیرتا۔ گو عام طور پر لگان کی شرح یہ سمجھتے ہوئے پہلے ہی سے معیّن ہوجاتی تھی کہ اس میں اضافہ ممکن نہیں۔ اگر تین سال تک زمین آباد نہ ہوتی تو حکومت اسے واپس لے لیتی، بشرطیکہ اقطاع دار زمین آباد نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ پیش نہ کرسکتا۔ اگر آباد کر لیتا تو مدّت اقطاع بڑھا دی جاتی اور وہ اس میں ہر قسم کے تصرّفات کرسکتا۔ اگر بے آباد زمینوں میں سے کوئی آباد شدہ زمین پھر غیر آباد ہوجاتی اور اس کی آبادکاری مطلوب ہوتی تو دو صورتیں پیش آتیں: (۱) اگر یہ زمین عہدِ جاہلیّت کی ہوتی تو اس کے اقطاع میں کوئی مشکل حائل نہ ہوتی۔ اس پر ویسے ہی عمل ہوتا جیسے اوپر ارضِ موات کے سلسلے میں بیان ہوچکا ہے؛ (۲) اگر ایسی زمین عہد اسلامی کی ہوتی تو فقہا اس کے اقطاع میں مختلف رائیں اختیار کرتے اور حکومت ان میں سے کسی ایک پر عمل کرتی۔

زمین کی دوسری قسم وہ ہے جسے ''عامرہ''، یعنی آباد کہا جاتا ہے۔ اس کا تعلّق مفتوحہ علاقوں سے ہوتا تو اس کے اقطاع کی ایک صورت یہ تھی: فتح سے پیشتر کوئی زمین کسی کو دے دینے کا فیصلہ ہوجاتا تو بعد از فتح اسی کا حق مقدم تسلیم کیا جاتا، لیکن اگر مفتوحہ علاقوں میں زمینوں کے مالک یا ان پر کام کرنے والے وطن چھوڑ جاتے یا ہلاک ہوجاتے (ان میں ان اراضی کو بھی شامل کر لینا چاہیے جو سابقہ حکومت کی ملکیّت تھیں نہ کہ افراد کی) تو ایسی زمینوں کا کچھ حصّہ تو بیت المال کے لیے محفوظ رہتا باقی اقطاعِ خراج کے تحت آجاتا۔ ان کی ملکیّت کا حق تو کسی کو نہ پہنچتا البتہ اقطاع لینے والے ان کے خراج سے فائدہ اٹھاتے، لیکن جن زمینوں کے مالک موجود ہوتے ان پر نہ اقطاعِ خراج کا اطلاق ہوتا نہ ان کے مالک بے دخل کیے جاسکتے بلکہ جیسا بھی از روے معاہدہ طے پاتا وہ حکومت کو ان کا خراج ادا کرتے رہتے، جو گویا جزیے کا بدل تھا، لہٰذا اسے جزیہ ہی تصوّر کیا جاتا (قب جزیہ وخراج)۔ یوں ارضِ خراج کی دو قسمیں ہوجاتیں: قابلِ اقطاع اور ناقابلِ اقطاع۔

رہیں وہ زمینیں جن کے مالکوں کے بعد کوئی وارث نہ ہوتا، ان کی حیثیّت وہی ہوتی جو املاکِ عامّہ (اوقاف) کی تھی یا پھر حکومت کو اختیار ہوتا کہ اقطاعِ پیداوار یا اقطاعِ زمین میں سے کسی ایک طریق پر عمل کرے۔

یوں اقطاع کی دو صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

(۱) اقطاعِ زمین، جس کا اوپر بیان ہورہا تھا اور جس کے تحت کوئی قطعۂ زمین یا محدود رقبہ ہی نہیں بلکہ پورا ملک بھی بطور اقطاع (اقطاعِ اقلیم) کسی کو دے دیا جاتا۔ ابن طولون کو جب ایک مقرّرہ رقم خراج کے عوض مصر کی ولایت عطا کی گئی تھی (۲۶۴ھ/۸۷۷ء) تو یہ اقطاعِ اقلیم ہی کی ایک شکل تھی۔ ہارون الرّشید نے بھی (۱۸۴ھ/۸۰۱ء میں) ابراہیم بن الأغلب کو ایسی ہی ایک شرط کے تحت افریقیہ کا والی مقرّر کیا تھا۔ دونوں صورتوں میں والی یا اقطاع دار کی حیثیّت سے وہ اپنے اپنے صوبوں کے نظم ونسق، حفاظت اور امن وامان کے ذمّے دار تھے۔ ظاہر ہے کہ اقطاع کی اس شکل میں فوجی اور انتظامی دونوں قسم کی ضرورتوں کا دخل تھا۔

(۲) اقطاع کی دوسری صورت، یعنی اقطاعِ پیداوار (استغلال) میں بھی انتظامی اور فوجی دونوں ضرورتیں کام کر رہی تھیں۔ اس کا اطلاق رفتہ رفتہ ان محاصل پر بھی ہونے لگا جو دریاؤں، نہروں، کاریزوں اور گمرک سے وصول ہوتے تھے۔ آگے چل کر ان سے فوجی جاگیروں کی ابتدا ہوئی۔ جہاں تک معادن کا تعلّق ہے الماوَرْدِی کے نزدیک ان کی دو قسمیں ہیں: ظاہری اور باطنی۔ ظاہری میں تو نمک، نفت اور اس قسم کی چیزیں شامل ہیں جن کی مثال گویا پانی کی ہے کہ ہر ایک کے نفع کے لیے ہیں، لہٰذا ان کا اقطاع جائز نہیں؛ البتہ دوسری قسم کا اقطاع جائز ہے۔ جائز کی صورت میں بھی دو قول ہیں: ایک یہ کہ اقطاع دار کا اس پر حق ملکیّت قائم ہوجائے، دوسرا یہ کہ وہ صرف اس سے استفادہ کرے (دیکھیے الماوَرْدِی: الأحکام السُلطانیة، اقطاع المعادن)۔

اقطاعِ پیداوار سے دراصل ان رقوم کا ادا کرانا مقصود تھا جو رعایا کی طرف سے بیت المال کے ذمّے ہوتیں اور جن کی تعیین ضروری تھی تاکہ پیداوار کی تعیین بھی ان کے مطابق ہوسکے؛ لہٰذا اقطاعِ پیداوار کا تعلّق اقطاع عشر اور اقطاعِ خراج دونوں سے تھا۔ اقطاعِ عشر تو، جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے، صرف استثنائی صورتوں میں ممکن تھا۔ خراج زکوٰۃ کا بدل نہیں ہے اور ایسے سرکاری ملازم بھی جو خاص عہدوں پر مامور تھے، لیکن نہ ان کی تنخواہ معیّن تھی اور نہ مدّتِ ملازمت، اقطاعِ خراج کے مستحق نہیں ہوسکتے تھے، لہٰذا اقطاع کی یہ شکل، جیسا کہ الماوردی

نے لکھا ہے، فوج ہی کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی۔ فوج کی تنخواہیں معیّن تھیں، لہٰذا اقطاع کا فیصلہ بھی ان کے تعلّق میں بآسانی ہوسکتا تھا۔ یوں ان جاگیروں کی ابتدا ہوئی جو فوج کو دی جاتی تھیں، لیکن یہاں جاگیر کا لفظ اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ اگرچہ فتوحات اور انتظامی وفوجی ضروریات کے باعث اصولِ اقطاع پر مختلف شکلوں میں عمل ہونے لگا تھا لیکن اس سے مقصود بہرحال یہ تھا کہ زمین بے آباد نہ پڑی رہے اور اس کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔ یوں حکومت کے لیے بھی ادائے مصارف کی ایک آسان شکل نکل آئی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے جب حضرت سُلَیطہ انصاریؓ کو ایک قطعۂ زمین عطا کیا تو اس سے زمین کی آبادکاری ہی مطلوب تھی۔ گو انھوں نے کچھ دنوں کے بعد اسے واپس کر دیا اس لیے کہ یوں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں حاضری کے مواقع کم ہو رہے تھے۔ ایسا ہی ایک عطیّہ وہ ہے جو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حضرت زبیرؓ کو خیبر میں دیا تھا۔ یہ تو اقطاعِ زمین کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ اقطاعِ پیداوار کی ابتدائی مثال کے لیے ہمیں بیت المقدس میں وہ قطعۂ زمین پیش نظر رکھنا پڑے گا جو حضرت عمر فاروقؓ نے فتح شام کے بعد حضرت تمیم داریؓ کو اس لیے عطا فرمایا تھا کہ انھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے اس کا وعدہ لے لیا تھا۔ کتاب الأموال میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہ زمین انھیں عطا کی تو فرمایا: ''تمھیں اس کی بیع کا حق نہیں ہوگا''۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا نفع نسلاً بعد نسلٍ ان کی اولاد کے لیے مخصوص رہا۔ لَیث بن سَعد کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عمرؓ نے یہ اقطاع تمیمؓ کے لیے دوامًا جاری رکھنے کا فرمان دے دیا تھا لیکن اس شرط پر کہ اسے فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، چنانچہ اس پر آج تک تمیم ہی کے خاندان کا قبضہ ہے (کتاب الأموال، ص ۲۷۵، نیز اسلام کا نظامِ اراضی، ص ۲۲)۔ یہ دو مثالیں اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ اقطاعِ زمین اور اقطاعِ پیداوار کی ابتدا کیسے اور کن حالات میں ہوئی۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامِ اقطاع چونکہ سرتاسر حکومت کے ہاتھ میں تھا اور حکومت ہی نے اس کی بنیاد ڈالی تھی لہٰذا ان زمینوں کو چھوڑ کر جن کا تعلق اقطاعِ پیداوار سے تھا (یعنی اقطاع دار جن کی کاشت نہیں کرتے تھے، صرف ان کی آمد سے فائدہ اٹھاتے تھے) ایسی زمینیں بھی دراصل حکومت ہی کی ملکیّت تصوّر کی جاتیں جن کی آباد کاری اقطاع دار کے ذمّے ہوتی۔ انھیں اگر حق پہنچتا کہ ان پر مالکانہ تصرّفات کر سکیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مطلقاً ان کے مالک تھے۔ اس لیے کہ حکومت اس قسم کی زمین بھی بعض صورتوں میں واپس لے سکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ تقسیمِ اراضی کا معاملہ حکومت ہی کے ہاتھ میں تھا اور اقطاع سے مقصود یہ تھا کہ زمینیں آباد رکھی جائیں، یہ نہ تھا کہ انھیں غصب کر لیا جائے یا کاشت کاروں کو بے دخل کر دیا جائے، لہٰذا یہ امر کاشت کاروں کے لیے بھی کئی پہلوؤں سے مفید ثابت ہوا (رک بہ زمین)۔ مناسب ہوگا کہ تاریخی اعتبار سے بھی اقطاعِ خراج پر سرسری نظر ڈال لی جائے بالخصوص اس حد تک جس حد تک اس کا تعلّق فوجی جاگیروں سے ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اقطاعِ خراج کو زیادہ تر اہلِ فوج ہی کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا اور یوں ہی فوجی جاگیرداری کی ابتدا ہوئی حتّٰی کہ اقطاع داروں کی ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی۔ بہرحال جب تک اقطاع دار مملکت کی خدمات انجام دیتے پیداوار انھیں کو ملتی رہتی۔ ان کی موت پر زمین پھر مملکت کو منتقل ہو جاتی۔ رہے ان کے ورثا سو انھیں دوسرے محاصل سے کچھ وظیفہ دے دیا جاتا، لیکن اگر اقطاع دار بیمار ہو جاتا اور خرابیِ صحت کے باعث تاحینِ حیات کوئی کام نہ کر سکتا تو مقامی معمولات کے پیشِ نظر اس کے لیے کچھ بطور معاش مقرّر کر دیا جاتا، البتہ اقطاع دار کو نہ زمین کی ملکیّت کا حق پہنچتا نہ اس امر کا کہ اسے اپنے وارثوں کے نام منتقل کر سکے۔ اقطاعِ خراج سے یا تو فوج کی تنخواہوں کا ایک حصہ ادا کرنا مقصود تھا یا اسے تنخواہوں کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، لیکن اگر محاصل کی وصولی میں بے قاعدگی ہوتی تو جاگیریں اہلِ فوج ہی کو دے دی جاتیں؛ چنانچہ آلِ بویہ کے زمانے سے ملک شاہ سلجوقی کے عہد تک — کوئی ایک سو تیس برس — یہی صورتِ حال رہی، البتہ نظام الملک نے یہ زمینیں مستقلاً فوجیوں میں تقسیم کر دیں، تاکہ وہ ان کے محاصل اور آمد سے فائدہ اٹھائیں۔ آگے چل کر سلاجقہ نے انھیں موروثی شکل دے دی تاکہ باہر سے آنے والے قبائل کی زیادہ سے زیادہ تعداد فوج میں بھرتی ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ یوں ایک ایسا لشکر تیار ہو جائے گا جو ہمیشہ ان کی وفاداری کا دم بھرے گا اور ہر بات میں ان کا ساتھ دے گا۔ نور الدّین زنگی کا بھی یہی دستور تھا کہ جب تک کوئی اقطاع دار سنِ بلوغ کو نہ پہنچتا اس کی پرورش کا خیال رکھا جاتا (المقریزی: خِطَط، مصر ۱۳۲۰ھ، ص ۲۵۱، ۳۷)۔ مغلوں کے ہاں بھی موروثی جاگیروں کا رواج تھا، جن پر فوجی ہی متصرّف رہتے؛ البتہ ممالیکِ مصر نے اس نظام کو بدل دیا۔ انھوں نے ذاتی املاک، بنجر زمینوں اور صحراؤں کے علاوہ ساری زمین کو بادشاہ کی ملکیّت قرار دیا، جسے سلطان قلاون (۱۲۷۹-۱۲۹۰ء) کے زمانے میں چوبیس حصّوں (قیراط) میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان میں سے چار حصّے سلطان کے لیے مخصوص تھے، جن سے وہ اپنے محافظ دستے، فوج اور سالارانِ فوج کو جاگیریں دیتا، دس امرا کے لیے اور دس اجیر سپاہیوں کے لیے۔ ان زمینوں کی بار بار پیمائش ہوتی تاکہ اگر کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے تو اسے دور کر دیا جائے، مثلاً یہ کہ بڑے بڑے امرا اپنی طرف سے بھی دوسروں کو جاگیریں عطا کرنے لگے تھے۔ ایک دوسری خرابی یہ تھی کہ اجیر سپاہی اپنے اقطاع دوسروں کے ہاتھ بیچ دیتے یا آپس میں بدل لیتے اور یوں بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے۔ اس وجہ سے ایک خاص دفتر بھی دیوان البدل کے نام سے قائم ہو گیا تھا، لیکن یہ خرابی دیر تک جاری نہ رہی۔ جب ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء میں سلیم ثانی نے مصر و شام فتح کیے تو ان زمینوں کی از سرِ نو پیمائش کرائی گئی اور انھیں جاگیروں کے لیے بحقِ سرکار محفوظ کر لیا گیا۔ رفتہ رفتہ عثمانی تاج داروں نے بھی موروثی جاگیروں کی طرح ڈالی۔ محمد علی پاشا (خدیوِ مصر، ۱۸۰۵-۱۸۴۸ء) نے البتہ فوج کو براہِ راست تنخواہ دینے کا طریقہ اختیار کیا تو ممالیک کو ان کی زمینوں سے

محروم کر دیا گیا۔ بہر حال دولتِ عثمانیہ کا دستور یہ تھا کہ ممالکِ مفتوحہ کا ایک حصّہ اپنی ملکیّت سمجھتے اور اسے والیانِ صوبہ میں بطور جاگیر تقسیم کر دیتے۔ وہ اس کے عوض سپاہیوں کی ایک مقرّرہ تعداد سلطان کے لیے مہیّا کرتے یا صرف خراج کی رقم ادا کرتے اور یہی آگے چل کر ان کا معمول ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے جاگیردار بابِ عالی کے تصرّف سے آزاد ہو گئے، بلکہ حمص، بَعْلَبَک، لبنان اور نابُلُس میں ہر ایک نے خاندانی حکومت قائم کر لی، جسے زعامت کہا جاتا اور جاگیردار زعیم کہلاتا۔ یوں رفتہ رفتہ پوری سلطنت فوجی جاگیروں میں تقسیم ہو گئی، جس سے دولت عثمانیہ کے استحکام کو خاصا نقصان پہنچا۔ ہمارے نزدیک یہ بھی اس کے زوال کا ایک سبب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلطان عبدالمجید (۱۸۳۹-۱۸۶۱ء) نے ان اصلاحات کی ابتدا کی جو تنظیمات [رَتْ بآن] کے نام سے مشہور ہیں اور جن کی بنیاد دراصل سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸-۱۸۳۹ء) نے رکھی تھی تو اس نظام کو رفتہ رفتہ ختم کر دیا گیا، گو اس کے باوجود کچھ جاگیریں باقی رہ گئیں لیکن آخری عثمانی انقلاب (۱۹۰۹ء) میں وہ بھی کالعدم ہو گئیں۔

ارضِ پاک و ہند میں بھی فوجی جاگیروں کی صورت کم و بیش یہی تھی۔ سندھ ۷۱۲ء میں فتح ہوا، پنجاب محمود غزنوی کے ہاتھوں گیارھویں صدی عیسوی میں، تیرھویں صدی کے اختتام تک پورے ہندوستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یہاں بھی، جہاں تک اراضی کا تعلّق ہے اصول یہی تھا کہ نہ مالکانِ زمین کو زمین سے بے دخل کیا جائے اور نہ کاشت کاروں کو۔ صرف وہی زمینیں سرکاری متصوّر ہوتیں جن کا کوئی وارث نہ تھا یا جو اسلامی فتح سے پہلے حکومت کے قبضے میں تھیں۔ فوجی جاگیریں ایسی ہی زمینوں سے دی جاتیں، یعنی فوجی ان کے خَراج سے متمتّع ہوتے؛ مثلاً جب سلطان شہاب الدین غوری نے شہر دہلی بطور جاگیر قطب الدین ایبک کو دے دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دہلی کی جملہ زمینیں ایبک کے قبضے میں آ گئیں، صرف یہ تھا کہ ان کا سالانہ خراج ایبک کے نام کر دیا گیا۔ آگے چل کر یہی طریق ایبک نے اختیار کیا۔ ایسے ہی جب شہاب الدین غوری نے بلادِ مفتوحہ کو ایبک کی جاگیر قرار دیا تو یہ اقطاعِ اقلیم ہی کی ایک صورت تھی، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ پھر اگر سرکاری زمینوں اور فوجی جاگیروں میں کبھی اضافہ ہوا تو اس لیے کہ عدم ادائے خراج یا بغاوتوں اور شورشوں کے باعث فتنہ پسند عناصر کی زمینیں ضبط کر لی گئیں یا ان کا کوئی وارث ہی نہ رہا۔ حاصل کلام یہ کہ جملہ بلادِ اسلامیہ کی طرح ارضِ پاک و ہند میں بھی ممالکِ مفتوحہ کے باشندے اپنی زمینوں پر قابض رہے، الّا یہ کہ کسی خاص سبب کی بنا پر حکومت نے کوئی زمین حاصل کر لی؛ چنانچہ امام ابو یوسف نے کتاب الخَراج میں صراحت کر دی ہے کہ امام کو بجز کسی حق کے جو ثابت ہو اور جسے معروف کہا جائے کسی سے کوئی چیز لینے کا مطلق اختیار نہیں، اور یہی اصول ہے جسے آگے چل کر فقہا نے قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی اور سلطان شہاب الدّین غوری کے عہد میں سلسلۂ فتوحات شروع ہوا تو جیسے جیسے راجگانِ ہند اطاعت قبول کرتے چلے گئے ان کی ریاستیں انھیں کے قبضے میں رہیں، لہٰذا وہ اپنی زمینوں یا دوسرے لفظوں میں جاگیروں کا باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے۔ فوجی جاگیریں لاوارث یا سرکاری زمینوں سے دی جاتیں جو ایک انتظامی امر تھا کہ اہلِ فوج کو ان کی خدمات کا معاوضہ ملتا رہے۔ یوں ہی پنج ہزاری، ہفت ہزاری وغیرہ مناصب کی ابتدا ہوئی۔ علاءُ الدّین خلجی نے جاگیرداری کے بجائے نقد تنخواہ کا سلسلہ جاری کیا اور سلطان محمد تغلق نے بھی یہ صورت برقرار رکھی۔ فیروز تغلق نے یہ نظام بدل کر پھر پرانا طریق رائج کر دیا، یعنی نقد تنخواہوں کے بجائے جاگیریں دینا، اس کے بعد ایک مدّت تک بدنظمی کا دور دورہ رہا، جس میں اقطاع داروں نے بھی خاصا حصّہ لیا۔ یہ بدنظمی شیر شاہ نے دُور کی، گو بجائے نقد تنخواہ کے شیر شاہی نظام میں بھی فوجی خدمات کا معاوضہ جاگیروں ہی کی صورت میں دیا جاتا تھا، لیکن اس کا دستور تھا کہ جاگیرداروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کر دیتا۔ آگے چل کر جب مغلیہ سلطنت قائم ہوئی تو اس نے بھی اکثر و بیشتر شیر شاہی نظامِ اراضی ہی پر عمل کیا۔

اقطاعِ خراج کا یہ بظاہر طویل بیان اس لیے بھی ضروری تھا کہ اقطاعِ اقلیم کی صورت میں بھی انتظامی اور فوجی دونوں قسم کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اقطاعِ خراج ہی پر عمل کیا جاتا۔ فوجی خدمات کا معاوضہ دینے کے علاوہ بادشاہ یہ طریق فوج کو وفادار رکھنے کا بھی ایک مؤثّر ذریعہ سمجھتے تھے۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیے کہ اقطاع کی اساس تو وہی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد تھا کہ عادی الارض اللہ اور اس کے رسول کی ہے جسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اقطاعِ اقلیم اور اقطاعِ خراج بعد کی چیز ہے۔ خلافتِ فاروقی میں جب حضرت تمیم داریؓ کو فتح شام کے بعد بیت اللّحم میں ایک قطعۂ زمین عطا کیا گیا تو وہ بھی اقطاعِ خراج کی کوئی ایسی مثال نہیں تھی جس کا قیاس فوجی جاگیرداری پر کیا جائے۔ انھیں یہ زمین ملی تو اس لیے کہ وہ ان کا اپنا قریہ تھا (دیکھیے کتاب الأموال، ص ۲۷۴-۲۷۵)۔ بہر حال حکومت کا عمل ہر حالت میں فقہاے اسلام کے اس فیصلے پر رہا کہ جاگیریں صرف ان ہی زمینوں سے دی جائیں گی جو حکومت کی ملکیّت ہیں اور حکومت ہی کی ملکیّت رہیں گی۔ ان کے علاوہ جو بھی زمینیں ہیں یعنی ''اراضی مملوکہ''، ان پر مالکوں ہی کا قبضہ رہے گا، چنانچہ یہی مسلک علماے ہند، مثلاً شاہ عبدالعزیز، شیخ جلال تھانیسری اور دوسرے علما و فقہا نے اختیار کیا۔

مآخذ: بنیادی کتب فقہ و حدیث و تاریخ کے علاوہ:-

(۱) ابوعبید القاسم بن سلّام: کتاب الأموال، تصحیح و تعلیق محمد حامد الفقی؛ (۲) محمد شفیع، مفتی: اسلام کا نظام اراضی، ادارۃ المعارف، کراچی؛ (۳) شیخ جلال تھانیسری: رسالۂ اراضی ہند، مخطوطہ مملوکہ محمد شفیع، مفتی، زیرِ طبع؛ (۴) ابن حزم: المُحَلّٰی، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، ۱۳۴۸ھ؛ (۵) الماوَرْدِی: الأحکام السلطانیۃ، ۱۳۳۷ھ، مصر و آستانہ؛ (۶) علاءالدین الکاسانی: کتاب البدائع والصنائع فی تَرْتِیب الشَّرائع، مطبعۃ الجمالیہ، مصر؛ (۷) السَّرَخْسی: اَلمَبْسُوط، مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۲۴ھ؛ (۸) السیُوطی: الأشباہ و النظائر، مطبعۃ المظہری، ۱۳۷۰ھ، از ہر ۱۳۴۸؛ (۹) عبدالرحمٰن الجَزِیْری: کتاب الفِقْہ علی مَذاہِب الأرْبَعَۃ، مطبعۃ دارالمامون، مصر؛ (۱۰) ابو یوسف:

کتاب الخَراج، بولاق ۱۳۰۲ھ؛ (۱۱) الجَصّاص: احکام القرآن، مطبعۃ الاوقاف الاسلامیہ، ۱۳۳۵ھ؛ (۱۲) ابن الحاج: المَدْخَل، المطبعۃ المصریہ، ۱۳۴۸ھ؛ (۱۳) الشعرانی: المِیزان الکُبریٰ، دار احیاء الکتب العربیہ؛ (۱۴) علاء الدین الحَصْکَفی: الدُّرُّالمختار، مطبع الطبی ہوگلی؛ (۱۵) ابن عابدین الشامی: رَدّالمُحتار، مطبع مجتبائی دہلی؛ (۱۶) آ، لائڈن، طبع اوّل، مع مآخذ.

(سید نذیر نیازی)

---

* **اِقْلِیم**: یونانی لفظ Klīma بمعنی مَیْلان سے ماخوذ ہے [لیکن عربی لغت کے بعض ماہروں نے اسے مادّہ ق ل م سے مشتق مانا ہے اور قَلَمَ کے معنی ہیں کاٹا اور اقلیم کو اقلیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دوسرے حصۂ زمین سے منقطع اور کٹا ہوا ہوتا ہے چنانچہ الأزہری نے اسے عربی الاصل قرار دیا ہے (لسان العرب، تحت، مادّہ)]۔ ایراٹوستھینز (Eratosthenes، م ۱۹۶ ق م) نے آباد دنیا ے معلومہ (orbis veteribus notus) کو طول بلد کے لحاظ سے سات منطقوں میں تقسیم کیا تھا، جن کی حدود اس نے محض قیاس سے معیّن کر دی تھیں۔ اِبَرْخُس (Hipparchus) [م تقریباً ۱۴۵ ق م] نے ان منطقوں کو اعراضِ بلد کے اعتبار سے مساوی کر دیا۔ مساوی عرض کی سات اقلیموں کی یہ تقسیم عربوں نے بھی اختیار کر لی، گو وہ بعض اوقات خطِ استوا کے جنوبی ملکوں کو آٹھویں اور انتہائی شمال کے ملکوں کو نویں اقلیم شمار کرتے تھے۔ الاِدْرِیسی [رک بآں] نے جغرافیے پر اپنی کتاب اقلیموں ہی کے مطابق مرتّب کی ہے۔ کسی اقلیم کی حدود متعیّن کرنے کے لیے فیصلہ کن عامل اس میں سب سے بڑے دن کا طول ہے۔ ابو الفداء کے نزدیک آباد دنیا عملاً ۱۰° اور ۵۰° عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے اور جنوب سے شمال کی طرف جاتے ہوئے ہر اقلیم میں طویل ترین دن کا طول نصف گھنٹے بڑھتا جاتا ہے۔ ذیل کی جدول میں ہفت اقلیم کی جنوبی اور شمالی حدود، ہر ایک کی جنوبی حد پر طویل ترین دن کا طول گھنٹوں میں اور ہر ایک کا عرض وطول درجوں میں دکھایا گیا ہے:-

اقلیم	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
جنوبی حد	۱۲° ۴۰′	۲۰° ۲۷′	۲۷° ۳۰′	۳۳° ۳۷½′	۳۸° ۵۴′	۴۳° ۲۲½′	۴۷° ۱۲′
شمالی حد	۲۰° ۲۷′	۲۷° ۳۰′	۳۳° ۳۷½′	۳۸° ۵۴′	۴۳° ۲۲½′	۴۷° ۱۲′	۵۰° ۲۰′
طویل ترین دن	۱۲¾	۱۳¼	۱۳¾	۱۴¼	۱۴¾	۱۵¼	۱۵¾
عرض	۷° ۴۷′	۷° ۳′	۶° ۷½′	۵° ۱۷′	۴° ۲۸½′	۳° ۴۹½′	۳° ۸′
طول	۱۷۲° ۲۷′	۱۶۴° ۲۰′	۱۵۴° ۵۰′	۱۴۴° ۱۷′	۱۳۵° ۲۲′	۱۲۶° ۲۷′	۱۱۹° ۲۳′

ساتویں اقلیم کی شمالی حد، یعنی ۵۰°، ۲۰′ شمال، پر سب سے بڑے دن کا طول ۱۶¼ گھنٹے ہے۔ تاہم ان اقلیموں کے شمال اور جنوب میں بھی آباد علاقے موجود ہیں۔ جوں جوں ہم شمال کی طرف بڑھیں ان اقلیموں کا طول بھی کم ہوتا جاتا ہے، چنانچہ بقول البیرونی [رک بآں] اقلیم اوّل کا طول شرقاً غرباً ۱۷۲°، ۲۷′ ہے یا اگر °تقریباً ۱۸⅘ فرسنگ کے برابر سمجھا جائے تو ۳۲۵۲ فرسنگ کے قریب ہے۔ قدیم حساب کے مطابق، جس میں ایک درجہ ۲۲⅔ فرسنگ کے برابر سمجھا جاتا تھا، یہ ۳۸۳۲ فرسنگ ہوتا ہے۔ اقلیم ہشتم کا طول °۱۱۹، ′۲۳ یا تقریباً ۲۲۵۵ فرسنگ (بحسابِ قدیم ۲۶۵۱ فرسنگ) ہے۔ یہ پیمائشیں ابو الفداء نے تسلیم کی ہیں.

ایرانیوں نے اقلیم (کِشوَر) کی اصطلاح بھی ان سات حصّوں یا سلطنتوں کی تعبیر کے لیے استعمال کی ہے جن میں انھوں نے دنیا کو تقسیم کیا تھا۔ یہ تقسیم عرضِ بلد پر مبنی نہیں تھی۔ انھوں نے ایران کو مرکز میں رکھ کر عرب، افریقہ، روم، ترکیہ، چین اور ہندوستان کو اس کے گرد رکھا تھا۔ کرۂ ارض کی ایسی ہی ہفت گانہ تقسیم کا ذکر المسعودی: مُرُوج الذَّہَب (باب ہشتم) میں بھی ہے۔ اس طرح لفظ اقلیم کا اطلاق مقامی طور پر کسی ملک کے لیے بھی ہونے لگا، مثلاً شام، عراق وغیرہ۔ ابولفداء اسے حقیقی یا فلکیاتی اقلیم کے مقابلے میں، جو عرض بلد پر موقوف ہے، عرف عام کی اقلیم قرار دیتا ہے.

اقلیم الرُّوْیَا ''فلکُ البُرُوج'' کا ایک اَور نام ہے.

مآخذ: (۱) رینَاو (Reinaud): *Géographie d' Aboulféda*، ۱: ccxxiv ببعد، ۸:۲ ببعد؛ (۲) *Dict. of Techn. Terms*، طبع شپرنگر (Sprenger)، لِیز (Lees) وغیرہ، ص ۱۲۲۳ ببعد؛ (۳) ابن خلدون: [مقدمۃ] *Prolegomena*، طبع کاترمیر (Quatremére) (*Notices et Extraits*) وغیرہ، ۱۶:۹۲ ببعد؛ ۱۹:۱۱۲ ببعد)؛ (۴) الہَمْدانی: *Geographie der arab Halbinsel*، طبع D. H. Müller، ص ۱ - ۴۴.

(T. H. WEIR)

---

* **اَلْاِقْواء**: علمِ قوافی کی ایک اصطلاح، عیوبِ قافیہ میں سے ایک کا نام، توجیہ یا حذو میں اختلاف کو اقواء کہتے ہیں۔ اقواء کی مختلف صورتیں بتائی گئی ہیں: (الف) (مقید یعنی ساکن حرف روی سے پہلے) قافیے کا آخری متحرّک حرف ایک شعر میں مضموم اور دوسرے میں مکسور ہو، جیسے کاکُل اور دِل؛ (ب) ایک شعر میں مفتوح ہو اور دوسرے میں مَکْسُور، جیسے دَشْت اور زِشْت؛ (ج) ایک شعر میں واو معروف ہو اور دوسرے میں واو مجہول، جیسے مقدُوْر اور گور؛ (د) ایک شعر میں یای معروف ہو اور دوسرے میں یای مجہول، جیسے نخچِیْر اور دیر (ھ) ایک شعر میں مضموم اور دوسرے میں مفتوح جیسے گُم اور ہَم۔

خلیل بن احمد کے قول کے مطابق اقواء قافیے کے آخری متحرک حرف میں کسی ایسی حرکت کی موجودگی سے پیدا ہوتا ہے جو اس کے ساتھ کے دوسرے اشعار کے قافیوں میں نہیں پائی جاتی؛ گویا یہ صورت ہو کہ اشعار میں سے بعض کے آخر میں تو 'ی' ہو اور بعض کے آخر میں 'وْ یا 'الف'۔ اس کے برخلاف دوسرے ماہروں کے نزدیک اسے اقواء نہیں کہتے، بلکہ اِصْراف یا اِسْراف کہتے ہیں۔

مآخذ: (۱) Freytag: *Darstellung*، ص ۱۶۲ و ۳۲۸؛ (۲) ابن کَیْسان، دررائٹ (Wright): *Opuscula Arabica*، ص ۵۵؛ (۳) باسے (R. Basset): *La Khagradjyah*، ص ۱۲۶-۱۲۸؛ (۴) شیخو (Cheikho): علم الأدب، ص ۴۱۳؛ (۵) محمد بن شنب: تحفة الأدب فی میزان اشعار العرب، الجزائر ۱۹۰۶ء؛ (۶) محیط الدائرۃ، ص ۱۰۹، بیروت ۱۸۵۷ء؛ (۷) ابن قتیبہ: کتاب الشعر؛ (۸) ابن رشیق: العُمْدۃ؛ (۹) مرزا محمد عسکری: آئینۂ بلاغت، لکھنؤ ۱۹۳۷ء، ص ۱۴۷؛ (۱۰) کوثر لکھنوی: سفیر سخن، مکتبۂ جدید لاہور، ص ۸۵؛ (۱۱) نجم الغنی: بحر الفصاحت، رام پور ۱۳۰۳ھ، ص ۲۵۴ ببعد؛ (۱۲) طوسی: معیار الاشعار؛ (۱۳) اوج: مقیاس الاشعار۔

(محمد بن شنب MOH. BEN CHENEB [وعبدالمنّان عمر])

---

* **اُلْاُقَیْصِر**: زمانۂ جاہلیّت میں عربوں کے ایک معبود کا نام یا یہ کہنا بہتر ہو گا کہ ایک اسمِ وصف (مصَغّرِ اَقْصَرُ بمعنی سخت گردن والا یا چھوٹے قد کا)۔ اس سے بظاہر یہ پتا چلتا ہے کہ یہ بت انسان کی شکل کا تھا۔ اس معبود کے متعلّق (جس کا اصل نام معلوم نہیں) ہمیں جو کچھ بھی معلوم ہے اس کا سرچشمہ وہ اشارے ہیں جو ابن الکلبی کی کتاب الأصنام (قاہرہ ۱۹۱۴ء)، ص ۳۸، ۳۹ و ۴۸-۵۰ میں ہیں اور یاقوت: مُعْجَم، ۱: ۳۴۰ و ۳۴۱ (ترجمہ و حواشی از ولہاوزن (Wellhausen): *Reste Arab. Heidentums*، طبع دوم، ص ۶۲-۶۴)؛ الجاحظ: الحَیَوان، ۵: ۱۱۴؛ وہی مصنّف: البخلاء [طبع فان فلوتن، لائڈن ۱۹۰۰ء؛ طبع طٰہٰ الحاجری، مطبوعۂ مصر، ص ۲۱۷، لیکن طبع احمد العوامری وعلی جارم بک، قاہرہ ۱۹۳۹ء، ص ۲: ۱۸۴ میں جہاں الجاحظ کا استشہادی شعر درج ہے اقیصر کا لفظ نہیں بلکہ شعر کی دوسری قراءت درج ہے جو جاحظ نے کتاب الحیوان میں دی ہے]، ص ۲۳۷؛ خزانۃ الأدب ۳: ۲۴۶ (تلخیص) اور محمود الآلوسی: بلوغ الأدب فی معرفۃ احوال العرب، (تلخیص) قاہرہ ۱۳۴۳ھ، ۲: ۲۰۹ میں موجود ہیں۔ الاُقَیْصر کی پرستش قُضَاعہ لَخْم-جُذام، عامِلہ اور غَطَفان کرتے تھے، جو صحرائے شام کی سطح مرتفع میں سکونت پذیر تھے۔ ابن الکلبی نے قدیم شاعروں کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں اَنْصاب الاُقَیْصر، یعنی ان پتھروں کا ذکر ہے جو عبادت گاہ کے اطراف میں رکھے جاتے تھے (ان کے متعلّق ایک شعر ہے جو لسان العرب، ۶: ۴۱ [طبع بیروت ۱۹۵۶ء، ۵: ۱۰۶-ب] میں موجود ہے۔ لیکن شاعر کا نام نہیں لیا گیا، اس شعر میں بیان کیا گیا ہے کہ مذبوحہ جانوروں کا خون ان کے اطراف سے بہتا رہتا تھا۔

[وَاَنْصابُ الأُقَیصر حِیْن اَضْحَتْ
تَسِیْلُ عَلی مَنا کِبِها الدِّماءُ]

اور اسی طرح کپڑوں [یعنی اثواب الاقیصر] کا، جن سے مراد اس بت کے کپڑے ہیں یا شاید عبادت گاہ کا وہ غلاف جو کِسوۂ کعبہ کی طرز کا ہوتا تھا؟)، خندق (جَفْر الاقیصر) کا، جس میں نذرانے ڈالے جاتے تھے اور [نَعَم الانام، یعنی] زائرین کے بھجن اور گیت کا۔ جو قربانیاں بت پر چڑھائی جاتی تھیں انھیں ہمیشہ ذبح نہیں کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ ان نذرانوں میں آٹے میں گندھے ہوئے بال بھی شامل ہوتے تھے (زمانۂ جاہلیت کے عام رواج کے مطابق، قب ولہاوزن (Wellhausen)، ص ۱۲۳-۱۲۴ اور ۱۹۸-۱۹۹)؛ اس سلسلے میں ایک قصّہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب ایک دفعہ قبیلۂ ہوازن کے لوگ قحط میں مُبتلا ہو گئے اور فاقہ کشی تک نوبت پہنچ گئی تو وہ الاقیصر کی عبادت گاہ کے اطراف میں ان نذرانوں کے بچے کھچے غلیظ ٹکڑوں کے لیے بھیک مانگنے گئے تھے۔ اس حکایت کی صحت میں بہت کچھ کلام ہے، کیونکہ قبائل ایک دوسرے کے خلاف جو ہجو یہ نظمیں کہا کرتے تھے ان میں اس قسم کے مضامین عموماً پائے جاتے ہیں، اگرچہ بجائے خود اس قصے میں کوئی بات بعید از امکان نہیں۔

جیسا کہ ولہاوزن کا خیال ہے ابن الکلبی کے نقل کردہ اشعار میں جو تعبیرات استعمال کی گئی ہیں ان میں کسی عبادت گاہ کی طرف بھی اسی طرح اشارہ ہو سکتا ہے جیسے کہ کسی بت کی طرف۔ اس صورت میں ہم فرض کر سکتے ہیں کہ الاقیصر سے اشارہ اس عمارت کی پست شکل کی طرف ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اقیصر نام کا اطلاق ایک قبیلے پر بھی ہوتا ہے (الأغانی، ۱۴: ۹۸)، افراد پر بھی (الأغانی، ۱۴: ۴۷؛ طبری، ۲: ۶۴۷، ۹۷۰، ۹۹۷، ۱۰۰۰) اور ایک تلوار پر بھی (ابن الاعرابی: *Les Livers des Chevaux*، ص ۸۷ س ۱۴)۔

مآخذ: مضمون میں آ گئے ہیں۔

(G. LEVI DELLA VIDA)

اکبر: ابوالفتح، جلال الدین محمد اکبر، بادشاہ غازی (بن ہمایوں بن بابر)، ⊗ ہندوستان میں خاندانِ مغلیہ کا تیسرا بادشاہ (۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء-۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء)۔

پیدائش: ہمایوں [رک بآں] جنگِ قنّوج (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء) میں شیر شاہ سوری [رک بآں] سے شکست کھا کر سندھ میں سرگرداں تھا کہ قلعۂ عمرکوٹ

[رک بآں] (جس کا بانی عمر سومرہ تھا؛ ابوالفضل اور بداؤنی نے امرکوٹ لکھا ہے) میں اکبر کی ولادت ہوئی (بروز یک شنبہ، ۵ رجب ۹۴۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء/ ۶ کاتک ۱۵۹۹ بکرمی/ ۱۶ تشرین الاوّل ۱۵۸۴ سکندری)۔ جوہر آفتابچی نے، جس کی حیثیت خانہ زاد کی تھی، تاریخ ۱۴ شعبان/ ۲۳ نومبر شبِ شنبہ لکھی ہے (تذکرۃ الواقعات)، لیکن یہ صحیح نہیں۔ ۱۴ شعبان کو نہ شنبہ تھا نہ یک شنبہ، بلکہ پنج شنبہ تھا۔ جہانگیر کے بارھویں فرمانِ جلوس سے بھی یک شنبے ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔ جوہر نے تذکرۃ الواقعات اکبر کی پیدائش سے پینتالیس سال بعد لکھی۔ قیاس ہے کہ اسے تاریخِ ولادت اور جشنِ چلّہ میں التباس ہوگیا، کیونکہ ۱۴ شعبان کو اکبر چالیس روز کا تھا (مفصّل بحث کے لیے دیکھیے Humayun Badsha، مرتبۂ بینرجی، ۲:۵-۷۹؛ قب Smith: The Date of Akbar's Birth، در Indian Antiquaries، نومبر ۱۹۱۵ء، ۴۴: ۲۳۳-۲۴۴)۔

کم سنی: اکبر کی شیر خوارگی اور کم سِنی کا ماحول بڑا پُرآشوب تھا۔ وہ نو ماہ کا تھا جب ہمایوں نے ہندوستان چھوڑا (۷ ربیع الثانی ۹۵۰ھ/ ۱۰ جولائی ۱۵۴۳ء) اور قندہار و کابل کا قصد کیا کہ بھائیوں کی مدد سے ازسرِنو طالع آزمائی کی جائے لیکن شال (موجودہ کوئٹہ) پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائیوں سے نہ صرف اعانت ہی کی کوئی امید نہیں بلکہ ان کے ہاتھوں گرفتاری کا بھی خطرہ ہے؛ چنانچہ وہ مستونگ کی طرف پلٹا اور فیصلہ کرلیا کہ ایران کے راستے حرمین شریفین چلا جائے۔ بچے کو اس طویل اور کٹھن سفر میں ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا، لہٰذا اسے شمس الدین خان اتکہ، اس کی بیوی جی جی انگہ اور دوسری اتاما ہم انگہ کے ہمراہ بھائیوں کے پاس بھیج دیا اور خود بائیس رفیقوں کے ساتھ ایران روانہ ہوگیا۔

عسکری میرزا، کامران کی طرف سے قندہار کا حاکم تھا۔ اس کی لاولد بیوی سلطان بیگم نے اکبر کو بیٹے کی طرح پالنا شروع کیا۔ ۱۵۴۴-۱۵۴۵ء کے سرما میں ہمایوں کی مراجعت کی افواہیں اُڑیں تو اکبر کو قندہار سے کامران کے پاس کابل بھیج دیا گیا۔

ستمبر ۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے پہلے قندہار پھر نومبر میں کابل فتح کیا تو کم و بیش دو سال کے بعد بیٹے سے ملا؛ تاہم دورِ آزمائش ابھی ختم نہ ہوا۔ ہمایوں نے بدخشاں کا رخ کیا اور وہاں بیمار پڑ گیا تو کامران دوبارہ کابل پر قابض ہوگیا اور ہمایوں نے واپس آکر کابل کا محاصرہ کیا اور بالاحصار پر گولہ باری شروع کردی تو ظالم چچا نے اکبر کو گولوں کی زد میں فصیل پر بٹھا دیا، لیکن اکبر پر کوئی آنچ نہ آئی، شہر فتح ہوگیا اور کامران وہاں سے نکل گیا۔ بعد میں بھی اس کی اور عسکری کی فتنہ انگیزیاں جاری رہیں۔ آخر عسکری کو گرفتار کرکے حجاز بھیج دیا گیا اور اس نے راستے میں وفات پائی۔ کامران کے ایک شب خون میں ہندال، جو ہمایوں کے ساتھ تھا، مارا گیا۔ آخر کامران بھی گرفتار ہوا اور امرا کے اصرار پر اس کی آنکھوں میں سلائی پھروائی گئی اور حجاز روانہ کردیا گیا۔ اس کے بعد ہمایوں کو اطمینان نصیب ہوا (۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء)۔

تعلیم: اس پُرآشوب دور میں اکبر کی تعلیم کا کوئی مستقل انتظام ممکن ہی نہ تھا۔ چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں مکتب نشینی کی رسم ادا ہوئی اور ملّا زادہ عصام الدین ابراہیم اتالیق مقرّر ہوا۔ لیکن اکبر کو تعلیم کی طرف چنداں رغبت نہ تھی۔ اسے اتالیق کی ناکامی سمجھا گیا اور اس کی جگہ مولانا بایزید کا تقرّر ہوا، مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوسکے۔ آخر ہمایوں نے تین بڑے عالموں کے نام پر قرعہ ڈال کر مولانا عبدالقادر کو منتخب کیا، جو فقہ، حدیث اور تاریخ کے عالم تھے، مگر شاہ زادے کی بے رغبتی میں کوئی فرق نہ آیا اور گردوپیش کی پریشانیاں اس بے رغبتی کو تقویت پہنچاتی رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابر کے اخلاف میں بہادر شاہ ثانی تک اکبر کے سوا سبھی بادشاہ رسمی تعلیم سے بہرہ ور ہوے۔ بااین ہمہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بادشاہ سلامت مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ روانی سے پڑھتے تھے (''طبع الہام پذیر آں حضرت بہ گفتن نظم ہندی و فارسی بغایت موافق افتادہ... بادشاہ سلامت مثنوی مولوی و دیوانِ لسان الغیب خود بہ سعادت رواں می خوانند و از حقائق و لطائف آں التذاذ می یابند''۔ اکبر نامہ، دفتر اوّل، ص ۲۷۰-۲۷۱)۔

اکبر کی طبیعت حقائق رس تھی۔ وہ بے حد ذہین و فطین تھا۔ علاوہ بریں اس نے فنونِ سپہ گری یعنی شہسواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی میں مہارت تامّہ بہم پہنچائی اور ملک داری کے اسرار و رموز سے بھی وہ ابتداے عمر ہی میں آشنا ہوگیا۔

انتظامی امور کا تجربہ: ابتدا میں اکبر کو موضع چرخ (لوہ گر، افغانستان) جاگیر میں ملا تھا۔ ہندال کی وفات پر اس کی جاگیر اور حکومتِ غزنہ اکبر کے حوالے کردی گئی اور اس نے چھے مہینے غزنہ میں گزارے۔ پھر ہمایوں نے اپنے پاس بلا لیا اور فتحِ ہند کا قصد کیا تو ساتھ لے لیا۔ ماچھی واڑہ اور سرہند کی لڑائیوں میں سکندر شاہ شکست کھا کر کوہستانِ شوالک کی طرف بھاگ گیا (۱۵۵۵ء)۔ ہمایوں دہلی اور آگرے پر قابض ہوگیا۔ اکبر کو بیرم خان کی اتالیقی میں سکندر کے تعاقب کی غرض سے پنجاب روانہ کیا گیا۔ اس زمانے میں اکبر نے جو کچھ سیکھا بیرم خان سے سیکھا۔

تخت نشینی اور بیرم خانی دور: ہمایوں نے اچانک ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو دہلی میں وفات پائی۔ بیرم خان کو یہ خبر ملی تو کلانور (ضلع گورداس پور) میں اکبر کی بادشاہت کا اعلان کردیا (۳ ربیع الثانی ۹۶۳ھ/ ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء)۔ ہمایوں کی وفات کے ساتھ ہی سلطنت میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ جو حکمران لاہور، دہلی اور آگرے میں شکستیں کھا کر راہِ فرار ڈھونڈ رہے تھے ان کی ہمتیں بڑھ گئیں اور افغانستان و ہندوستان میں شورشیں برپا ہونے لگیں۔ اس وقت بیرم خان اور ہمایوں کے دیگر معتمد رفیقوں کی وفاداری اور عالی ہمتی کام آئی۔ کابل پر میرزا سلیمان، حاکمِ بدخشاں، کا حملہ ناکام بنا دیا گیا، نارنول پر راجہ بہاری مل کی خیر خواہی کے باعث شاہی فوج کا قبضہ ہوگیا اور شاہ ابوالمعالی کی بروقت گرفتاری سے ایک خطرناک فتنہ اٹھنے سے پیشتر ہی دب کر رہ گیا۔ لیکن یہ مسائل اس بلا کے سامنے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے جو عادل شاہ سوری کے وزیر ہیموں بقال کی صورت میں

نازل ہوئی۔ ہیموں نے پہلے آگرے میں سکندر خان ازبک، پھر دہلی میں تردی بیگ کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا اور راجا بکرماجیت کا لقب اختیار کر کے اس نیّت سے پنجاب کی طرف بڑھا کہ مغلوں کو ہندوستان سے نکال دے۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ اپنا راج قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ پانی پت کے قریب علی قلی خان شیبانی نے اس کی ہراول فوج پر حملہ کر کے پورے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰ محرّم ۹۶۴ھ/ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کے میدان میں دوسری بار معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ بازی ایک بار پھر مغلوں کے ہاتھ رہی۔ اس جنگ میں سب سے بڑا کارنامہ علی قلی خان شیبانی ہی کا تھا، جسے خان زمان کا خطاب دیا گیا۔ ہیموں بری طرح زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور اکبر کے دربار میں پیش ہوتے ہی بیرم خان نے اس کی گردن اڑا دی۔ اس فتح کے بعد دہلی اور آگرے پر اکبر کا پھر سے قبضہ ہو گیا۔

سلطنت کے استحکام کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اردگرد کی خودمختار ریاستوں اور سرکش سرداروں کو مطیع کیا جائے، بالخصوص افغانوں کے دماغ سے بادشاہت کا خیال نکال دیا جائے؛ چنانچہ سب سے پہلے سکندر سور کے خلاف اقدامات ضروری سمجھے گئے، جو مان کوٹ (علاقۂ جمّوں) میں محصور ہو گیا تھا۔ ۲۷ رمضان ۹۶۴ھ/ ۲۴ مئی ۱۵۵۷ء کو اس نے اطاعت قبول کر لی اور بہار چلا گیا۔ یوں پورا پنجاب اکبر کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اسی سال اجمیر پر اور ربیع الثّانی ۹۶۶ھ/جنوری - فروری ۱۵۵۹ء میں گوالیار پر قبضہ ہو گیا۔ اواخر ۹۶۶ھ/ ۱۵۵۹ء تک خان زمان نے عادل شاہ کے امرا کو شکست پر شکست دے کر سنبھل سے لکھنؤ اور الٰہ آباد سے جون پور تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ سلطنت کی یہ بحالی بڑی حد تک بیرم خان کی سعی و محنت کا نتیجہ تھی۔ وکیلِ سلطنت کی حیثیت سے اسے وسیع اور غیر محدود اختیارات حاصل تھے اور اس کی ذات سلطنت کی بقا کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب فوری خطرات کا سدّ باب ہو گیا تو اس کے بہت سے اقدامات، جو سیاسی مصلحتوں اور ملکی ضرورتوں کے لیے ناگزیر تصوّر کیے جاتے تھے، ذاتی مفاد پر مبنی نظر آنے لگے (مثلاً تردی بیگ کا قتل اور پیر محمد کا تنزل)۔ اِدھر اکبر جوان ہو رہا تھا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں تھامنے کے لیے مضطرب تھا، اُدھر بیرم خان کے مخالفین، خصوصاً اکبر کی انا ماہم انگہ اور ''اتکہ خیل'' کی محلّاتی سازشیں پورے عروج پر پہنچ چکی تھیں؛ چنانچہ ۲۰ جمادی الاُخرٰی ۹۶۷ھ/ ۲۷ مارچ ۱۵۶۰ء کو اکبر نے بیرم خام کو حرمین جانے کی اجازت دے دی اور تمام شاہی اختیارات خود سنبھال لینے کا اعلان کر دیا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا، لیکن ماہم انگہ کی شازش سے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ بیرم راستے سے پلٹ کر مسلّح مخالفت پر آمادہ ہو گیا، پھر شکست کھا کر اطاعت قبول کر لی اور حج کے لیے روانہ ہو گیا، لیکن کھمبایت میں مبارک خان لوحانی کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا (۱۴ جمادی الاولٰی ۹۶۸ھ/ ۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء)۔

توسیعِ سلطنت: ۱۵۶۱ء میں ہندوستان کی صورت حال یہ تھی کہ پنجاب اور دوآبے کے علاوہ وسطِ ہند میں گوالیار اور راجپوتانے میں اجمیر کے علاقے اکبر کی سلطنت میں شامل تھے۔ کشمیر، گجرات اور خاندیش میں اسلامی ریاستیں تھیں۔ راجپوتانہ اور گونڈوانہ مختلف خودمختار راجواڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ بہار و بنگال میں سلیمان کررانی افغان کی حکومت تھی۔ دکن میں برار، بیدر، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈے کی پانچ مسلمان ریاستوں کے علاوہ وجیانگر کی ہندو ریاست تھی اور جنوبی ہند میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے علاوہ بعض ساحلی مقامات پر پرتگیز قدم جمارہے تھے۔

شمالی ہند کی تاریخ جغرافیائی اور سیاسی حالات کے تحت مرکز کی طرف مائل اور مرکز سے نفور قوتوں کے درمیان کشمکش سے عبارت رہی ہے، لہٰذا بیرم خان نے یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ جہاں ایک مضبوط مرکزی حکومت کے قیام کے لیے چھوٹی بڑی خودمختار ریاستوں کی تسخیر ناگزیر ہے وہاں رعایا کی مؤثّر حفاظت اور ان کی پرامن زندگی کی ضمانت بھی پورے شمالی ہند کو ایک مرکز کے تحت لائے بغیر ممکن نہیں۔ اکبر نے بیرم سے ملک گیری اور عملی سیاست کے گراں قدر تجربے حاصل کیے تھے۔ جوان مردی، عالی ہمتی اور مستقل مزاجی کے علاوہ اس میں تدبّر اور دوراندیشی کا مادّہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا؛ چنانچہ اس نے پوری توجہ توسیعِ مملکت کی طرف مبذول کر دی اور صرف آٹھ سال کی قلیل مدّت میں مالوہ (۹۶۸ھ/ ۱۵۶۱ء)، گونڈوانہ (۹۷۱ھ/ ۱۵۶۴ء)، رنتھمبور (۹۷۶ھ/ ۱۵۶۹ء)، کالنجر (۹۷۷ھ/ ۱۵۶۹ء)، گجرات (۹۸۰ھ/ ۱۵۷۲-۱۵۷۳ء) اور بنگال (۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء) کے علاقے اپنی قلم رو میں شامل کر لیے۔ اس دوران میں ایک طرف تو کالنجر، رنتھمبور، گوالیار اور چتوڑ جیسے ناقابلِ تسخیر قلعے فتح کر کے اپنی عسکری قابلیت اور فوجی قوت کا سکّہ بٹھایا اور مقامی حکمرانوں کو یہ احساس دلایا کہ ان کی حکومتیں اور جاگیریں اب بادشاہ کی اطاعت کیے بغیر باقی نہیں رہ سکتیں دوسری طرف ادہم خان، خان زمان، بہادر خان اور عبداللہ خان ازبک جیسے نامور اور طاقت ور سرداروں کی بغاوتیں کچل کر ثابت کر دیا کہ مغلیہ سلطنت غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہو چکی ہے۔ ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۶ء تک اکبر کم و بیش پورے شمالی ہند کو زیرِ نگیں لا چکا تھا۔ بعد میں بھی حدودِ مملکت میں توسیع جاری رہی اور بعض ایسے صوبے بھی فتح کر لیے گئے جہاں پیشتر سلطنتِ دہلی کا پرچم کبھی نہیں لہرایا تھا۔ ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء میں کشمیر، ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۱ - ۱۵۹۲ء میں سندھ، ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۴ء میں بلوچستان و مکران اور رجب ۱۰۰۳ھ/ اپریل ۱۵۹۵ء میں قندہار فتح ہوا۔ پھر اکبر نے دکن کی ریاستوں کا رخ کیا۔ ۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۱ء تک برار و خاندیش کے علاوہ احمد نگر کا ایک حصّہ بھی سلطنت مغلیہ کا جزو بن چکا تھا۔

اکبر کا شمار دنیا کے عظیم فاتح بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ فان نوئر (von Noer) کا قول ہے کہ بادشاہ اکبر نے ملک گیری کی ہوس میں تلوار نہیں اٹھائی تھی (*Kaiser Akbar*، ۲:۲۳۱)، لیکن اس کی کتاب کی انگریزی مترجم مسز اینٹ بیورج (Annette Beveridge) اپنے مقدمے میں لکھتی ہے: ''اکبر کا ایمان تھا کہ تفوّق و برتری فی نفسہٖ قابلِ قدر چیز ہے اور اسی لیے اسے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے پاس دولت بھی تھی اور فوجیں بھی، دونوں سے اس نے کام لیا اور بلا تأمّل ایک علاقے کے بعد

دوسرا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرتا چلا گیا‘‘۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد عہدِ حاضر کے تصوّرات کی روشنی میں توسیعِ سلطنت کے جواز وعدم جواز پر بحث بے محل ہے۔ اکبر کے عہد میں توسیعِ سلطنت عظمت و برتری کا نشان تھی اور اس وسیع ملک کو بدامنی کے گوناگوں خرخشوں سے محفوظ کر لینے کی بھی یہ ایک مؤثر تدبیر تھی، مزید براں قدم قدم پر ایسے حالات پیدا ہوتے گئے کہ آگے بڑھنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اکبر کے جانشینوں میں جب تک صلاحیّت باقی رہی انھوں نے توسیع کا سلسلہ جاری رکھا اور قابل حکمرانوں نے نظم ونسق کی اصلاح، رعایا کی بہبود وخوش حالی یا ملک کی آبادی اور ترقی کو نصب العین بنائے رکھا۔

اصول حکومت: اکبر کی عظمت کا انحصار محض فوجی کارناموں پر نہ تھا۔ قدرت نے اسے تنظیم کی غیر معمولی صلاحیت بخشی تھی۔ اس نے اپنی جنگی مہمّات کے ذریعے فتح کی ہوئی سلطنت کے استحکام کے لیے جامع اصول وضع کیے۔ اس کے اندر جزئیات پر حاوی ہوجانے کی اہلیت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اس نے مفتوح دشمنوں، شکست خوردہ مخالفوں، مغلوب باغیوں اور سرکش عہدے داروں کے ساتھ اکثر جس شفقت و درگزر سے کام لیا وہ اس کی فطرت اور حالات دونوں کا تقاضا تھا۔ ایک مرکز سے اتنے وسیع رقبے کو فتح کرنے کی مشکلات اور اپنی افواج کو مختلف سمتوں میں مصروف رکھ کر ان کی طاقت کو تقسیم کر دینا بدیہی طور پر خالی از خطر نہ تھا۔ اس کے لیے دانش مندانہ مسلک یہی تھا کہ اگر مقامی سردار اور حکمران اس کی پیش قدمی پر سرِ اطاعت خم کر دیں تو اسے قبول کر لے اور جگہ جگہ کثیر التعداد نیم آزاد سرداروں کو مقامی طور پر اپنا اثر و اقتدار قائم رکھنے کی اجازت دے دے۔ وہ استحکامِ سلطنت کی خاطر سب کے ساتھ صلح اور سب کے لیے امن چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنے اَعزّا (مرزا محمد حکیم، ادہم خان اور سلطان میرزا کے بیٹے بھتیجے) اور دوسرے مغل اور ایرانی امرا (خان زمان، بہادر خان، منعم خان وغیرہ) کی مسلسل بغاوتوں اور سازشوں کے باعث اس کے سامنے یہی راستہ رہ گیا تھا کہ جو طبقے عقیدت و اخلاص کا ثبوت دیں ان پر بذلِ التفات میں تأمّل نہ کرے۔ یہی سبب ہے کہ اس نے فتوحات ملکی کے ساتھ ساتھ ذی اقتدار مقامی افراد کی تالیفِ قلوب کا بھی خاص خیال رکھا۔

سلاطین دہلی کو تین خطروں کا سامنا ہمیشہ رہا: اوّل بیرونی حملہ؛ دوم حکمران جماعت کے منچلے افراد کی ہوسِ استقلال؛ سوم مقامی مقتدرین کی سرکشی؛ لہٰذا ازمنۂ وسطیٰ میں ہر حکومت کے لیے قیام و استحکام کا انحصار فوجی قوت پر تھا۔ پھر حکمران طبقے اور رعایا کو فرمانبرداری پر استوار رکھنے کے لیے درشتی ونرمی، ترہیب و ترغیب اور دہشت وشفقت دونوں سے کام لینا ضروری تھا؛ چنانچہ حکمتِ عملی یہ ٹھیری کہ فوجی طاقت، اتحادِ مرکز اور رعایا کے معاملات میں عدم مداخلت کو اصولِ سلطنت بنایا جائے۔ اس سلسلے میں تین تجربے قابلِ ذکر ہیں: ۱- التتمش نے اپنی سلطنت کے کئی حصّے کر کے ہر حصّہ ایک ایک امیر کو جاگیردارانہ فرائض وحقوق کے اصول پر عطا کر دیا اور مرکز میں پرخلوص حامیانِ سلطنت (امرائے چہل گانہ) کی ایک جماعت رکھی تاکہ اس کے ذریعے فوجی سرداروں اور جاگیرداروں کی طاقت اور سرگرمیوں پر دباؤ قائم رہے؛ ۲- شاہانِ تغلق کے عہد میں فوجی جاگیرداروں کو جاگیرداری سے متعلقہ حقوق وفرائض کے ساتھ باقی رکھا گیا، لیکن ان کے لیے آمد کا حساب مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرنا لازمی قرار پایا؛ ۳- خاندان لودھی کی حکومت قبائلی اصول پر قائم ہوئی، یعنی بادشاہ بھی ایک سردار تھا، جسے باقی سرداروں نے اپنی رضامندی سے سلطنت سونپ دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں بادشاہ اپنے سرداروں سے نہیں الجھ سکتا تھا۔ سکندر لودھی نے اس نظام کو حسن تدبیر سے بدلنے کی کوشش کی۔ ابراہیم لودھی نے قوّت سے کام لینا چاہا اور حکومت کی بنیاد متزلزل ہوگئی۔ غرض مجموعی اعتبار سے سلطنت دہلی کی تاریخ شاہی حکومت اور جاگیرداروں کی باہمی کشمکش کی داستان ہے۔ مستعد اور طاقتور بادشاہ کا سایہ اٹھتے ہی امرا حصولِ اقتدار، بلکہ حصولِ تخت وتاج میں مصروف ہوجاتے اور مقامی جنگ جو افراد کی اعانت سے مرکزی وحدت کو نقصان پہنچاتے رہتے۔ بابر نے حصولِ اقتدار کے ان خوابوں کو بڑی حد تک ملیامیٹ کر دیا تھا، لیکن اسے کسی مستقل اصلاح کا موقع نہ ملا۔ شیر شاہ نے تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز رکھے، لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی حکومت کا پورا شیرازہ بکھر گیا۔ ہمایوں نے دوبارہ تخت پر قبضہ کیا تو اسے موت نے مہلت نہ دی۔ درحقیقت مسلمانوں کی سہ صد سالہ حکومت کے تجربات ونتائج کی روشنی میں تعمیرِ نو کا کام اکبر کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔

نظامِ حکومت: اکبر نے بیرم خان کی معزولی کے بعد خود اختیارات سنبھالے تو وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی وزیر کو غیر محدود اختیارات سونپ کر خود مختاری کے خواب دیکھنے کی اجازت نہ دے گا، چنانچہ اس نے سیاسی و مالی امور شہاب الدین عاملِ دہلی کے سپرد کر کے ماہم اَنگہ کو اس کا شریکِ کار ٹھیرایا۔ منعم خان کو خانخانان کا خطاب عطا ہوا۔ اتکہ خان کو بیرم کا طبل وعلم اور چند ماہ بعد وکالت کا منصب بھی دے دیا گیا۔ ادہم خان کے ہاتھوں اتکہ خان کے قتل کے بعد منعم خان اور شہاب الدین فرار ہوگئے۔ اب اکبر کا قطعی اختیار مسلّم ہوگیا۔ وکیل کا منصب کچھ عرصے کے لیے موقوف کر دیا گیا۔ جب آگے چل کر بعض اوقات چند امرا کا اس عہدے پر تقرّر بھی ہوا تو وہ اصل اختیارات سے محروم ہی رہے۔ اکبر کے عہد میں حسب ذیل امرا وکیل رہے: شہاب الدین (۶ جلوس)، اتکہ خان (۷ جلوس)، منعم خان (۷ - ۱۲ جلوس)، مظفر خان (۲۲ - ۲۴ جلوس)، عبدالرحیم خانخانان (۳۴ جلوس)، میرزا عزیز کوکہ (۴۰ - ۵۰ جلوس)۔ یہ سب اکبر کے نزدیک معتمد علیہ اور قابلِ احترام رہے۔

وکیل کے علاوہ اکبر کے عہد میں تین باقاعدہ وزیر تھے، یعنی مال گزاری اور مالیات کے لیے دیوانِ کل یا دیوانِ اعلیٰ، فوجی امور کے لیے میر بخشی اور مذہبی امور وعدلیہ کے لیے صدر الصدور۔ یہ سلطنت کے چار ستون تھے اور اپنے اپنے شعبوں کے سربراہ، لیکن ان کے فرائض میں اکبر نے ایسی ہم آہنگی پیدا کر دی تھی

کہ وہ مختلف امور میں ایک دوسرے سے ربط ضبط قائم رکھنے پر مجبور تھے۔

دیوان، سلطنت کا سب سے زیادہ ذمّے دار فرد ہوتا تھا۔ اس عہدے پر یکے بعد دیگرے مظفر خان، خواجہ شاہ منصور، راجا ٹوڈرمل، وزیر خان، قلیچ خان، میر فتح اللہ شیرازی، خواجہ شمس الدین، رائے پاتر داس، آصف خان قزوینی اور مقیم (وزیر خان) فائز ہوے۔ مالیات کا سربراہ ہونے کی بنا پر دیوانِ اعلیٰ کے سامنے دوسرے وزرا کے اختیارات ماند پڑ جاتے تھے۔ اکبر بھی کارکردگی اور وفاداری کی وجہ سے ان کی عزت کرتا تھا، لیکن نظم وضبط کے پیشِ نظر اس نے ان کے خلاف سخت سے سخت کارروائی میں بھی تامّل نہ کیا اور یہ روایت قائم کر دی کہ ہر خدمت صرف ایسے شخص کے سپرد کی جائے جو اس کا اہل ہو، خواہ اس کا درجہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اور امتیاز و ترقی کا انحصار ہر فرد کی استعدادِ کار اور وفاداری پر ہونا چاہیے۔

چونکہ تمام عسکری و کشوری اختیارات ایک ہی وزیر کے حوالے کر دینے میں بڑے خطرات تھے اس لیے بلبن نے فوجی محکمہ ایک اَور وزیر کے حوالے کر دیا تھا، جسے ''دیوانِ عرض'' کہتے تھے۔ اکبر کے عہد میں اس کا نام میر بخشی ہو گیا۔ چونکہ فوج کا تعلّق منصب داری اور جاگیرداری سے بہت گہرا تھا اس لیے میر بخشی کا عمل دخل صرف اپنے محکمے تک نہ رہا بلکہ وہ دیوان کا شریک بھی ہو گیا۔ عہدِ اکبری کے میر بخشیوں میں لشکر خان، شہباز خان کمبوہ، آصف خان قزوینی اور شیخ فرید قابلِ ذکر ہیں۔

صدر الصدور فقہا کی راے میں بادشاہ اور رعایا کے درمیان رابطہ، احکام شرعی کا علم بردار اور علما کا نقیب تھا، جو قانون و مذہب سے متعلق بادشاہ کو مشورہ دیتا، احکامِ شرعی کے مطابق امرا و ارکان کو ہدایات جاری کرتا، علما پر نگرانی رکھتا اور اہلِ علم، طلبہ اور دیگر مستحق افراد کو وظیفے اور جاگیریں دیتا۔ چونکہ قانون کی بنیاد شریعت پر تھی لہٰذا وہ محکمۂ قضا کا صدر بھی تھا۔ اکبر نے آہستہ آہستہ اس کے اختیارات سلب کر لیے۔ اس سے ایک تو وظیفے اور جاگیریں بطورِ خود عطا کرنے کا حق چھین لیا گیا اور سب صوبوں میں الگ الگ صدر مقرر کر دیے گئے، دوسرے بادشاہ بذاتِ خود اس کے کام کی نگرانی کرنے لگا۔ شیخ گدائی کمبوہ، خواجہ محمد صالح، شیخ عبدالنبی، سلطان خواجہ، میر فتح اللہ شیرازی اور دیوان صدر جہان اس دور کے صدر الصدور تھے۔

ان چار وزارتوں کے علاوہ کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم تھا، جس کا سربراہ میر سامان کہلاتا تھا۔ آئین اکبری میں اس کے فرائض و اختیارات کی تشریح نہیں ملتی، البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ میر سامان مع دیوان بیوتات دیوانِ سلطنت کے ماتحت تھا۔ ہر کارخانے کا ایک داروغہ اور ایک تحویل دار ہوتا تھا۔ حسابات کی پڑتال ''مستوفی'' کے حوالے تھی، دفتری عملے کی نگرانی ''داروغۂ کچہری'' کے سپرد تھی۔ ''ناظر'' دیوانی محکمے کا سربراہ تھا اور ''مشرفِ کل و جز'' صدر محاسب۔ شاہی محل میں حفاظتی دستے کے سالار کے علاوہ ''میر عرض'' اور ''میر بکاول'' کے عہدوں پر بھی بڑے معتمد امرا کا تقرر ہوتا تھا۔ حکیم ہمام میر بکاول، نورتنوں میں سے تھا۔

باقاعدہ وزرا کے علاوہ دوسرے درباریوں کو بھی امورِ مملکت سونپے جاتے تھے، چنانچہ حکیم ابوالفتح اور زین خان کوکہ کو دیوان کے دفتر میں بیٹھ کر معاملات سے باخبر رہنے کا حکم دیا گیا۔ مشاورت کی مجالس میں شرکت محض وزرا تک محدود نہ تھی۔ کبھی کبھی بعض امرا کو وزرا سے بھی زیادہ اقتدار مل جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال ابوالفضل ہے، جو کبھی وکیلِ سلطنت، دیوان اعلیٰ یا میر بخشی مقرر نہ ہوا، لیکن عملاً وہ وزیر اعظم کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اکبر کے نورتنوں یعنی مقرّب ترین امرا کی جو تصویر ملتی ہے (The Victoria Memorial Collection، کلکتہ) اس میں اکبر کے علاوہ حسب ذیل افراد شامل ہیں: راجا مان سنگھ، راجا ٹوڈرمل، حکیم ہمام، ملّا دوپیازہ، فیضی، ابوالفضل، مرزا عبدالرحیم، تان سین۔ ان میں سے راجا ٹوڈرمل اور مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے سوا کوئی شخص بھی منصب وزارت پر فائز نہیں ہوا، لیکن یہ سب بادشاہ کی جلوت و خلوت میں شریک راز اور مشیر کار رہتے (ملّا دوپیازہ کی شخصیّت اور اس کے حالات کے بارے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ ان کا جائزہ حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون میں لیا ہے، دیکھیے اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۳۹ء)۔

دراصل اکبر نے وزارت کا نظام اس طرح منضبط کیا تھا کہ تمام وزیروں کے کام کی تقسیم میں توازن اور ربط باہمی قائم رہے اور اس امر کا امکان پیدا نہ ہونے پائے کہ سارے اختیارات کسی ایک وزیر کے ہاتھ میں آجائیں یا کوئی وزیر باقی وزرا پر حاوی ہو جائے۔ وہ خود ان کی تمام سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتا اور اس سلسلے میں اپنے معتمد امرا کو بھی شریک کر لیتا۔ یہ پورا نظام متحرک تھا۔ ہر محکمے میں اوپر سے نیچے تک ہر شخص اپنی حیثیت اور فرائض سے واقف تھا۔ ضابطۂ کار معین تھا اور اس کی پابندی ہر شخص کے لیے لازم تھی، حتّٰی کہ خود بادشاہ بھی قواعد و ضوابط کا احترام کرتا۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ متخالف عناصر بھی متحدرہ سکیں اور ساتھ ہی ہر شخص کی اہلیت اور خدمت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔

تقسیمِ سلطنت: اکبر کی سلطنت پندرہ صوبوں میں منقسم تھی: (۱) کابل مع کشمیر، (۲) لاہور، (۳) ملتان مع سندھ، (۴) دہلی، (۵) اودھ، (۶) آگرہ، (۷) اجمیر، (۸) احمد آباد، (۹) مالوہ، (۱۰) الٰہ آباد، (۱۱) بہار، (۱۲) بنگال، (۱۳) خاندیش، (۱۴) برار، (۱۵) احمد نگر۔ ہر صوبے میں ایک نائب السلطنت یا سپہ سالار مقرّر ہوتا تھا۔ اسے ملکی اور فوجی امور میں پورے اختیارات حاصل تھے، لیکن اس سلسلے میں جو احکام دیے جاتے تھے ان کے لیے بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ اس کے ماتحت مال گزاری کا کام تحصیل دار، قانون گو، پٹواری وغیرہ کے سپرد تھا۔ فوج دار اپنے اپنے اضلاع میں بے قاعدہ سپاہیوں، قواعد دان فوجوں، جنگی کارخانوں اور متعلّقہ جاگیروں پر متعین ہوتے اور بدنظمی کی اصلاح کرتے۔

فوج: اکبر سے پہلے یہ دستور تھا کہ امرا کو فوج رکھنے کے لیے جاگیریں عطا ہوتیں اور محاصلِ ملک سے وظائف مقرر کر دیے جاتے، مگر موجودات کے وقت جاگیردار اِدھر اُدھر سے بیگاری اور مانگے تانگے کے گھوڑے اور ہتھیار لے کر حاضر ہو جاتے۔ ظاہر ہے ایسی فوج غنیم کے سامنے کہاں تک ٹھیر سکتی تھی۔ اس کی

اصلاح کے لیے اکبر نے فوجیوں کو حتی الامکان خزانے سے نقد تنخواہ دینا شروع کی، ہر سپاہی کا حلیہ فوج کے کاغذات میں درج کرایا، گھوڑوں پر سرکاری داغ ڈلوائے اور تنخواہ سے پہلے حاضری ضروری قرار دی گئی۔ بایں ہمہ اکبر کی فوج کو صحیح معنی میں آراستہ و پیراستہ اور انتظام یافتہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ یہ اس طرح منقسم نہ تھی کہ اس کے مختلف حصّوں کے افراد اور ان کے افسروں کی تعداد معیّن ہو سکے۔ قاعدہ یہ تھا کہ ضرورت پر افسر متعیّن کیے جاتے، جو منصب دار کہلاتے۔ منصب داری دہ ہزاری، پنج ہزاری سے دس سپاہیوں تک مقرر ہوتی۔ بڑی بڑی منصب داریاں محض نام کی تھیں اور ان سے غرض یہی تھی کہ منصب داروں کی تنخواہیں اور درجے مقرر کیے جائیں۔ ہر منصب دار شاہی اجازت کے مطابق اپنی اپنی فوج بھرتی کرتا، جو بالعموم اس کی منصب داری کے دسویں حصّے کے برابر ہوتی۔ واجب تھا کہ نصف سوار اور نصف پیادے ہوں اور پیادوں کی چوتھائی تعداد توڑے دار بندوقچیوں اور باقی تیر اندازوں پر مشتمل ہو۔ موجودات کے بعد اس فوج کی تنخواہ سرکاری خزانے سے ملتی تھی۔ منصب داروں کی ان ہی فوجوں سے شاہی فوج مرتب ہوتی تھی۔ دہ ہزاری، ہشت ہزاری، ہفت ہزاری مناصب شہزادوں کی لیے مخصوص تھے۔ امرا میں انتہاے ترقی یہ تھی کہ وہ پنج ہزاری بنا دیے جائیں۔ دو صدی سے پنج ہزاری کے منصب داروں کی کل تعداد ساڑھے چار سو سے زیادہ نہ تھی۔ منصب داروں کی افواج کے علاوہ ایک اَور بڑا گروہ ایسے سواروں کا تھا جو تنہا کام کرتے تھے۔ یہ ''اَحَدی'' کہلاتے تھے اور کسی فوج میں داخل نہ ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ اہلیت پر منحصر تھی، جو عام سواروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ بقول ابوالفضل فوج کی کل تعداد چوالیس لاکھ تھی، جس میں کچھ مبالغہ نظر آتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں توپ خانہ اور غیر قواعد دان پیادوں کے علاوہ دو لاکھ سوار جرّار تھے۔ غالبًا اکبر کے ہاں بھی تعداد اس سے زیادہ نہ ہوگی۔

صیغۂ مال: محاصلِ ملک کے بارے میں اکبر کا انتظام بہت مشہور و معروف ہے اور اسے اس کی ''ایجادات'' میں بتایا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے پہلے انتظامات میں اصلاح و درستی کی اور شیر شاہ کے نظام کا کامل اجرا کیا۔ اکبر کی مالی حکمت عملی تین تجربوں پر مبنی تھی۔ ان کی روشنی میں ایک مستقل طریقہ جاری ہوا (۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء)، جو دہ سالہ بندوبست کے نام سے موسوم ہے۔ قابلِ زراعت زمین کی ٹھیک ٹھیک پیمائش اور ہر بیگھے کی مقدار پیداوار دریافت کرنے کے بعد پچھلے دس برسوں کی جمع بندی کے مطابق آئندہ دس برسوں کی جمع بندی کی گئی۔ سرکاری کاغذات میں اقسامِ اراضی اور پیمائش کا حال احتیاط سے لکھا جاتا تھا۔ زمین کی تقسیم کاشت کاروں پر اور محاصل کی کمی بیشی گاؤں کی کھتونیوں میں ہر سال درج کی جاتی تھی۔ مزید براں لگان وصول کرنے کے بارے میں قواعد مرتب ہوے۔ زراعت کو ترقی دینے کے طریقے اور سرکش مزارعین کی اصلاح کے قوانین جاری کیے گئے۔ مرکز میں ہر پرگنے کے ایک قانون گو کی حاضری لازم قرار دی گئی۔ مزارعین اور جاگیرداروں کی ہمت افزائی اور بوقتِ ضرورت ان کے لیے قرضوں، تقاویوں اور لگان میں کمی یا معافی کا انتظام کیا گیا۔ حسابات کی حالت درست کی گئی۔ اہل کاروں کے نذرانے موقوف ہوے۔ ان اقدامات سے محاصل میں جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خزانے میں بیالیس کروڑ روپیہ جمع ہو گیا۔ یہ بڑی حد تک میر فتح اللہ شیرازی اور راجا ٹوڈرمل کی سعی و محنت کا ثمر تھا۔

عدلیہ: اسلامی نظامِ حکومت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ سب سے بلا لحاظ مذہب و ملّت انصاف کیا جائے اور قانون کی نظر میں مسلم غیر مسلم کی تمیز نہ روا رکھی جائے۔ اکبر کی بعض باتیں چاہے قانونِ اسلامی کے عین مطابق نہ ہوں لیکن اس کے عام مسلک سے مسلم فقہا کے معینہ نظامِ عدل گستری پر کوئی مخالفانہ اثر نہ پڑا۔ قانونِ وراثت و طلاق و نکاح میں کوئی ترمیم نہ ہوئی، کیونکہ ان امور کا تعلق براہِ راست مذہبی عقائد سے تھا۔ قانون دیوانی بھی وہی رہا، البتہ قانونِ شہادت اور قانونِ فوج داری میں کبھی کبھی تجاوز کیا گیا اور بعض اوقات سزائیں بھی مِن وعَن اسلامی قانون کے ماتحت تجویز نہ کی گئیں۔ ہندو فریقین کے جو مقدمات وراثت اور شادی وغیرہ سے متعلّق ہوتے تھے وہ پنڈتوں کے سامنے پیش ہوتے اور ہندو قانون کے مطابق طے پاتے۔ سرکاری عدالتوں کے علاوہ قدیم دیہی نظام اور ادارے (پنچایت وغیرہ) بدستور قائم رہے۔ چونکہ ملک کی ستّر فی صد سے زیادہ آبادی دیہات میں تھی اس لیے اسلامی قانون کا دائرۂ عمل زیادہ نہ پھیل سکا اور عدل گستری کے متعلّق حکومت کی ذمے داری پرگنوں (قصبات)، سرکاروں (اضلاع) اور صوبوں کے صدر مقامات تک محدود رہی۔ قاضی القضاۃ کا تقرّر بادشاہ کرتا تھا، جسے بادشاہ کی منظوری سے دیگر علاقوں میں قاضی مقرر کرنے کی اجازت تھی۔ فوج کے لیے قاضیِ عسکر ہوتا۔ ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضی اپنے اپنے فرائض کی تصریح کے ساتھ مقرر ہو سکتے تھے۔ قاضی کے ساتھ میر عدل کا تقرّر عمل میں آتا تھا اور اس کی رائے کو فوقیت دی جاتی۔ اوزان، پیمانوں اور اشیاے خوردنی کی جانچ پڑتال، انسدادِ گداگری، معالجوں کی اسناد کی چھان بین، غلاموں کی حالت کی نگرانی، لوگوں کو قمار بازی اور مے نوشی سے روکنے اور صوم و صلوٰۃ کا پابند رکھنے کے لیے دارالحکومت اور صوبوں میں محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔ عدل گستری کا دوسرا مقام بادشاہ کا دربار تھا، جہاں ہر شخص باریاب ہو سکتا تھا۔ اس نظامِ عدل کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ پورے ملک میں اصولِ انصاف کی پابندی سختی سے کی جاتی اور کسی سے رعایت نہ برتی جاتی۔ پادری مُونسرّات (Father Anthony Monserrate) کا بیان ہے کہ بادشاہ حق و انصاف کا بے انتہا لحاظ رکھتا ہے وہ جرم کی سزا تو دیتا ہے مگر اس میں عداوت کا شائبہ نہیں ہوتا اور نہ وہ بے جا نرمی سے کام لیتا ہے [بحوالہ V. Smith: *Akbar, the Great Moghul*، اوکسفرڈ ۱۹۱۹ء]۔

مذہب: اٹھارہ بیس برس کی عمر تک اکبر ایک سیدھا سادا ترک رہا، جو ارکانِ مذہب کا پابند اور علما و فقرا کا نیاز مند تھا۔ خواجہ اجمیریؒ اور سلیم چشتیؒ سے عقیدت و ارادت، مؤخّر الذکر کی خانقاہ اور پھر اس کے قریب عبادت خانے کی تعمیر اور اس

عبادت خانے میں مشائخ، علما اور امرا کی علمی و دینی مجالس کے انعقاد سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ دینِ حق کا جویا اور مذہبی و علمی معلومات اخذ کرنے کا خواہاں تھا، لیکن آگے چل کر ان علمی مجالس میں جب علما (خصوصاً مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدرالصدور) نے ایک دوسرے کی تضحیک و توہین پر کمر باندھی تو علمی مذاکرے کج بحثیوں اور فضول دلیل آرائیوں کا اکھاڑا بن کر رہ گئے۔ ایک ہی بات کو جب ایک عالم نے حلال اور دوسرے نے حرام ٹھیرایا تو بادشاہ کا دل ایک طرف تو ان عقائد سے بھی پھرنے لگا جس کی نمائندگی کے وہ مدّعی تھے اور دوسری طرف اسے محسوس ہوا کہ یہ علما— اس کے اپنے الفاظ میں— ”می خواہند کہ درفرماں روائی و کار گزاری شریک پادشاہی باشند“۔ چنانچہ اقتدارِ شاہی کو بالادست رکھنے کے لیے بعض ایسے اقدامات کیے گئے جو راسخ العقیدہ طبقے کے نزدیک محلّ نظر تھے۔ ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۳ء میں ایک نئے مذہب دینِ الٰہی اکبر شاہی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے مادّۂ دینِ الٰہی۔ یہاں اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ اکبر کا مطمحِ نظر ایک اسلامی حکومت کا قیام نہیں بلکہ اپنی سلطنت کا استحکام تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کا انحصار غیر مسلم رعایا کی اطاعت اور حمایت پر ہے؛ چنانچہ اس کی کوشش یہی رہی کہ ہندو اسے ایک غیر ملکی نہیں بلکہ اپنی برادری کا فرد سمجھیں۔ جزیے کی معافی، یاتریوں کے محاصل کی موقوفی، راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناتے اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب پر تقرر اور ایسے قوانین کا نفاذ جو خواہ شعائرِ اسلامی کے عین مطابق نہ ہوں لیکن ان سے ہندوؤں کی دل دہی ہو جائے۔ ذبیحۂ گاؤ کی ممانعت، آفتاب کے رخ بیٹھ کر جھروکہ درشن، داڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگوانا، ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر تمام ہندوانہ رسموں میں حِصّہ لینا، یہ سب باتیں اس کی مذہبی عقائد سے روگردانی کا اتنا ثبوت بہم نہیں پہنچاتیں جتنا اس کی سیاسی مصلحت اندیشیوں کا سراغ دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ الٰہی کا اثر صرف اس کے محل اور قریبی حلقوں تک محدود رہا۔ دربار اور کاروبارِ سلطنت پر متشرّع مسلمان امرا حاوی رہے اور اطرافِ ملک میں ہزارہا صوفیہ و علما تبلیغ دین اور اشاعت علومِ دینی میں بدستور منہمک رہے۔

علوم و فنون: اکبر کے دور میں علوم و فنون کو بہت فروغ نصیب ہوا۔ وہ عالموں اور فن کاروں کا بڑا قدردان تھا۔ اس کا ممتاز ترین علمی کارنامہ یہ ہے کہ سنسکرت، عربی اور ترکی کی کئی اہم تصنیفات کے ترجمے کروائے اور فارسی میں نئی کتابیں لکھوائیں۔ تراجم میں مہابھارت، رامائن، پنج تنتر، اتھروید، لیلاوتی، سنگھاسن بتیسی، توزک بابری، حیوۃ الحیوان، معجم البلدان وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ملّا مبارک، ابوالفضل، فیضی، عبدالقادر بدایونی، عبدالرحیم خانخانان، نقیب خان، نظام الدین بخشی وغیرہ کا نام اس کے دربار سے وابستہ علما و مصنّفین میں لیا جا سکتا ہے۔ معقولات کے ایک بڑے عالم میر فتح اللہ شیرازی بھی اسی زمانے میں دربارِ شاہی میں آئے۔

عہدِ اکبری میں تعلیم کا چلن عام تھا۔ سرکاری مدرسے تمام مما لکِ محروسہ میں جاری تھے۔ متعدّد امرا کو کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق تھا؛ چنانچہ ان کے کتب خانے سلطنت کے مختلف حِصّوں میں موجود تھے۔ خود بادشاہ کے کتب خانے میں چوبیس ہزار کتابیں تھیں۔

اکبر نے ہندی تہذیب و تمدّن اور شعر و ادب کی توسیع و ترقی میں بھی بڑی سرگرمی دکھائی۔ فارسی اور ہندی کے شعرا کو یکساں نوازا۔ سور داس، تلسی داس اور عبدالرحیم خانخانان اس دَور میں ہندی کے ممتاز شعرا تھے۔ فیضی، عرفی، نظیری، شکیبی، سنجر کاشی اور حیدری تبریزی فارسی کے شعرا اس کے دربار میں موجود تھے۔ ملّا ظہوری اور ملک قمی بھی اسی زمانے میں گزرے ہیں، لیکن وہ دکن کے درباروں سے وابستہ تھے۔

علم و ادب کی طرح فنونِ لطیفہ، بالخصوص مصوّری، موسیقی، خطّاطی اور فنِ تعمیر کی بھی اکبر نے خوب سرپرستی کی۔ اس کی قدردانی کی شہرت ایران پہنچی تو کئی مصوّر یہاں چلے آئے اور ایک نئے دبستانِ مصوّری کی بنیاد رکھی گئی، جو مغلیہ مصوّری کے نام سے مشہور ہوا۔ میر سیّد علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد اور ان کے شاگرد دسونت اور بساون دربارِ اکبری کے خاص مصوّر تھے۔ خطّاطوں میں اشرف خان، محمد حسین کاشمیری، ملّا میر علی اور میر حسینی اور ماہرینِ موسیقی میں تان سین (جو اس کے نورتنوں میں شامل تھا)، رام داس اور میاں چاند کی شہرت آج تک باقی ہے۔ فنِ تعمیر کے متعدّد قابلِ قدر نمونے اکبر کی یادگار ہیں، مثلاً دہلی میں ہمایوں کا اور سیکری میں سلیم چشتیؒ کا مقبرہ اور اٹک، آگرے، فتح پور سیکری، لاہور اور الٰہ آباد کے قلعے حسنِ تعمیر اور پائداری کے اعتبار سے دنیا کی بہترین عمارتوں کی صف میں جگہ پاتے ہیں۔

آخری ایّام: اکبر کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں پے در پے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ راجا ٹوڈرمل اور بیربل کے بعد اسے ابوالفضل جیسے مدبّر رفیق سے بھی محروم ہونا پڑا۔ جسے نرسنگھ دیو بندیلہ نے ہلاک کر ڈالا تھا (۴ ربیع الاوّل ۱۰۱۱ھ/ ۱۳ اگست ۱۶۰۲ء)۔ مزید براں دو جوان بیٹوں کی موت (شہزادہ مراد: ۱۵ شوال ۱۰۰۷ھ/ یکم مئی ۱۵۹۹ء اَور شہزادہ دانیال: ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۴ء) اور شہزادہ سلیم سے رنجش نے اس کی زندگی اَور بھی تلخ کر دی۔ اکبر کے ممتاز ترین مقرّبین سلیم کے بجائے اس کے بیٹے خسرو کو بادشاہ کا وارث بنانے پر تلے ہوئے تھے، جو مان سنگھ کا بھانجا اور خان اعظم کا داماد تھا اور سلیم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے باپ کے جیتے جی اپنی بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا، تاہم اکبر نے آخر وقت سلیم کو بلا کر اپنا جانشین قرار دیا اور ۱۳ جمادی الاُخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو جہان، جہان آفرین کے سپرد کر دی۔ اس نے کل انچاس سال آٹھ مہینے حکومت کی اور تقریباً تریسٹھ برس عمر پائی۔ بقول ابوالفضل وہ ایک حاکم عادل تھا، ”جس کا دل حصارِ آہنی و سلاحِ آسمانی کا حکم رکھتا تھا اور شر پسندوں کے لیے تیغ جانستاں اور خنجر برّاں بن جاتا تھا“۔ اس نے صحیح معنوں میں مغلیہ سلطنت قائم کی، ملک کو امن و خوش حالی اور ایک مستحکم نظامِ حکومت دیا اور نظم و نسق کے ہر شعبے میں اپنی حکمت عملی کے ایسے گہرے نقوش

چھوڑے جو اس کے جانشینوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ٹھیرے۔

مآخذ: (۱) ابوالفضل: آئین اکبری، مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۸۶۹ء؛ (۲) وہی مصنّف: اکبر نامہ، مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۸۷۷ء (۳) بداؤنی: منتخب التواریخ، مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۸۸۳ء؛ (۴) خواجہ نظام الدین بخشی: طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۵) میر معصوم بھکری: تاریخ معصومی، بمبئی ۱۹۳۸ء؛ (۶) سجان رائے بھنڈاری: خلاصۃ التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء؛ (۷) بایزید بیات: تذکرۂ ہمایون و اکبر، کلکتہ ۱۹۴۱ء؛ (۸) محمد قاسم ہندوشاہ: تاریخ فرشتہ، مطبع نولکشور، لکھنؤ (اردو ترجمہ، از خواجہ عبدالحی، لاہور ۱۹۶۲ء)؛ (۹) شیخ فرید: ذخیرۃ الخوانین، کراچی ۱۹۶۱ء؛ دیگر معاصر تاریخوں کے ضروری اقتباسات کے لیے دیکھیے: (۱۰) Elliot و Dowson: *History of India as told by its own Historians*، ج ۵، لنڈن ۱۸۷۳ و ج ۶، لنڈن ۱۸۷۵ء؛ (۱۱) Elphinstone: *History of India*، ۱۸۴۱ و ۱۸۶۶ء (اردو ترجمہ از سائینٹفک سوسائٹی، علی گڑھ ۱۸۶۶ - ۱۸۶۷ء)؛ (۱۲) V. Noer: *Kaiser Akbar*، لائپزگ ۱۸۸۰ء (انگریزی ترجمہ از A. S. T. W. Beveridge: *The Emperor Akbar*، کلکتہ ۱۸۹۰ء)؛ (۱۳) Beale: *The Oriental Biographical Dictionary*، ۱۸۹۴ء؛ (۱۴) Cunningham: *Reports of the Archeological Survey of India*، بالخصوص ج ۴، ۱۸۹۶ء؛ (۱۵) W. Irvine: *The Army of the Indian Moghuls, its Organisation and Administration*، لنڈن ۱۹۰۳ء؛ (۱۶) Furgusson: *History of Indian and Eastern Architecture*، لنڈن ۱۹۱۰ء؛ (۱۷) V. A. Smith: *A History of Akbar, Fine Art in India*، اوکسفرڈ ۱۹۱۱ و ۱۹۳۰ء؛ (۱۸) وہی مصنّف: *the Great Moghul*، اوکسفرڈ ۱۹۱۷ء، طبع دوم ۱۹۱۹ء؛ (۱۹) Moreland: *India at the Death of Akbar*، لنڈن ۱۹۲۰ء؛ (۲۰) Moreland: *The Agrarian System of Moslim India*، لنڈن ۱۹۲۹ء؛ (۲۱) Abdul Aziz: *Mansabdari System and the Moghul Army*، مطبوعۂ لاہور؛ (۲۲) Ibn Hasan: *Central Structure of the Moghal Empire*، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۶ء (اردو ترجمہ از عبدالغنی نیازی: دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی، لاہور ۱۹۵۸ء)؛ (۲۳) W. Haig: *Cambridge History of India*، ج ۴، لنڈن ۱۹۳۷ء؛ (۲۴) P. Saran: *The Provincial Government of the Moghuls*، الٰہ آباد ۱۹۴۱ء؛ (۲۵) Makhanlal Roychoudhury: *The Din-i-Ilahi*، کلکتہ ۱۹۴۱ء؛ (۲۶) S. K. Bannerji: *Humayun Badsha*، دو جلد، لکھنؤ ۱۹۴۱ء؛ (۲۷) B. R. Tiripathi: *Rise and Fall of the Mughal Empire*، الٰہ آباد ۱۹۵۶ء؛ (۲۸) سرسیّد احمد خان: جامِ جم، در مقالات سرسیّد، ج ۱۶، لاہور ۱۹۶۵ء؛ (۲۹) ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان، ج ۳ و ۵، علی گڑھ ۱۹۱۷ء؛ (۳۰) محمد حسین آزاد: دربار اکبری، طبع ششم، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۳۱) شیخ محمد اکرام: رودِ کوثر، مطبوعۂ تاج آفس، کراچی؛ (۳۲) شوکت علی فہمی: ہندوستان پر مغلیہ حکومت، دہلی ۱۹۵۰ء؛ (۳۳) ریاست علی ندوی: عہد اسلامی کا ہندوستان، پٹنہ ۱۹۵۰ء؛ (۳۴) انتظام اللہ شہابی: تاریخ ملّت، ج ۱۱، دہلی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء؛ (۳۵) (آ)، لائڈن، طبع دوم، مادّہ ہائے اکبر، ابوالفضل، عزیز کوکہ، فتح پور سیکری وغیرہ، مع مآخذ۔ مزید مآخذ کے لیے دیکھیے ریو (Rieu) کی "فہرستِ مخطوطاتِ فارسی، در کتاب خانۂ انڈیا آفس، لنڈن"۔ علاوہ ازیں Smith: *Akbar, the Great Moghul* (ص ۴۵۹-۴۸۶) اور *Cambridge History of India* (ص ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۹۶-۵۹۸) میں کتابیات کی جامع فہرستیں موجود ہیں، نیز Storey: *Persian Literature*، کتب متعلقۂ عہد اکبر۔

(سیّد امجد الطاف)

اکبر الٰہ آبادی: سیّد اکبر حسین (رضوی، دیکھیے سکسینہ)، بارہ (ضلع الٰہ آباد) میں بتاریخ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء/ ۷ ذی القعدہ ۱۲۶۳ھ پیدا ہوئے۔ والد سیّد تفضّل حسین عرف چھوٹے میاں، نائب تحصیل دار، صاحبِ علم اور صوفیانہ ذوق کے آدمی تھے؛ ریاضی میں بھی دسترس تھی، والدہ جگدیش پور (ضلع گیا، بہار) کے ایک زمین دار خاندان سے تھیں۔ ۱۸۵۵ء میں اکبر کی تعلیم کے خیال سے الٰہ آباد آ گئی تھیں۔ ابتدائی عربی فارسی تعلیم والد سے حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں جمنا مشن سکول میں داخل ہوئے، مگر ۱۸۵۹ء میں تعلیم چھوڑ دی، تاہم مطالعہ جاری رکھا اور انگریزی، فلسفہ اور تصوّف میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ مصوّری کا بھی شوق رہا۔

اکبر نے ابتدا میں بعض معمولی ملازمتیں کیں۔ ۱۸۶۷ء میں وکالتِ ادنیٰ کا امتحان پاس کر کے کچھ عرصہ وکالت کی۔ ۱۸۶۷ء میں عارضی طور پر نائب تحصیل دار اور پھر داروغۂ آبکاری رہے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ میں چیف جسٹس کے مثل خواں مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں وکالتِ اعلیٰ کا امتحان پاس کر کے ۱۸۸۰ء تک وکالت کی۔ اسی سال قائم مقام منصِف مقرّر ہوئے اور اس محکمے میں ترقی کرتے کرتے ۱۸۸۸ء میں صدر الصدور، ۱۸۹۳ء میں عدالتِ خفیفہ کے جج، ۱۸۹۴ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہو کر الٰہ آباد، جون پور، مین پوری، اٹاوہ، بنارس اور سہارنپور میں رہے۔ ۱۸۹۸ء میں خطاب "خان بہادر" ملا۔ ۱۹۰۳ء میں ہائی کورٹ کی ججی بھی پیش ہوئی، مگر آنکھوں کی تکلیف کے باعث قبول نہ کی اور سبک دوش ہو گئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو آنکھ کا آپریشن کرایا۔ جون ۱۹۱۳ء میں ان کا نوجوان بیٹا ہاشم فوت ہو گیا، جس کا بہت صدمہ ہوا اور باقی عمر بہت افسردہ دل رہے، تا آنکہ ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء/ ۶ محرّم ۱۳۴۰ھ کو وفات پا گئے۔ اس وقت ان کی عمر شمسی حساب سے ۷۵ برس اور قمری حساب سے ۷۹ برس تھی۔ الٰہ آباد میں خسرو باغ کے قریب قبرستان کالے ڈانڈے میں دفن ہوئے۔

گیارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز ہوا اور سترہ سال کی عمر کی غزلیں تو کلّیات میں بھی موجود ہیں۔ ۱۸۶۳ء سے باقاعدہ شعر کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۸۶۷ء تک اچھی خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ وحید کے شاگرد تھے، جن کا سلسلہ آتش سے ملتا ہے۔ اکبر ابتدائی مشاعروں میں آتش کی وضع کی پیروی کرتے تھے (طالب، ص ۳۰)۔ اکبر ۱۸۷۷-۱۸۸۰ء تک (ح الٰہ آبادی کے نام سے اودھ پنچ میں بھی مضمون لکھتے رہے۔ نثر میں ان مضامین کے علاوہ ان کے خطوط اور ولفرڈ بلنٹ

(Wilfred Blunt) کی کتاب *The Future of Islam* کا اردو ترجمہ بھی شامل ہیں۔

اکبر کا امتیازی کارنامہ ان کی شاعری ہے۔ خاص رنگِ ظرافت نے انھیں اردو ادب میں منفرد مقام دیا ہے۔ ان کی غزل بھی معنی اور اسلوب کے لحاظ سے قابلِ توجّہ ہے۔

اکبر کی شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

(۱) ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک: یہ نومشقی کا دور تھا، اس میں پرانا رنگ پایا جاتا ہے؛ (۲) ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۳ء تک: اس میں وہی رنگ ہے، مگر پختگی پائی جاتی ہے؛ (۳) ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۹ء تک: اخلاقیات و روحانیات کی چاشنی اور ظریفانہ انداز نکھر کر سامنے آرہا ہے؛ (۴) ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک: حسن و عشق کے ساتھ ساتھ حقائق و عرفان کا میلان زیادہ، ظرافت کی نوک تیز تر اور سیاسی طنز زیادہ زہر ناک ہو رہا ہے۔ اسی زمانے میں میر غلام بھیک نیرنگ کی تجویز پر مخزن نے انھیں ''لسان العصر'' کا خطاب پیش کیا (رک بہ خطوط)؛ (۵) ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک: اس میں زندگی کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کا اظہار ہے، مگر سیاسی اور مجلسی طنز اب بھی بدستور شوخ ہے۔

اکبر اردو طنز نگاری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی طنز کا دار و مدار اسلوب پر بھی ہے اور مواد پر بھی۔ ان کی علامتیں بھی معنی خیز ہیں۔ ان کے یہاں لفظی ہیر پھیر سے خاصا کام لیا گیا ہے، مگر ان کی ظرافت کو محض لفظوں کا ہیر پھیر کہنا درست نہ ہو گا۔ انھوں نے خیال اور مواقع سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی مقبولیت میں لفظی نکتہ طرازی کا بڑا حصّہ ہے، لیکن یہ لفظی نکتہ طرازی بھی محض تفریحی نہیں۔ اس کی تحریک کسی گہرے جذباتی ردِّ عمل سے وابستہ ہوتی ہے، جس کا تعلّق سامنے کے سماجی اور سیاسی احوال سے ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر کی طنز میں قدرے مقامیت پیدا ہوگئی ہے اور وہ اجنبیت کو موضوعِ تضحیک بنا لیتے ہیں۔ بعض جگہ جذبے کی جگہ عقیدہ طنز کی تحریک کا باعث ہوا، مگر ہر جگہ یہ بات نہیں۔ ان کی طنز کا تعلّق بڑے گہرے اور وسیع تر مسائل عامّہ سے ہے، جس میں قدیم اور جدید کی عالمگیر آویزش، سائنس اور دین کا وسیع تر معرکہ اور مشرق و مغرب کا قدرے مستقل سا سوال مضمر ہے۔ انھوں نے خیال کی حریّت اور فکر کی آزادی کا ایک خاص انداز پیش کیا۔ ان کے موضوعات ظرافت، شخصیات و ذاتیات سے زیادہ مُلکی تاریخ کے اہمّ انقلابات اور محولۂ بالا دو مستقل نظریوں کی کش مکش کے متعلّق ہیں، جن کا دائرہ ان کے اپنے دَور سے نکل کر آئندہ کے ادوار تک پھیلا ہوا ہے۔ اکبر کے کلام میں صرف طنز کی تلخی ہی نہیں ملاحت آمیز شیر و شکر بھی ہے۔ مُصلح تو وہ یقیناً تھے، مگر بے غرض۔ تفریح کا مواد بھی ان کے یہاں خاصا ہے۔

اکبر نے تحریفِ مُضحِک (پیروڈی parody) کے بھی تجربے کیے ہیں۔ کہیں کہیں صاف گوئی عریانی کی حد سے جا ملی ہے۔ انھوں نے مکالمہ و تضمین کی مُدرتوں سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ اکبر کے مزاحیہ اشعار میں قوافی، استعارات، تشبیہات اور انگریزی الفاظ کے استعمال سے بھی بات پیدا ہے اور یہی نُدرت پسندی انھیں بعض نئے تجربوں پر بھی آمادہ کرتی رہی ہے۔ قافیے پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

اکبر کی غزل بھی ایک خاص رنگ رکھتی ہے۔ ان کی غزل کا ہر دَور معانی و مضامین کے امتیاز کی وجہ سے الگ الگ پہچانا جاسکتا ہے۔ وہ سلسلۂ آتش سے تعلّق رکھتے تھے، اس لیے جذبے کے خلوص اور معاملات کے تیز خارجی رنگ کو ملاتے ہیں۔ زبان و بیان سے دل کشی پیدا کرنے اور معرفت و اخلاق کے مضامین کے خاص ذوق کا ورثہ انھیں اپنے استاد وحید کے ذریعے آتش ہی سے ملا ہے۔ آزادی و بے خوفی کا عنصر اور آخری دَور کے کلام میں زندگی کے متعلّق زیادہ چبھتے ہوئے حُزن و غم کا اندازِ نظر ذاتی حوادث و آلام کا نتیجہ تھا۔ اکبر کی رباعیاں بھی اچھی ہیں؛ یوں قطعات میں ان کی طبیعت زیادہ کھلتی معلوم ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) طالب: اکبر الٰہ آبادی، (طبع دوم، ۱۹۴۶ء)؛ (۲) رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو (ترجمۂ عسکری)؛ (۳) قمر الدین احمد بدایونی: بزم اکبر (مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۰ء)؛ (۴) رسالۂ نگار، اپریل ۱۹۲۶ء؛ (۵) عبدالماجد دریا بادی: اکبر کی شاعری کا دور آخر، (مقالہ) در رسالۂ اردو، اپریل ۱۹۲۳ء؛ (۶) عبدالقادر سروری: جدید اردو شاعری؛ (۷) وزیر آغا: اردو ادب میں طنز و مزاح، (مطبوعۂ اکادمی پنجاب، ۱۹۵۸ء)؛ (۸) رسالۂ زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۸ء؛ (۹) رسالۂ معارف، جولائی و اگست ۱۹۱۶ء، جون و جولائی ۱۹۱۷ء؛ (۱۰) سید عشرت حسین (تسوید): حیات اکبر، مرتبۂ ملا واحدی (کراچی ۱۹۵۱ء)؛ (۱۱) خطوط اکبر (بنام حسن نظامی) دہلی ۱۹۵۳ء؛ (۱۲) عبدالماجد دریابادی: اکبر نامہ (اکبر میری نظر میں)، لکھنؤ ۱۹۵۴ء؛ (۱۳) عبدالحی: گل رعنا؛ (۱۴) عبدالسّلام ندوی: شعر الہند؛ (۱۵) رشید صدیقی: طنزیات و مضحکات؛ (۱۶) علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر ۱۹۵۰ء.

(سیّد عبداللہ)

اُکثم بن صَیفی: بن رِیاح بن الحارِث بن مُخاشِن، ابوخَیدَہ (یا ابوالحَقّاد، ✱ اَنساب، مگر جو شعر وہاں درج ہے [یا ابا الحفّاد افناک الکبر الخ] وہ کتاب المُعَمّرین، ص ۹۲، کی رُو سے ربیعہ بن عُزّی کا ہے، جو خود بھی قبیلۂ تمیم کی ایک شاخ قبیلۂ اُسَیّد سے تھا)۔ اُکثم زمانۂ جاہلیّت کے حُکّام میں شامل تھا۔ اس کے حالاتِ زندگی بیشتر اساطیری کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ متعدّد کہانیوں میں مذکور ہے کہ بادشاہ اور سردار صلاح مشورہ کے لیے اس کے پاس وفد بھیجتے تھے۔ اُکثم کے اشعار میں زندگی، دوستی، معاشرت، نیکی اور عورتوں کے بارے میں حکیمانہ اقوال مندرج ہیں۔ ان حکمت آمیز اقوال سے اس کا جو ذاتی کردار عیاں ہوتا ہے اسے لقمان [رک بآن] کے کردار سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے حکمت آموز اقوال جو اُکثم کے بتائے جاتے ہیں بعض اَور روایات میں لقمان کی طرف منسوب ہیں۔

اُکثم معمّرین میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے مشہور ہے۔ [بعض] اسلامی روایات میں کوشش کی گئی ہے کہ اسے حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی

ذات بابرکات کے ساتھ وابستہ کیا جائے اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ أُکثَم نے اسلام کے بارے میں اظہارِ پسندیدگی کیا تھا، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اپنے [قبیلے کے] لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا اور یہ کہ وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں شہید ہو گیا، لیکن یہ روایات یقیناً بے اصل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ أُکثَم کے کچھ اخلاف کوفے میں تھے اور اس ضمن میں خاص طور پر قاضی یحیٰی بن أُکثَم کا نام لیا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) نَقائِض جَرِیر وَالفَرَزْدَق (طبع بیوَن Bevan) بمددِ اشاریہ؛ (۲) البلاذُری: أنساب الأشراف، مخطوطۂ استانبول، اوراق ۹۶۴ الف، ۱۰۷۰ الف تا ۱۰۷۵ الف، [نیز دیکھیے مطبوعۂ یروشلم ۱۹۴۰ء بمددِ اشاریہ]؛ (۳) ابن حبیب: المُحَبّر، [ص ۱۳۴]؛ (۴) اَلسِّجِستانی: کتاب المعمّرین (طبع گولڈتسیہر Goldziher) [لائڈن ۱۸۹۹ء، ص ۹-۱۸؛ (۵) الجاحِظ: البیان، بمددِ اشاریہ؛ (۶) ابن قُتَیبہ: المَعارف، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۳۵، ۱۳۰، ۲۴۰؛ (۷) وہی مصنّف: العُیون، بمددِ اشاریہ؛ (۸) المبرّد: الکامِل، قاہرہ ۱۳۵۵ھ، بمددِ اشاریہ؛ (۹) الوَشّاء: فاضِل، مخطوطۂ موزۂ بریطانیہ، شمارہ Or.۶۴۹۹، ورق ۱۱۸ الف، ۱۲۱ الف؛ (۱۰) الأغانی، بمددِ فہارس (Tables)؛ (۱۱) ابن عبدربّہ: العِقد، بمددِ اشاریہ؛ (۱۲) اَلضَّبّی: فاخر (طبع سٹوری Storey)، بمددِ اشاریہ؛ (۱۳) ابن حَزم: جَمهَرَة أنساب العَرَب، ص ۲۰۰؛ (۱۴) ابن الأثیر: الأُسد الغابة، قاہرہ ۱۲۸۰ھ، ۱:۱۱۱-۱۱۳؛ (۱۵) ابن حَجَر: الأصابَة، شمارہ ۴۸۲ (القسم الثالث)۔

(M. J. KISTER کِسٹر)

---

* **اَکدَرِیّہ**: وراثت سے متعلّق ایک معروف اور مشکل فقہی مسئلے کا نام، جو مسائل 'مُلَقَّبہ' (یعنی ایسے مسائل جن کے مخصوص نام ہیں) میں سے ہے۔ جب کوئی عورت حسبِ ذیل وارث چھوڑ جائے: (۱) شوہر، (۲) ماں، (۳) دادا اور (۴) بہن — خواہ وہ حقیقی بہن (شقیقہ) ہو یا سوتیلی (اخت الاب) — تو اس عورت کے شوہر کا حصّہ $\frac{1}{2}$، اور ماں کا حصّہ $\frac{1}{3}$ ہوگا (دیکھیے ۴ [النّساء]: ۱۲ و ۱۳)، اور اس طرح صرف $\frac{1}{6}$ حصّہ دادا اور بہن کے لیے رہ جائے گا۔ دادا اور بہن جب دونوں اکھٹے وارث ہوں تو انھیں بالعموم عَصَبات میں داخل مانا جاتا ہے، اس طرح 'لِلذّکر مثل حظّ الأُنثیین' کے مطابق بہن کو دادا کے حصّے کا نصف ملتا ہے اور وہ دونوں مل کر ''اصحاب الفرائض'' کے [یعنی ان لوگوں کے جن کے لیے قرآن میں میراث کا کوئی معیّن حصّہ مقرّر کیا گیا ہے] حصّے نکالنے کے بعد ترکے میں سے جو کچھ بھی باقی رہے اس کے وارث ہو جاتے ہیں۔

اب حکمِ قرآنی (۴ [النّساء]: ۱۲) کی متداول تعبیر کی رُو سے دادا کل ترکے کے $\frac{1}{6}$ حصّے کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن اس طرح بہن کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ حنفیوں کا مذہب یہی ہے کیونکہ اس صورت میں ان کے نزدیک دادا بہن کو محروم الأرث کر دیتا ہے، لیکن دیگر مذاہبِ فقہ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں دادا اور بہن کو عَصَبات قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ شوہر اور ماں کی طرح [وہ بھی ذوی الفروض میں سے ہیں اور] ان میں سے ہر ایک کو وہ حصہ ملے گا جس کا قرآن کریم انھیں مستحق قرار دیتا ہے۔ اس صورت میں ترکۂ میّت کی تقسیم یوں ہوگی: شوہر کا حصّہ $\frac{1}{2} = \frac{3}{6}$؛ ماں کا حصّہ $\frac{1}{3} = \frac{2}{6}$؛ دادا کا حصّہ $\frac{1}{2}$؛ بہن کا حصّہ $\frac{1}{2} = \frac{3}{6}$ [ان سب حصّوں کا مجموعہ $\frac{9}{6} = \frac{3}{2}$ ہوتا ہے) ''عَوْل'' [رک بآں] کے ذریعے اسے $\frac{9}{6}$ سے $\frac{9}{9}$ کر لیا جائے گا، چنانچہ شوہر کا حصّہ $\frac{3}{9}$ ماں کا حصّہ $\frac{2}{9}$ دادا کا حصّہ $\frac{1}{9}$ اور بہن کا حصّہ $\frac{3}{9}$ ہوگا، لیکن چونکہ بہن دادا کے حصّے کے صرف نصف کا دعویٰ کر سکتی ہے [وَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَیَیْنِ، ۴ (النساء): ۱۲]، اس لیے ان دونوں کے حصّوں میں صحیح تناسب دوبارہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ وہ دونوں مل کر $\frac{12}{27}$ کے وارث ہوں گے، لیکن اس میں سے دادا کو $\frac{8}{27}$ اور بہن کو $\frac{4}{27}$ دیا جائے گا [دیکھیے تاج العروس، بذیل مادّۂ ک د ر]۔

اکدریہ نام کے معنی کی بابت علما کی رائے مختلف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ بجائے خود ''اَکدَر'' (پیچیدہ، مبہم) ہے یا یہ کہ اس مسئلے میں ان اصول کو جو یوں عموماً مسلّمہ ہیں مکدّر یا مختل کر دیا جاتا ہے؛ بعض کا یہ خیال ہے کہ اکدر کسی شخص کا نام تھا جس کے سامنے عبدالملک بن مروان نے یہ مسئلہ بغرضِ فیصلہ پیش کیا۔

مآخذ: (۱) تاج العروس، ۳:۵۱۸؛ (۲) اَلمُطَرِّزی: المُغرِب فی ترتیب المُعرِب، بذیل مادّہ؛ (۳) لسان العرب، ۶:۴۵۰؛ (۴) W. Marçais: *Des Parents et alliés*، Rennes ۱۸۹۸ء، ص ۱۵۴ ببعد؛ (۵) ابن حَجَر الہَیتَمی: تُحفَة، قاہرہ ۱۲۸۲ھ، ۳:۱۵؛ (۶) Santillana: *Istituzioni*، ۲:۵۱۷ ببعد؛ (۷) وہی مصنّف: *Sommario del diritto malechita di Ḫalīl Ibn Isḥāq*، میلان ۱۹۱۹ء، ۲:۸۲۳؛ (۸) H. Laoust: *Le Précis de droit d' Ibn Qudāma*، بیروت ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۹؛ (۹) وِلسن (R. K. Wilson): *Anglo- Muhammadan Law*، طبع ششم، § ۲۲۹ ببعد؛ [(۱۰) السراجیة السجاوندی: السراجیة، اور اس کی شروح]۔

(TH. W. JUYNBOLL جوینبول)

---

* **اَکراد**: رک بہ کُرد۔

---

* **اِکرِم بے**: [رجائی زادہ] محمود [۱۸۴۷-۱۹۱۴ء]، ترکی کے ممتاز ترین غزل گو شاعروں [اور ادیبوں] میں سے ایک، جس نے فرانسیسی ادبی نمونوں کے انداز میں منظوم قصّے (ballads) اور افسانے (romances) لکھے ہیں اور ان نئی ادبی اصناف کی ترویج سے اپنے وطن کی شاعری میں مزید خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ [وہ رجائی افندی کا بیٹا تھا، جو انجمنِ دانش اور مجلس معارفِ عمومیّہ کا رکن اور ناظرِ تقویم خانہ تھا۔ اکرم استانبول میں پیدا ہوا اور رشدیۂ بایزید کے مکتب عرفانیہ میں تعلیم پا کر مختلف سرکاری عہدوں پر مامور رہا۔ ۱۸۸۹ء میں رتبۂ بالا حاصل کیا۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد میں جو وفد اس غرض سے طرابلس بھیجا گیا کہ وہاں اطالوی پراپیگنڈے کا توڑ کرے اس میں یہ بھی شامل تھا۔ کچھ عرصہ مکتبِ مُلکیہ میں ادبیات کا استاد بھی رہا۔ اکرم بے سے ترکی کے اُس دَورِ ثقافت کا